دروس القرآن

۲

مولانا محمد الیاس گھمن

مرکز اہل السنۃ والجماعۃ

نام کتاب .... دروس القرآن جلد دوم

تالیف: .... متکلم اسلام مولانا محمد الیاس گھمن حفظہ اللہ

تاریخ اشاعت .... مارچ 2020ء

باراشاعت .... اوّل

تعداداشاعت 1100

ناشر .... مکتبہ اہل السنۃ والجماعۃ

ملنے کا پتہ

مکتبہ اہل السنۃ والجماعۃ، 87 جنوبی لاہور روڈ سرگودھا

0321-6353540

0335-7500510

www.ahnafmedia.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

سورۃ النحل ---------------------------- 106

سورۃ مریم ---------------------------- 292

سورۃ الانبیاء ------------------------ 458

سورۃ الرعد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿الٓمّٓرٰ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ ؕ وَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ الۡحَقُّ وَ

لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱﴾﴾

تمہیدی گفتگو:

سورۃ الرعد مدنی سورۃ ہے۔ اس میں چھ رکوع اور تینتالیس آیات ہیں۔ اس سورۃ کا نام سورۃ الرعد کیوں ہے؟ اس لیے کہ اس کی تیرھویں آیت ﴿وَ یُسَبِّحُ الرَّعۡدُ بِحَمۡدِہٖ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ مِنۡ خِیۡفَتِہٖ﴾ میں رعد کا ذکر ہے۔ عربی زبان میں بادلوں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے سے جو کڑک دار آواز پیدا ہوتی ہے اسے ”رعد“ کہتے ہیں لیکن یہاں یہ مراد نہیں۔ یہاں ”رعد“ سے مراد ایک فرشتہ ہے جس کا نام رعد ہے، اس کو اللہ رب العزت نے بارشوں کے برسانے پر مقرر فرمایا ہے۔

یہ رعد فرشتہ خود بھی اللہ کی حمد کی تسبیحات پڑھتا ہے اور دوسرے فرشتے بھی اللہ کے خوف سے اللہ کی تسبیحات پڑھتے ہیں۔ چونکہ اس سورۃ میں لفظ رعد سے مراد فرشتہ ہے تو فرشتے کے تذکرہ کی وجہ سے اس سورۃ کا نام ”سورۃ الرعد“ رکھا گیا ہے۔ اسے عربی اصطلاح میں ”تَسۡمِیَۃُ الۡکُلِّ بِاِسۡمِ الۡجُزۡءِ“ کہتے ہیں یعنی جزء کی وجہ سے

کل کا نام رکھنا۔

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ﴾

اللہ رب العزت نے اپنی قدرت کو بیان فرمایا ہے کہ اے میرے پیغمبر! کتاب میں نے دی ہے اور یہ لوگ مانتے نہیں ہیں اور ان کو یہ احساس نہیں ہے کہ میری قدرت کتنی بڑی ہے! کئی آسمان میں نے کھڑے کر دیے ہیں جن کے نیچے ایک ستون بھی نہیں ہے، دیکھو میری کتنی طاقت ہے! ان منکرین کی میرے سامنے کیا حیثیت ہے؟! لیکن پھر بھی میں ان کو کچھ بھی نہیں کہتا، میں نے ان کو ڈھیل دے رکھی ہے اور یہ ڈھیل کا معنیٰ سمجھتے ہیں کہ میں ان کی گرفت نہیں کر سکتا! یہ لوگ میری طاقت کو نہیں دیکھتے۔ ہم نے کتنی بڑی بلڈنگ کھڑی کی ہے اور اس کے نیچے کوئی ستون نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی تعمیر کرنے والا مستری اور انجنیئر آپ پیش کر سکتے ہیں جو بلڈنگ کھڑی کرے اور نیچے کوئی ستون نہ ہو؟ (نہیں۔ سامعین) اللہ کو دیکھیں کہ کتنی بڑی بلڈنگ کھڑی کی ہے!

"استویٰ علی العرش" کا معنیٰ:

اس کے بعد فرمایا: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾

پھر اللہ عرش پر مستوی ہوئے۔

اس کا معنیٰ بعض لوگوں نے غلط سمجھا ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ عرش پر رہتے ہیں، حالانکہ اس کا یہ معنیٰ نہیں کہ اللہ عرش پر رہتے ہیں بلکہ اس کا یہ معنیٰ ہے کہ اللہ کا عرش پر غلبہ ہے، اللہ کا عرش پر قبضہ ہے، اللہ کا عرش پر حکم چلتا ہے۔

عرش کا ذکر کرنے کی وجہ:

کسی بندے کے ذہن میں سوال آتا ہے کہ آسمان پر بھی تو خدا کا غلبہ ہے، زمین پر بھی خدا کا غلبہ ہے تو اس میں اہم بات کون سی تھی جو ﴿ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ﴾ فرمادیا؟

اس بات کا جواب سمجھانے کے لیے میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک لڑکے کے والد کے پاس سائیکل ہے۔ دوسرے کے والد کے پاس سائیکل بھی ہے اور موٹر سائیکل بھی ہے۔ تیسرے کے والد کے پاس سائیکل بھی ہے، موٹر سائیکل بھی ہے اور کار بھی ہے۔ ان تینوں کی آپس میں اگر بحث ہو جائے تو ایک کہتا ہے کہ میرے باپ کے پاس سائیکل ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ میرے باپ کے پاس موٹر سائیکل ہے۔ تیسرا کہتا ہے کہ میرے ابو کے پاس کار ہے۔ اب بتاؤ! جس کے پاس کار ہے کیا اس کے پاس سائیکل یا موٹر سائیکل نہیں ہے؟ سائیکل بھی ہے اور موٹر سائیکل بھی ہے لیکن وہ کہہ رہا ہے کہ میرے ابو کے پاس کار ہے، یہ سائیکل اور موٹر سائیکل کی بات نہیں کر رہا بلکہ یہ کار کی بات کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایسی چیز بتا رہا ہے جو دوسرے کے باپ کے پاس نہیں ہے۔

یہاں اللہ رب العزت سمجھا رہے ہیں کہ زمین کا مالک بھی میں ہوں لیکن ظاہری طور پر انسان کو ملک میں دے رکھی ہے، زمین کی حیثیت کیا ہے آسمان کی حیثیت کیا ہے؟ زمین تمہیں نظر آ رہی ہے اور آسمان تک تم جا نہیں سکتے لیکن آسمان نظر آ رہے ہیں۔ میں وہ خدا ہوں جس کا غلبہ اس عرش پر بھی ہے جس تک تمہاری رسائی کا تصور بھی نہیں! میری طاقت کے سامنے تم ٹھہر سکتے ہو؟ لیکن پھر بھی تم میرا تحمل دیکھو، میرا حلم دیکھو کہ میں تمہیں کچھ نہیں کہتا۔

سورج اور چاند کا مسخر ہونا:

﴿وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ﴾

اللہ نے سورج اور چاند کو مسخر فرمایا ہے۔ یہ اپنے وقت پر نکلتے ہیں اور اپنے وقت پر ڈوبتے ہیں۔ مجال ہے کہ یہ ہلکا سا دائیں بائیں ہو جائیں! بتاؤ اللہ کتنی قدرت اور طاقت والے ہیں۔

اللہ ہر جگہ پر ہے:

﴿ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾

”پھر اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہوا“ اس کا معنی ضرور سمجھیں۔ میں یہ بات اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ بسا اوقات بعض لوگ اس کے معنی کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ہمارا اھل السنۃ والجماعۃ کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ کی ذات ہر جگہ موجود ہے، غیر مقلدین کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ کی ذات عرش پر موجود ہے اور ہر جگہ پر موجود نہیں ہے۔

میں اس دفعہ رمضان المبارک میں دو دن کے لیے ملک بحرین گیا تو ایک ساتھی ملاقات کے لیے آیا جو پہلے ہمارا تھا لیکن اب مسلک بدل چکا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ اللہ کی ذات کہاں پر ہے؟ میں نے کہا: ہر جگہ پر ہے۔ مجھے کہنے لگا: ہماری دکان میں بھی ہے؟ العیاذ باللہ، میں نے کہا: رمضان کہاں پر ہے؟ کہنے لگا: ہر جگہ۔ میں نے کہا: تمہاری دکان میں بھی ہے؟ تو چپ ہو گیا۔ میں نے کہا: بتاؤ! اب جواب نہیں آ رہا۔ میں نے کہا: جس طرح رمضان بابرکت ہے خواہ بازار میں بھی ہو لیکن نظر نہیں آتا، اللہ ہر جگہ پر ہے لیکن نظر نہیں آتا۔ رمضان مبارک ہے اور جسم سے پاک ہے اسی طرح اللہ مبارک ہے اور جسم سے پاک ہے۔ اس کا جسم سے تعلق ہی کیا ہے؟ مجھے کہنے

لگا: اللہ ہر جگہ پر ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ اس نے کہا: اس کی دلیل کیا ہے؟ میں نے کہا: قرآن کریم میں پہلے پارے میں ہے:

﴿وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾﴾[1]

مشرق بھی اللہ کا اور مغرب بھی اللہ کا، جدھر تم رخ کرو گے ادھر اللہ کی ذات موجود ہے۔

مجھے کہنے لگا: اس سے مراد اللہ کا علم ہے، اللہ کی قدرت ہے، اللہ کی ذات مراد نہیں ہے۔ میں نے کہا: یہ جو تمہاری دکان میں قرآن کا ترجمہ اور تفسیر ہے یہ میرے عالم کا ہے یا تمہارے عالم کا ہے؟ کہا: جی، ہمارے عالم کا ہے۔ اس تفسیر کا نام "احسن البیان" ہے جس کا ترجمہ محمد جوناگڑھی غیر مقلد نے کیا ہے۔ میں نے کہا: اس کو اٹھاؤ اور دیکھو یہ کیا ترجمہ کرتا ہے؟ اب اس نے ترجمہ کیا ہے:

"اور مشرق اور مغرب کا مالک اللہ ہی ہے۔ تم جدھر بھی منہ کرو ادھر ہی اللہ کا منہ ہے۔"[2]

میں نے کہا: علم کا بھی منہ ہوتا ہے؟ قدرت کا بھی منہ ہوتا ہے؟ کہنے لگا: نہیں۔ میں نے کہا: منہ کس کا ہوتا ہے؟ کہتا ہے: ذات کا۔ میں نے کہا: یہی بات تو میں کہتا ہوں کہ جدھر رخ کرو گے وہاں اللہ کی ذات موجود ہے۔

غیر مقلدین کی چال:

جب یہ پھنستے ہیں تو پھر علماء کی بات کرتے ہیں اور جب نہیں پھنستے تو پھر

1۔ البقرۃ 115:2

2۔ تفسیر احسن البیان: ص95

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کرتے ہیں۔ وہ مجھے کہنے لگا: میں اپنے شیخ سے پوچھوں گا۔ میں نے کہا: شیخ سے نہ پوچھو، اللہ سے پوچھو! مجھے کہتا ہے: کیوں؟ میں نے کہا: بندہ؛ عالم سے پوچھے تو مشرک ہوتا ہے تُو موحد ہے تُو خدا سے پوچھا کر! ہم امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے پوچھیں تو شرک ہے اور تم کسی مولوی سے پوچھو تو شرک نہیں ہے! مجھے کہتا ہے: اللہ کی بات ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ اس پر میں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات ہم کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ قرآن اللہ کا ہے اور پڑھتے قاری سے ہیں، قرآن اللہ کا ہے اور سمجھتے مولوی سے ہیں، حدیث نبی کی ہے اور سمجھتے امام سے ہیں۔ میں نے کہا: اس میں شرک والی کون سی بات ہے؟

خیر میں سمجھا رہا تھا کہ اللہ کی ذات ہر جگہ موجود ہے۔

کفار کا بعث بعد الموت کا انکار:

﴿وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَ اِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَ اِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ؕ۬ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ﴾

اے میرے پیغمبر! اگر آپ کو اس پر تعجب ہے کہ یہ لوگ آپ کی بات نہیں مانتے، آپ کے کھلے ہوئے معجزات دیکھنے کے باوجود انکار کرتے ہیں تو اس سے بھی زیادہ تعجب ان کی اس بات پر ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم مٹی بن جائیں گے تو کیا ہم از سرِ نو پیدا کیے جائیں گے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

ان لوگوں کی بات اتنی عجیب کیوں ہے؟ اس لیے کہ جب یہ کچھ بھی نہیں تھے تو خدا نے پیدا کر دیا، اب ان کا ڈیزائن موجود ہے تو اب ان کو پیدا کرنا کیا مشکل ہے؟ بھائی ایک بلڈنگ کا میٹریل بھی نہ ہو، بلڈنگ کا نقشہ بھی نہ ہو، بلڈنگ کا کچھ بھی نہ ہو وہ بلڈنگ بنانا آسان ہے اور پھر اس بلڈنگ کو گرا کر دوبارہ بنانا یہ تو اس سے بھی زیادہ آسان ہے! تو اللہ فرماتے ہیں کہ کتنا تعجب ہے ان پر کہ یہ کہتے ہیں کہ بوسیدہ ہڈیوں کو

کون پیدا کرے گا؟ اللہ نے ایک مقام پر اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا:

﴿قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِيٓ أَنْشَأَهَآ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ﴾ [3]

اے پیغمبر! آپ ان کو بتائیں کہ جس خدا نے پہلے پیدا کیا تھا وہی خدا ان کو دوبارہ پیدا کریں گے۔

حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ:

حضرت عزیر علیہ السلام نے ایک بار کہا تھا۔ قرآن کریم میں یہ واقعہ موجود ہے:

﴿أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۖ﴾ [4]

عزیر علیہ السلام کا نام تو قرآن میں نہیں ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد حضرت عزیر علیہ السلام ہیں۔ آپ ایک بستی سے گزرے جو خدا کے عذاب کا شکار تھی یا معمول کے مطابق اس کی مدت گزر گئی اور وہ بستی گری پڑی تھی۔ عزیر علیہ السلام نے تعجب سے اللہ پاک سے عرض کیا: یااللہ! یہ بستی ختم ہو گئی ہے، اب اس کو دوبارہ کیسے کھڑا کریں گے؟ عزیر علیہ السلام کے پاس روٹی تھی، انگور تھے، روٹی کے ٹکڑے لیے اور انگور کا سرکہ لیا اور اس کو بنایا جیسے سالن بناتے ہیں، یہ ان کے ہاتھ میں تھا، ﴿فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ﴾ خدا نے وہیں موت دے دی۔ اب روٹی پاس پڑی ہے اور عزیر علیہ السلام فوت ہو گئے۔ ﴿فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ﴾ سو سال کے بعد اللہ تعالیٰ عزیر علیہ السلام کو دنیا میں لائے۔ پوچھا: ﴿كَمْ لَبِثْتَ﴾ اے

3۔ یٰس 79:36

4۔ البقرۃ 259:2

عزیر! آپ کتنا عرصہ ٹھہرے ہیں؟ کہا: ﴿لَبِثۡتُ يَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ يَوۡمٍ﴾ کہ یا اللہ! دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرا ہوں۔ فرمایا: ﴿بَلۡ لَّبِثۡتَ مِائَةَ عَامٍ﴾ نہیں، بلکہ آپ سو سال رہ کر آئے ہیں، آپ کو اندازہ نہیں۔

یہ عین ایمان ہے:

ساتھ ساتھ اس چیز کی بھی وضاحت کر دوں تا کہ کسی کو دھوکہ نہ لگے۔ وہ یہ کہ حضرت عزیر علیہ السلام کے تعجب کرنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی قدرت پر یقین نہیں تھا، ان کو یقین تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے عین الیقین۔ عین الیقین کا معنیٰ ہوتا ہے کہ آدمی دیکھے اور یقین آئے اور ایک ہوتا ہے "بن دیکھے"۔ حضرت عزیر علیہ السلام اللہ کی بات پر یقین رکھتے تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ میں آنکھوں سے بھی دیکھوں اور یہ ایمان کے خلاف نہیں ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا تھا کہ اے اللہ! میرا دل چاہتا ہے کہ میں آپ کو دیکھوں! اب بتاؤ کہ کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ پر یقین نہیں تھا؟ (یقین تھا۔ سامعین) لیکن آپ فرما رہے تھے کہ اللہ! میرا جی چاہتا ہے کہ میں تجھے دیکھوں! تو یہ ایمان کے خلاف نہیں ہے۔

حضرت عزیر کے واقعہ سے بعض لوگوں کے استدلال کا جواب:

اس واقعہ سے بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام موت کے بعد زندہ نہیں ہوتے۔ ہمارا اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام موت کے بعد اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔

میں آپ سے ایک بات عرض کرتا ہوں کہ عقائد کے معاملہ میں جھجکا نہ کریں، سینہ تان کر بات کیا کریں، دلیری سے بات کیا کریں، ہم ہیں نا! پھر آپ کو کیا

پریشانی ہے؟ پوری دنیا مطمئن ہو کر سوئی ہے کہ ہم موجود ہیں، الحمدللہ، اور یہ بات میں مذاق میں نہیں کہہ رہا، آپ دنیا کے کسی ملک میں جائیں گے یا جن کا سوشل میڈیا سے تعلق ہو تو وہ آپ کو بتائیں گے کہ ہم مسلک پر مطمئن ہیں، کیوں کہ ہمارا یہ خادم [مولانا محمد الیاس گھمن صاحب] زندہ ہے۔ تمہیں ہماری محنت کا اندازہ نہیں ہے، اس لیے میں کبھی کبھی احساس دلانے کے لیے یہ بات کہتا ہوں۔ اللہ پاک ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

عقائد پر کمپرومائز نہ کریں!

ہمارا عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ عقائد پر کوئی کمپرومائز نہیں۔ جو کمپرومائز کرتا ہے وہ ہمارے ساتھ نہ چلے، وہ کسی اور عالم کو تلاش کرے جس نے عقائد میں خلط ملط کرنا ہے، وہ کوئی اور پیر تلاش کرے، وہ ہمیں معاف کرے۔ ہمارے ساتھ وہ چلے جس نے خالص عقیدہ رکھنا ہے۔ خالص عقیدے پر خالص مدد آتی ہے، خالص دین پر خالص مدد آتی ہے، خالص عقیدے پر اللہ خالص جنت عطا فرماتے ہیں۔ تو خالص مال لینا ہے یا ملاوٹ والا؟ (خالص۔ سامعین) باطل الگ ہے اور ہم حق والے الگ ہیں۔ ہم اس دنیا میں باطل سے الگ ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ قیامت میں اللہ کریم ہمیں اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رکھیں۔ (آمین)

اشکال کی وضاحت:

اب وہ لوگ یہ استدلال کرتے ہیں کہ عزیر علیہ السلام سو سال تک رہے۔ جب اللہ پوچھتے ہیں کہ آپ کتنا عرصہ رہے؟ تو جواب دیا:

﴿لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾

کہ میں ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ رہا۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر عزیر علیہ السلام زندہ ہوتے تو انہیں پتا چل جاتا کہ کتنا عرصہ ٹھہرا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ زندہ نہیں تبھی تو پتا نہ چلا۔

ہمارا جواب:

میں نے کہا کہ میں پہلے آپ کے اس نظریے کی تردید قرآن سے کرتا ہوں۔ دیکھو! اصحابِ کہف سوئے تھے یا فوت ہو گئے تھے؟ (سوئے تھے۔ سامعین) فوت تو نہیں ہوئے تھے؟ (نہیں۔ سامعین) بتاؤ سویا ہوا زندہ ہوتا ہے یا مردہ؟ (زندہ ہوتا ہے۔ سامعین)

اصحابِ کہف کا واقعہ:

اصحابِ کہف کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ وہ جب اٹھے تو ان میں سے ایک نے پوچھا: ﴿كَمْ لَبِثْتُمْ﴾ کہ تم لوگ کتنا عرصہ ٹھہرے ہو؟ تو انہوں نے جواب میں کہا تھا: ﴿لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ کہ ہم ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ ٹھہرے ہیں۔

حضرت عزیر علیہ السلام نے فرمایا تھا ﴿لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ اور وہی جملہ اصحابِ کہف نے فرمایا کہ ﴿لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ کہ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ اب بتاؤ! کیا اصحابِ کہف زندہ نہیں تھے؟ (زندہ تھے۔ سامعین) پتا تو ان کو بھی نہیں چلا کہ کتنا عرصہ ٹھہرے رہے تو پھر ان کے متعلق بھی کہو کہ یہ زندہ نہیں تھے۔ معلوم ہوا کہ پتا نہ چلنا اس بات کی دلیل نہیں کہ زندہ نہیں۔ بسا اوقات بندہ زندہ ہوتا ہے لیکن پتا نہیں چلتا۔

ایک عجیب نکتہ:

ایک اور عجیب نکتہ میں آپ کو پیش کرنے لگا ہوں جو آپ کے لیے سمجھنا

آسان ہو گا اور بہت کم ہی یہ نکتہ آپ نے سنا ہو یا شاید کبھی بھی آپ نے نہ سنا ہو۔ اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

﴿وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿٤٧﴾﴾[5]

کہ قیامت کا ایک دن دنیا کے ہزار سال کے برابر ہے۔

اور یہاں کے سو سال ہوں تو پھر وہاں کا کچھ حصہ بنے گا۔ اللہ رب العزت نے عزیر علیہ السلام سے پوچھا: ﴿كَمْ لَبِثْتَ﴾ آپ کتنا عرصہ ٹھہرے ہیں؟ انہوں نے عرض کیا: ﴿لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ کہ ایک دن یا دن کا بعض حصہ۔ عزیر علیہ السلام کہاں سے آئے تھے؟ (وہاں سے۔ سامعین) اور اللہ پاک وہاں کا پوچھ رہے تھے یا یہاں کا؟ (یہاں کا۔ سامعین) اللہ یہاں کا پوچھ رہے ہیں اور حضرت عزیر علیہ السلام وہاں کا بتا رہے ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ ٹھہرے جو وہاں تھے تو بتایا بھی اسی جگہ کا۔ اللہ نے فرمایا کہ میں وہاں کا نہیں بلکہ یہاں کا پوچھ رہا ہوں۔ وہاں کا بعض یوم ہے اور یہاں کا مأۃ عام ہے، وہاں کا کچھ ہے اور یہاں کا سو سال ہے۔ اب بتاؤ! کوئی اختلاف ہے اس میں؟ (نہیں۔ سامعین) کتنی آسان سی بات ہے۔

قدرتِ خداوندی کی دلیل:

میں بات یہ سمجھا رہا تھا کہ حضرت عزیر علیہ السلام کے قصے میں اللہ نے بتایا ہے کہ بندہ اگر اس دنیا سے چلا جائے تو میں اس کو اس دنیا میں واپس بھی لا سکتا ہوں اور حضرت عزیر علیہ السلام سے اللہ نے فرمایا کہ ذرا ہماری قدرت دیکھو! ﴿فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ﴾ کہ اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو! سو سال گذرنے

5۔ الحج 47:22

کے باوجود بالکل تازہ ہے، گلا سڑا نہیں۔ ﴿وَ انْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ﴾ ذرا اپنے گدھے کو دیکھو جس پر سوار ہو کر آئے تھے۔ وہ گدھا بالکل گل سڑ گیا تھا۔ تو فرمایا: ﴿وَ انْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ﴾ دیکھو! ہم اس کی ہڈیاں کیسے جمع کرتے ہیں پھر اس پر کیسے گوشت چڑھاتے ہیں۔ تو یوں اللہ رب العزت نے اسے زندہ کر کے کھڑا کر دیا۔ فرمایا کہ اگر ہم چاہیں سو سال میں کھانا سالم رکھ لیں اور چاہیں تو گدھے کو ہڈیاں بنا کر پھر ان پر گوشت چڑھا کر یوں زندہ کریں۔ عزیر علیہ السلام نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا ہے۔

تو اللہ اس سورت میں بھی فرما رہے ہیں کہ ﴿وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ﴾ اے میرے پیغمبر! آپ کو اس بات پر تعجب ہے کہ یہ مانتے نہیں لیکن اس سے زیادہ تعجب اس بات پر ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ جب ہم مٹی بن جائیں گے تو اللہ ہمیں دوبارہ کیسے زندہ کرے گا؟

اللہ تعالیٰ دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے...واقعہ:

صحیح بخاری میں ایک حدیث ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک آدمی کی موت کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنی اولاد سے کہا:

"فَإِنِّي لَمْ أَعْمَلْ خَيْرًا قَطُّ" میں نے کبھی کوئی نیک کام نہیں کیا، "فَإِذَا مُتُّ فَأَحْرِقُونِي" جب میں مر جاؤں تو مجھے جلا دینا، میرے جسم کی ہڈیوں کو کوٹ کوٹ کر ریزہ ریزہ کرنا اور جس دن آندھی چلے تو میرے اس جسم کے ذروں کو بکھیر دینا، میں ڈرتا ہوں کہ مجھے عذاب نہ ہو۔ اس کی اولاد نے باپ کی وصیت پر عمل کیا، لاش کو جلایا اور اس کے جسم کے ذروں کو ہوا میں بکھیر دیا۔ حدیث میں ہے کہ "فَجَمَعَهُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ" اللہ عزوجل نے اسے جمع کیا، پوچھا: "مَا حَمَلَكَ؟" تم نے ایسے کیوں کیا؟ اس

نے جواب دیا: ”مَخَافَتُكَ“ اللہ! میں نے یہ کام تیرے ڈر کی وجہ سے کیا۔ اللہ نے فرمایا: چلو میں نے تجھے معاف کر دیا۔[6]

حکیم الامت کی تحقیق:

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی عجیب بات فرمائی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ علماء نے اس حدیث پر بڑی لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں کہ جب وہ اس کا قائل نہیں تھا تو مسلمان نہیں ہوا، جب مسلمان نہیں ہوا تو مغفرت کیسے ہوئی؟ حضرت نے فرمایا کہ وجہ یہ نہیں کہ قائل نہیں تھا بلکہ وہ قائل تھا لیکن جتنی انسان کی عقل ہو بندہ اتنا ہی مکلف ہوتا ہے، اس کا خیال یہ تھا کہ جسم ہو تو خدا عذاب دیتا ہے اور جب جسم نہ ہو تو خدا عذاب نہیں دیتا، اس لیے اس نے کہا کہ اللہ! میں نے تیرے ڈر کی وجہ سے ایسے کیا۔ چونکہ اس کی نیت ٹھیک تھی اس لیے اللہ نے فرمایا کہ جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا۔

حضرت متکلمِ اسلام کے زمانہ طالب علمی کا واقعہ:

مجھے اچھی طرح یاد ہے، یہ زمانہ طالب علمی کی بات ہے، میں چوتھے سال میں جامعہ امدادیہ فیصل آباد میں پڑھتا تھا تو میں ایک بار 87 جنوبی سرگودھا اپنے گھر آیا۔ چوتھے سال میں آدمی کی کیا عمر ہوتی ہے! ہمارے ایک رشتہ دار تھے جو جرمنی سے آئے تھے، وہ کسی کے ہاتھ چڑھ گئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے سوالات کیے۔ مجھے کہنے لگے: آپ کہتے ہیں مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ آدمی قبر میں جائے گا تو مٹی میں مل جائے گا، پھر دوبارہ زندہ ہو گا اور اس کو عذاب ہو گا۔ یہ بات تو اللہ کی شانِ عدل کے خلاف ہے۔ میں نے کہا: کیوں؟ کہنے لگے کہ گناہ تو اس جسم نے کیے ہیں اور یہ مٹی ہو گیا ہے۔

6۔ صحیح البخاری، رقم: 3478

اللہ دوبارہ جو جسم بنائیں گے وہ تو اور ہو گا، تو گناہ اِس جسم نے کیے ہیں اور عذاب دوسرے جسم کو مل رہا ہے یہ تو عدل کے خلاف ہے۔

میں نے کہا: اس طرح نہیں ہے، آپ بات سمجھے نہیں ہیں، یہ تب ہو گا جب پہلے والا جسم الگ ہو اور بعد والا جسم الگ ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ پہلے والا جسم جس کو اللہ نے مٹی میں ملایا ہے وہی دوبارہ درست ہو گا، اللہ اسی کو دوبارہ پیدا فرمائیں گے اور عذاب بھی اسی جسم کو ہو گا۔ لہٰذا یہ عدل کے خلاف نہیں ہے۔

آج کے دور کا گمراہ فرقہ اور مشرکین مکہ:

میں معذرت کے ساتھ کہتا ہوں۔ ایک لڑائی مسلمانوں کی مشرکینِ مکہ سے تھی اور ایک لڑائی ہماری آج کے لوگوں سے ہے۔ ہم فتویٰ تو نہیں لگاتے نہ شرک کا نہ کفر کا لیکن اتنی بات ضرور کہتے ہیں کہ یہ ضلالت اور گمراہی سے خالی نہیں ہیں۔

مشرک کہتے تھے: ﴿مَنۡ يُّحۡيِ الۡعِظَامَ وَهِىَ رَمِيۡمٌ ﴿۷۸﴾﴾ [7]

کہ بوسیدہ ہڈیاں دوبارہ کون زندہ کرے گا؟

اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جب ایک آدمی کو جانور نے کھالیا اور وہ جانور کے پیٹ سے نکل گیا تو اس کو عذاب کیسے ہو گا؟ ایک آدمی دریا میں گرا اور اس کا وجود پانی میں تحلیل ہو گیا تو اس کو عذاب کیسے ہو گا؟ ایک آدمی کو آگ میں جلایا گیا اور اس کا جسم راکھ ہو کر بکھر گیا تو اس کو عذاب کیسے ہو گا؟

آج یہ اشکال وہ لوگ کرتے ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہلواتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا اس قبر میں عذاب و ثواب ہو گا؟

ہم نے کہا: خدا تمہیں عقل عطا فرمائے۔ مشرک بھی یہی کہتا تھا کہ جب یہ

7۔ یٰس 78:36

ہڈی بوسیدہ ہوگئی تو خدا اسے پیدا کیسے کرے گا؟ اور تم بھی یہی کہتے ہو کہ جب یہ جسم مٹی بن گیا تو خدا اس کو عذاب کیسے دے گا؟ پانی میں گل گیا تو عذاب کیسے دے گا؟ یا ہوا میں بکھر گیا تو خدا اس کو عذاب کیسے دے گا؟ جانور نے کھا لیا تو خدا عذاب کیسے دے گا؟ ہم نے کہا: بھائی! عذاب ہم نے نہیں دینا، عذاب خدا نے دینا ہے۔ وہ صمد بھی ہے اور قدیر بھی ہے۔ اب بتاؤ! کون ان لوگوں کو سمجھائے؟ آپ پھر بھی کہتے ہیں کہ وہ ہمارے ہیں۔ پتا نہیں آپ کیسے "اپنا" کہہ لیتے ہیں یا یہ بات ہمیں نہیں سمجھ آرہی یا آپ کو زیادہ سمجھ آگئی ہے۔

اسی قبر میں مردے کو عذاب وثواب ہوتا ہے جہاں آپ اسے دفن کرتے ہیں۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ جو نیک ہے اس کی روح علیین میں ہے اور جو کافر ہے اس کی روح سجین میں ہے لیکن عذاب اسی جسم کو ہوتا ہے۔ آپ لوگ یہ بتائیں کہ عذاب اللہ نے دینا ہے یا ہم نے دینا ہے؟ (اللہ نے دینا ہے۔ سامعین) تو کیا اللہ عذاب دینے میں سارے جسم کے محتاج ہیں کہ سارا جسم سالم ہو تو پھر دے سکتے ہیں اور اگر جسم ذروں میں بکھر جائے تو عذاب نہیں دے سکتے؟ آپ کیسی بات کرتے ہیں؟ جسم کے ذرے الگ الگ ہوں تو اللہ پھر بھی عذاب دے سکتے ہیں۔

چھپکلی کی مثال:

ہم نے دنیا میں چھپکلی کو تڑپتے دیکھا ہے، اس کی دُم کہیں ہوتی ہے اور دھڑ کہیں اور ہوتا ہے، کچھ وقت وہ دُم بھی تڑپتی رہتی ہے یا نہیں؟ (تڑپتی ہے۔ سامعین) کچھ وقت تڑپنا تو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اس لیے یہ کیسی باتیں تم کہہ دیتے ہو کہ اللہ عذاب کیسے دے گا؟ اللہ ہمیں یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

عذاب اور ثواب اسی قبر میں ہے:

اسی قبر میں عذاب ہے جہاں مردے کو دفن کیا ہے، اسی قبر میں ثواب ہے

جہاں مردے کو دفن کیا ہے۔ ہاں روح وہاں پر ہے اور جسم یہاں پر ہے، روح اور جسم کے تعلق سے ثواب اور عذاب ہوتا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ جس طرح آدمی سویا ہوا ہو، آپ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہوں اور اچانک وہ ہل جائے آپ اسے کہتے ہیں کہ بھائی! کیا ہوا تجھے؟ وہ کہے کہ مجھے خواب آیا ہے کہ مجھے فلاں شخص نے ڈنڈا مارا ہے۔ آپ اس سے کہیں کہ تو جھوٹ بولتا ہے، تو ہمارے پاس سویا ہوا ہے، کس نے تجھے ڈنڈا مارا ہے؟ اب بتاؤ! یہ سونے والا سچ کہہ رہا ہے یا نہیں؟ (سچ کہہ رہا ہے۔ سامعین) کیوں؟ اس لیے کہ یہ ڈنڈا اس کی روح کو لگا ہے اور جسم محسوس کر رہا ہے، ہمیں نظر نہیں آ رہا۔ تو جس طرح سونے والے کو لگ رہا ہے لیکن ہمیں نظر نہیں آ رہا اسی طرح قبر والے کو بھی لگ رہا ہے لیکن ہمیں یہ بھی نظر نہیں آ رہا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"فَيَصِيحُ صَيْحَةً يَسْمَعُهُ الْخَلْقُ غَيْرَ الثَّقَلَيْنِ." [8]

اس قبر میں جو عذاب ہوتا ہے اسے جن وانس کے علاوہ ہر مخلوق سنتی ہے۔

دوسری روایت میں ہے:

"لَوْلَا أَنْ لَا تَدَافَنُوا لَدَعَوْتُ اللهَ أَنْ يُسْمِعَكُمْ عَذَابَ الْقَبْرِ." [9]

کہ میں اس لیے تمہیں عذاب قبر دکھائے جانے کی دعا نہیں کرتا کہ اگر تمہیں نظر آ گیا تو تم اپنے مردے دفن کرنا چھوڑ دو گے۔

اور ایک حدیث مبارک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خچر پر سوار ہو کر جا رہے تھے تو خچر بدکا۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ وہاں کچھ قبریں

8۔ مسند احمد: ج11 ص183 رقم الحدیث 13381

9۔ مسند احمد: ج10 ص496 رقم الحدیث 12491

ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کسی کو معلوم ہے کہ یہ کس کی قبریں ہیں؟ ایک بندے نے عرض کیا: جی ہاں! میں ان جانتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: یہ لوگ کب مرے تھے؟ اس آدمی نے عرض کیا: یہ لوگ زمانہ جاہلیت میں مرے تھے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان لوگوں کو ان قبروں میں عذاب ہو رہا ہے۔[10]

اب سوال یہ ہے کہ یہ خچر بدکا تھا تو کیا علیین و سجین سے گزر رہا تھا یا اسی قبرستان سے گزر رہا تھا؟ (اسی قبرستان سے۔ سامعین) اگر عذاب وہاں ہو رہا تھا تو خچر یہاں سے کیسے بدکا؟ اتنی دور سے خچر نے کیسے سن لیا؟ یہ بات سمجھ میں آ رہی ہے؟ (جی ہاں۔ سامعین) معلوم ہوا کہ عذاب اصل تو سجین میں روح کو ہو رہا تھا لیکن روح کے تعلق سے اسی قبر میں پڑے جسم کو بھی ہو رہا تھا جس کو خچر سن کر بدکا تھا۔

ثواب و عذابِ قبر پر اشکال کا جواب:

بعض اشکال ایسے ہوتے ہیں جو بڑے وزنی معلوم ہوتے ہیں، اس لیے ان کو حل کرنا چاہیے۔ ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ ہمارے پاس قبرستان میں کتنی قبریں ایسی ہیں کہ وہاں سے ہمارے جانور گزرتے رہتے ہیں لیکن وہ تو کبھی نہیں بدکے۔ اگر اسی قبر میں عذاب ہوتا ہے تو جانور آج کیوں نہیں بدکتے؟

میں جواب کو سمجھانے کے لیے دو مثالیں دیتا ہوں۔

[1]: میں نے کہا: ہمارا گھوڑا جس نے ریل گاڑی کو نہیں دیکھا اور اچانک دیکھے تو بدکتا ہے کہ نہیں؟ (بدکتا ہے۔ سامعین) اور جن کے گھوڑے ریل گاڑی کی پٹڑی کی ساتھ رہتے ہیں کبھی وہ بھی بدکے ہیں؟ (نہیں۔ سامعین)

10۔ صحیح مسلم، رقم: 2867

[2]: ہم اچانک کبھی ایسی جگہ پر جا کر سوئیں جہاں سے ریل گزرتی ہے تو بتاؤ کہ وہاں نیند آتی ہے؟ (نہیں۔ سامعین) اور جن کے گھر ریل کی پٹڑی کے ساتھ ہیں ان کی آنکھ ہی نہیں کھلتی۔ میں نے کہا: بھائی! یہ گدھے اور خچر تو روزانہ ان قبرستانوں میں عذاب دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں تو یہ کیسے بدکیں گے؟ کبھی کبھار ہو تو بدکیں، یہ روزانہ دیکھیں تو بدکیں گے کیسے؟

انسان کی حفاظت کا انتظام:

﴿لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ﴾

اللہ رب العزت اپنی شانِ کریمی بیان فرما رہے ہیں۔ فرمایا: ہم نے انسان کے آگے اور پیچھے ایسے فرشتے متعین کر دیے ہیں جو ہر وقت انسان کی حفاظت کر رہے ہیں۔ خدا کی کتنی شان کریمی ہے اور ہمیں نظر ہی نہیں آ رہی۔

روح المعانی میں علامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ آدمی کے دائیں اور بائیں ہر وقت فرشتے متعین ہیں جو گڑھے میں نہیں گرنے دیتے، حادثات نہیں ہونے دیتے اور جب اللہ کسی بندے کو تکلیف دینے کا فیصلہ فرماتے ہیں تو پھر فرشتے ہٹا لیے جاتے ہیں اور بندے پر تکلیف آ جاتی ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس سے بھی عجیب بات فرماتے ہیں کہ فرشتے انسان پر متعین ہیں جو اس کی حفاظت کرتے ہیں حتیٰ کہ گناہوں سے بھی اس کی حفاظت کرتے ہیں اور اگر یہ گناہ کر بھی لیتا ہے تو پھر کچھ دیر کے لیے نہیں لکھتے تاکہ یہ توبہ کر کے اسے ختم کر لے اور جب یہ توبہ کر کے بھی معاف نہیں کرواتا تو پھر آخر ان کو گناہ لکھنا پڑتا ہے تو لکھ دیتے ہیں۔

حضرت کعب احبار رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر اللہ رب العزت نے انسان

کی حفاظت کے لیے فرشتے متعین نہ کیے ہوتے تو جنات انسان کا جینا مشکل کر دیتے۔

حق اور باطل کی مثال:

﴿اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحۡتَمَلَ السَّيۡلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ﴾

اللہ تعالیٰ نے اس میں حق اور باطل کی مثال بیان فرمائی ہے۔ اللہ فرماتے ہیں کہ حق اور باطل کی مثال ایسی ہے جیسے بارش برستی ہے تو وادیاں بہہ پڑتی ہیں، اس میں ناکارہ چیز یعنی کچرا بھی ہوتا ہے اور اس میں کام کی چیز یعنی پانی بھی ہوتا ہے، کچرا اور جھاگ اوپر ہوتا ہے تو بندہ سمجھتا ہے کہ جھاگ بہت زیادہ ہے لیکن کچھ دیر کے بعد جب پانی تھمتا ہے تو جھاگ ختم ہو جاتی ہے اور پانی جس سے سبزہ اگنا ہوتا ہے وہ نیچے رہ جاتا ہے۔ ایسے ہی باطل کا طوفان آتا ہے تو جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے، پھر حق نیچے سے ابھر آتا ہے۔

ہدایت ملنے کی دو صورتیں:

﴿اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَتَطۡمَئِنُّ قُلُوۡبُهُمۡ بِذِكۡرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكۡرِ اللّٰهِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ ؕ ۲۸﴾

دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں اللہ کی ہدایت کا نظام ایسا ہے کہ کبھی بندہ محنت کرتا ہے تو اسے ہدایت مل جاتی ہے اور کبھی بندہ محنت نہیں کرتا بلکہ اللہ اسے ویسے ہی چن لیتے ہیں۔ کبھی نمازیں پڑھ رہا ہے، روزے رکھ رہا ہے تو اللہ مغفرت فرما دیتے ہیں اور کبھی اللہ اس کی مغفرت کا ایسا بہانہ تلاش کرتے ہیں کہ بندے کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ اللہ معافی کا انتظام فرما لیتے ہیں۔

میں اس پر کئی واقعات پیش کر سکتا ہوں لیکن ابھی صرف دو واقعے آپ کی

خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ ایک گزشتہ امت کا اور ایک اس امت کا۔

گزشتہ امت میں بنی اسرائیل کی ایک بدکردار عورت تھی۔ راستے میں ایک کنویں سے اس کا گزر ہوا۔ کنویں کے قریب ایک کتا پانی نہ ملنے کی وجہ سے پیاس سے سسک رہا تھا۔ عورت زانیہ ہے، عورت فاحشہ ہے، عورت بدکردار ہے۔ اس عورت نے دوپٹے کو پھاڑا، اس سے ڈول کی رسی بنا کر کنویں میں اتارا اور اس سے پانی نکال کر اس کتے کو پلایا۔ اس عمل کی وجہ سے اللہ نے اس عورت کی بخشش فرمادی۔ [11]

فضائل درود شریف حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ ہے۔ میں ان حضرات سے کہتا ہوں جو تبلیغی جماعت سے وابستہ ہیں کہ اس فضائلِ اعمال کی تعلیم کرائیں جس میں فضائل درود شریف موجود ہے۔ بعض ناشروں نے فضائلِ درود شریف کو الگ کر دیا ہے اور باقی فضائل اعمال کو اکٹھا چھاپ دیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ فضائل درود شریف ٹھیک تھا تو الگ کیوں کیا ہے؟

میں نے کہا: حضرت شیخ نے لکھا ہے لیکن دکانداروں نے الگ کیا ہے۔ فضائلِ نماز حضرت شیخ زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی، فضائلِ قرآن حضرت شیخ زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی، فضائلِ رمضان حضرت شیخ زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی، فضائلِ درود بھی حضرت شیخ زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے ہی لکھی۔ یہ سارے رسالے حضرت شیخ کے ہیں۔ آپ نے صرف ایک ہی رسالے کو الگ کر دیا اور باقیوں کو اکٹھے کر دیا، یہ کیوں کیا؟

خیر میں جو واقعہ سنا رہا تھا وہ فضائل درود شریف میں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک خاتون حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت

11۔ صحیح البخاری، رقم: 3321

میں حاضر ہوئی۔ کہنے لگی کہ میری بیٹی کا انتقال ہو گیا ہے اور میری یہ خواہش ہے کہ میں اس کو خواب میں دیکھوں۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایسا کرو کہ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد چار رکعت نفل نماز پڑھنا اور ہر رکعت میں سورۃ الفاتحہ کے بعد الهكم التكاثر پڑھنا اور اس کے بعد لیٹ جانا۔ سونے تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھتی رہنا۔

اس عورت نے یہی کام کیا۔ خواب میں کیا دیکھتی ہے کہ اس کی بیٹی نہایت سخت عذاب میں مبتلا ہے۔ تارکول کا لباس پہنا ہوا ہے۔ دونوں ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ پاؤں میں آگ کی زنجیر ہے۔ وہ عورت صبح اٹھی تو بہت پریشان تھی۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور خواب کا یہ ماجرا انہیں سنایا۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بیٹی کی طرف سے صدقہ کرو، شاید اللہ رب ا لعزت تیرے صدقے کی وجہ سے تیری بیٹی کو معاف فرمادے گا۔

اگلے دن حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے خود خواب دیکھا کہ جنت کا ایک حسین باغ ہے جس میں ایک اونچے تخت پر ایک نہایت خوبصورت لڑکی بیٹھی ہوئی ہے۔ اس لڑکی نے حسن بصری سے کہا کیا آپ نے مجھے پہچانا؟ حسن بصری فرمانے لگے کہ میں نے تو تمہیں نہیں پہچانا۔ وہ لڑکی کہنے لگی کہ میں وہی لڑکی ہوں جس کی ماں کو آپ نے درود شریف پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تمہاری ماں میرے پاس آئی تھی اس نے تو بتایا تھا کہ تمہارا حال خراب ہے۔

لڑکی کہنے لگی کہ میری حالت وہی تھی جو میری ماں نے آپ کو بتائی تھی۔ پوچھا کہ تمہاری حالت درست کیسے ہوئی؟ کہنے لگی کہ ہم ستر ہزار آدمی اسی عذاب میں مبتلا تھے کہ ایک نیک صالح بزرگ کا گزر ہمارے قبرستان پر ہوا، انہوں نے ایک دفعہ درود شریف پڑھ کر اس کا ثواب ہم سب کو پہنچا دیا۔ اللہ تعالیٰ کے حضور وہ درود شریف

ایسا قبول ہوا کہ اللہ نے اس کی برکت سے ہم سب کو اس عذاب سے آزاد کر دیا۔[12]

یہ درود پاک کی فضیلت ہے۔ ایک مرتبہ آپ بھی درود پاک پڑھ لیں:

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی إِبْرَاھِیْمَ وعَلٰی آلِ إِبْرَاھِیْمَ إِنَّکَ حَمِیدٌ مَّجِیدٌ۔ اَللّٰھُمَّ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی إِبْرَاھِیْمَ وعَلٰی آلِ إِبْرَاھِیْمَ إِنَّکَ حَمِیدٌ مَّجِیدٌ۔

ہم بھی دعا کرتے ہیں یا اللہ جو درود پاک پڑھا ہے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک آنے والے جتنے مسلمان ہیں، اللہ اس کا ثواب ان سب کو عطا فرما۔

اللہ سے مانگنے میں بخل نہیں کرنا چاہیے:

ہم مانگنے میں کیوں بخل کرتے ہیں! دینا اللہ نے ہے، ہم نے تھوڑی دینا ہے، آپ اللہ کی شان کے مطابق مانگا کریں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ چھوٹا سا درود ہے اس کا ثواب کس کس کو دیں گے؟ یہ ہمارا کام تھوڑی ہے، یہ اللہ کا خزانہ ہے، اللہ کی شان کے مطابق مانگا کرو! ہمارے درود کی وجہ سے ہمارا دشمن بھی بخشا جائے تو ہمیں کوئی تکلیف ہے؟ (سامعین۔ نہیں) ہمیں خوش ہونا چاہیے۔ ہمیں گالیاں دینے والا بخشا جائے ہمیں خوش ہونا چاہیے، ہماری غیبت کرنے والا بخشا جائے ہمیں خوش ہونا چاہیے، ہمارے راستے میں روڑے اٹکانے والا بخشا جائے ہمیں خوش ہونا چاہیے۔ کسی کے جہنم میں جانے سے ہمارا کیا فائدہ ہے؟ اللہ پاک ہر مسلمان کو جنت کی نعمت عطا فرمائے اور جو کفار زندہ ہیں اللہ ان کو ہدایت کی دولت عطا فرمائے۔ (آمین)

منکرین رسالت کی تردید:

﴿وَ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ؕ قُلْ کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیْدًۢا بَیْنِیْ وَ

12۔ فضائل درود شریف: ص170، ص171

بَيۡنَكُمۡ ۙ وَمَنۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ الۡكِتٰبِ ﴿۴۳﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ اتنے دلائل کے باوجود کافر اب بھی کہتے ہیں کہ تو پیغمبر نہیں ہے۔ اے میرے پیغمبر! آپ ان سے زیادہ بحث نہ کریں، بس چھوٹی سی بات ان سے کہہ دیں۔ وہ بات کیا ہے؟ ﴿قُلۡ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيۡدًاۢ بَيۡنِىۡ وَبَيۡنَكُمۡ ۙ وَمَنۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ الۡكِتٰبِ ﴿۴۳﴾﴾

آپ فرما دیا کریں کہ میری نبوت پر دو قسم کی دلیلیں ہیں؛ دلائلِ نقلیہ اور دلائلِ عقلیہ۔ دلائلِ عقلیہ معجزات ہیں اور دلائلِ نقلیہ آسمانی کتابیں ہیں۔ میری نبوت پر یقین نہیں ہے تو بتاؤ! میرے اشارے سے چاند کیسے ٹوٹا تھا؟ میری نبوت پر یقین نہیں ہے تو بتاؤ زہر تم نے کھلایا میں کیسے بچا ہوں؟ تین سو تیرہ کو فتح کیسے ملی ہے؟ یہ میری نبوت پر دلائل ہیں اور اگر پھر بھی تم نہیں مانتے تو جاؤ تورات پڑھ لو، جاؤ انجیل پڑھ لو، جاؤ زبور پڑھ لو، آسمانی کتابوں کے علماء سے پوچھو! تمہیں وہ بتائیں گے کہ میری نبوت برحق ہے یا نہیں؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلائلِ عقلیہ بھی ہیں اور دلائلِ نقلیہ بھی ہیں۔ وہ نہیں مانتا جس کے پاس عقل نہیں ہے یا وہ نہیں مانتا جس کے پاس کتاب نہیں ہے۔ اللہ کا کرم ہے کہ اللہ نے مسلمان کو عقل بھی دی ہے اور اللہ نے مسلمان کو آسمانی کتب کا علم بھی دیا ہے۔ اللہ ہم سب کو اس نعمت کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ ابراہیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿الٓرٰ ۟ كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَيۡكَ لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ۙ۬

بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ اِلٰى صِرَاطِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِۙ ﴿۱﴾﴾

سورت کا تعارف:

سورۃ ابراہیم مکی سورۃ ہے، اس میں سات رکوع اور بانوے آیات ہیں۔
سورۃ ابراہیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ ہے اور ان کی دعاؤں کا ذکر ہے اس لیے اس مناسبت سے اس سورۃ کا نام ''ابراہیم'' رکھا گیا ہے۔

مکہ مکرمہ میں زیادہ محنت عقائد پر ہوئی ہے اور مدینہ میں زیادہ تر احکام نازل ہوئے ہیں اور عقائد میں سے سب سے اہم پہلا عقیدہ توحید ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوری زندگی دعوتِ توحید میں گزری ہے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ توحید کا تذکرہ ہو اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر نہ ہو۔ جب سورۃ میں توحید کے مضامین بکثرت ہوں گے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرے بھی ضرور ہوں گے۔

﴿الٓرٰ﴾... اس سورۃ کو الف، لام، را سے شروع کیا ہے اور الف، لام، را حروفِ مقطعات میں سے ہیں۔ مقطعات یہ مقطعۃ کی جمع ہے، مقطعۃ یہ قطع سے بنا ہے اور قطع کا معنی ہوتا ''کاٹنا'' چونکہ ان حروف کو کاٹ کاٹ کر پڑھتے ہیں الف... لام...

را... اس وجہ سے ان کو مقطعات کہا گیا ہے۔ ان حروف کا معنی اللہ کی ذات کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ اگر اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے سامنے بیان نہیں فرمایا۔ جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بتایا تو ہمیں بھی حق نہیں ہے کہ ہم اس کی کھود کرید کریں، اس لیے کہتے ہیں کہ الف، لام، را حروفِ مُتَشابہات میں سے ہیں اور مُتَشابہات جمع ہے مُتَشابہ کی۔ مُتَشابہ یہ اشتباہ سے بنا ہے، اشتباہ کا مطلب کہ جس کا معنی مشتبہ ہو، جس کا معنی معلوم نہ ہو، اس کو مُتَشابہات کہتے ہیں۔

مُتَشابہات کی اقسام:

مُتَشابہات کی دو قسمیں ہیں:

1: جس کا معنی معلوم ہو اور مراد معلوم نہ ہو۔

2: جس کا معنی بھی معلوم نہ ہو اور مراد بھی معلوم نہ ہو۔

♦ جس کا معنی معلوم ہو لیکن مراد غیر معلوم ہو جیسے حدیث مبارک میں ہے:

"يَدُ اللهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ." [13]

اللہ کا "ید" جماعت پر ہے۔

اب "ید" کا معنی تو معلوم ہے کہ عربی میں اس کا معنی ہاتھ ہے لیکن یہاں "ید" سے مراد کیا ہے؟ یہ ہمیں معلوم نہیں ہے۔

♦ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے فرمایا:

﴿وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا﴾ [14]

13۔ المستدرک علی الصحیحین للحاکم: ج1 ص316 رقم الحدیث 399

14۔ ھود 37:11

"اعین" جمع ہے عین کی۔ عین کا معنی عربی زبان میں آنکھ ہے لیکن یہاں عین سے مراد کیا ہے یہ اللہ ہی جانتے ہیں۔ اس کو کہتے ہیں کہ معنی معلوم ہو اور مراد غیر معلوم ہو۔

- ♦ قرآن کریم میں ہے:

﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾[15]

جب قیامت کے دن ساق سے پردہ ہٹادیا جائے گا۔

اب "ساق" کا معنی پنڈلی یہ تو ہمیں معلوم ہے لیکن جب اللہ کے لیے لفظ "ساق" آئے تو اس وقت معنی کیا ہوتا ہے؟ یہ ہمیں معلوم نہیں ہے۔ اسے معلوم المعنی اور غیر معلوم المراد کہتے ہیں۔

بالکل اسی طرح "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴿۵﴾"[16] ہے۔ "استویٰ" کا معنی بھی معلوم ہے۔ "علیٰ" کا معنی بھی معلوم ہے اور "عرش" کا معنی بھی معلوم ہے لیکن جب یہ اللہ کے لیے کہا جائے تو اس وقت اس کا معنی کیا ہوتا ہے یہ ہمیں معلوم نہیں ہے۔ اسے معلوم المعنی اور غیر معلوم المراد کہتے ہیں۔

اور متشابہ کی ایک قسم غیر معلوم المعنی غیر معلوم المراد بھی ہے کہ ان کا لغوی معنی بھی معلوم نہیں اور یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی کیا مراد ہے! جیسے ﴿الٓرٰ﴾ الف... لام... را... کا معنی اور مراد دونوں معلوم نہیں۔ اس لیے اس کے معنی کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے۔ بعض حضرات کو یہ عادت ہوتی ہے کہ ایسی باریک باتیں پیش کرتے رہتے ہیں اور لوگ کہتے ہیں کہ جی فلاں تو بہت بڑا محقق ہے، دیکھو کیسے کیسے معنی

15۔ القلم 42:68

16۔ طٰہٰ 5:20

بیان کیے ہیں! تو جس معنی کے بیان کرنے کی اللہ رب العزت اجازت نہیں دیتے آپ اس کو کیوں بیان کرتے ہیں؟ قرآن کریم میں ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ﴾

وہ اللہ ہی ہے جس نے قرآن مجید کو آپ پر نازل کیا ہے، اس میں بعض آیات محکمات ہیں جو کہ ام الکتاب ہیں یعنی اصل اصول یہی آیات ہیں جن کے معانی اور مفہوم میں کسی قسم کا اشتباہ یا التباس نہیں ہوتا، اور بعض آیات متشابہات ہیں۔

﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ﴾

جن لوگوں کے دل میں کجی اور ٹیڑھ پن ہے وہ فتنہ پھیلانے کے لیے ان متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کی تاویلات کرنے میں لگے رہتے ہیں۔

﴿وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ؔۘ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَ مَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ۝۷﴾ [17]

حالانکہ ان آیات کا صحیح صحیح مطلب اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، اور جو لوگ راسخ فی العلم ہیں وہ کہتے ہیں "اٰمَنَّا بِهٖ" کہ ہم ان پر ایمان لے آئے ہیں، یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے اور نصیحت صرف عقلمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔

اس لیے یہاں پر اپنی گردن کو جھکا دینا چاہیے۔ اللہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ

17۔ آل عمران 3:7

تمہارے علم کی طاقت اتنی ہے کہ تم ایک الف کا معنیٰ نہیں جانتے تو پورے قرآن کا معنیٰ تم کیا سمجھو گے! اپنی اوقات دیکھو الف، لام، را کا معنیٰ تمہیں نہیں آتا اور بحث کبھی میرے نبی سے ہے اور کبھی میرے قرآن سے ہے۔

کتاب کے نازل کرنے کا مقصد:

﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾

اے پیغمبر! ہم نے آپ کی طرف قرآن کو نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف نکالیں۔

"ظلمات" سے مراد کفر، شرک اور بدعات کے اندھیرے ہیں اور "نور" سے مراد توحید کی، سنت کی اور اعمال حسنہ کی روشنی ہے۔ آپ یہاں ایک نکتہ سمجھیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ؛ کفر اور شرک کے لیے لفظ "ظلمات" جمع لائے ہیں اور توحید و سنت کے لیے لفظ "نور" مفرد لائے ہیں یہ سمجھانے کے لیے کہ کفر کی کئی قسمیں ہوتی ہیں اس لیے ظلمات کو جمع لائے اور نور کا لفظ مفرد لائے یہ بتانے کے لیے کہ ایمان ایک ہی ہوتا ہے، بدعات کی کئی قسمیں ہوتی ہیں لیکن سنت کی قسمیں نہیں ہوتیں سنت ہر علاقہ میں ایک ہی ہوتی ہے۔ مثلاً سونے کا جو سنت طریقہ ہے وہی سرگودھا پاکستان میں ہے، وہی سونے کا طریقہ امریکہ میں ہے، وہی سعودی عرب میں ہے جبکہ بدعات کی کئی قسمیں ہیں، ہر علاقہ کی بدعت الگ ہوتی ہے۔

سنت اور بدعت کی مثال:

گندم کی بھی فصل ہوتی ہے اور چاول کی بھی فصل ہوتی ہے، ہم گندم بھی کاشت کرتے ہیں اور چاول بھی کاشت کرتے ہیں، ان فصلوں کے ساتھ ساتھ جڑی بوٹیاں بھی ہوتی ہیں جو گندم اور چاول کی فصل کو خراب کرتی ہیں، اب کھیت میں جڑی بوٹیوں کی تو کئی قسمیں ہوتی ہیں لیکن گندم اور چاول کی کئی قسمیں نہیں ہوتیں، تو

بدعات کی کئی قسمیں ہوتی ہیں لیکن سنت کی کئی قسمیں نہیں ہوتیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ کفر اور شرک کو ختم کرنے کے لیے توحید اور سنت کی روشنی کو لانا ہوگا، اسی طرح بدعات کو ختم کرنے کے لیے سنت کی پیروی کرنی ہوگی۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے بہت بڑے خلیفہ ہیں مولانا عبد الغنی پھولپوری رحمہ اللہ، ایک شخص ان کا مرید ہوا جو پہلے بدعتی تھا۔ ہمارے ہاں بیعت کو خشک طبقہ قبول نہیں کرتا، وہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ بدعتیوں کا کام ہے حالانکہ بیعت لینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے اور بیعت کرنا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ ہے تو جو کام اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو تو وہ بدعت کیسے ہو سکتا ہے؟

کبھی بیعت علی الایمان ہوتی کہ کوئی کافر کلمہ پڑھتا اور مسلمان ہو جاتا، کبھی بیعت علی ارکان الاسلام ہوتی کہ بندہ مؤمن ہے تو وہ بیعت کرتا کہ میں ارکان کی پابندی کروں گا، کبھی بیعت علی الموت ہوتی کہ ایک مسلمان ہے وہ اس بات پر بیعت کرے کہ میں مر تو سکتا ہوں لیکن حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ ان تینوں قسموں کی بیعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ہوتی تھی اور ان تینوں قسموں کی بیعت آج بھی ہے۔

حضرت مولانا عبد الغنی پھولپوری رحمہ اللہ سے اس بدعتی نے بیعت ہونے کے بعد پوچھا: حضرت! کیا میں درودِ تاج اور درودِ ماہی پڑھ سکتا ہوں؟ تو حضرت فرمانے لگے: بھائی! ایک درود وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنایا ہے اور ایک درود وہ ہے جو مولویوں نے بنایا ہے، آپ بتاؤ! کون سا درود بہتر ہے؟ اس نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والا۔ فرمایا: "اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ" والا درود یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور یہ جو درود ہیں یہ بعد کے مولویوں کے ہیں، تجھے جس

سے زیادہ پیار ہے تو وہ پڑھ لیا کر۔ تو اس کو بات سمجھ آ گئی۔

نبی کی وحی اپنی قوم کی زبان میں ہوتی ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ﴾

اللہ رب العزت نے یہاں ایک ضابطہ بیان فرمایا کہ ہم نے جب بھی کوئی نبی بھیجا ہے تو اس پیغمبر کو وہی زبان دے کر بھیجا ہے جو زبان اس کی قوم کی تھی۔

اللہ نے یہ نہیں فرمایا ”وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ اُمَّتِهٖ“ کہ ہم نبی کو اس کی امت کی زبان دے کر بھیجتے ہیں بلکہ فرمایا: ﴿اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ﴾ کہ ہم نبی کو اس کی قوم کی زبان دے کر بھیجتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ فرماتے کہ ہم نبی کو اس امت کی زبان دے کر بھیجتے ہیں تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم عربی میں بھی بات کرتے، اردو، انگلش اور فارسی میں بھی بات کرتے، اللہ نے ”اُمَّتِهٖ“ کے بجائے ”قَوْمِهٖ“ فرمایا ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم قریش تھی اور ان کی زبان عربی تھی، اس لیے اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عربی زبان دے کر بھیجا ہے۔

نبی سارے جہاں کے ہیں تو ایک زبان میں وحی کیوں؟

اشکال یہ ہوتا ہے کہ جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سارے جہان کے نبی ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک قوم کی زبان دے کر کیوں بھیجا گیا ہے؟

اس کی کئی وجوہات ہیں:

[۱]: پہلی وجہ تو یہ ہے کہ قومِ عرب میں اگرچہ بڑے بڑے گناہ تھے لیکن ان میں بعض صفات ایسی تھیں جس میں وہ لوگ بے مثال اور یکتا تھے۔ وہ صفات کسی اور قوم میں نہیں تھیں۔ مثلاً سخاوت اس قوم کا مزاج تھا، یہ لوگ بڑے سخی تھے اور شجاعت اس قوم کا مزاج تھا، یہ بڑے ہی بہادر لوگ تھے اور وفا ان لوگوں کا مزاج تھا اور شاید

کہ ان جیسی وفا باقی قوموں میں ہو! اور مہمان نوازی ان لوگوں کا مزاج تھا، جنگ کرنا ان لوگوں کا مزاج تھا... تو یہ اوصاف ایسے تھے جو دین کی اشاعت کے لیے کافی تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو عربی زبان دے کر بھیجا تاکہ دین کی اشاعت ہو۔

یہ بات واضح ہے کہ دین کی اشاعت کے لیے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے، یہ پیسا اشاعت دین کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے۔ پیسا ہوگا تو دین کی اشاعت ہوگی۔ عرب قوم میں سخاوت تھی، جب ان میں نبی آیا اور اس نے ان کو زکوٰۃ دینے کا کہا تو ان لوگوں نے اپنا پیسا بہا دیا۔ ان لوگوں میں شجاعت تھی کہ یہ لوگ بڑے بہادر تھے۔ جب ان کو جہاد کرنے کا حکم دیا گیا تو بڑی دلیری کے ساتھ انہوں نے جہاد کیا۔ ان لوگوں نے اپنے گھر کو چھوڑا، اپنے وطن کو چھوڑا اور جہاد کرنے کے لیے نکل پڑے۔

یہ اوصاف ان لوگوں میں تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال دیکھیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ان اوصاف کو نہیں بدلا بلکہ ان کے اوصاف کا رخ بدلا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت ہی غصے والے آدمی تھے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس غصے کو بزدلی میں نہیں بدلا بلکہ غصے کا رخ بدلا ہے، غصہ کا ازالہ نہیں کیا بلکہ امالہ کیا اور فرمایا: اے عمر! کافروں کو مارنا ہے، اپنوں کو نہیں مارنا!

تو بعض اوصاف اللہ نے عربوں کو ایسے دیے ہیں جو کسی اور میں نہیں ہیں۔

[۲]: اور دوسری وجہ یہ ہے کہ آسمان کی دفتری زبان عربی ہے۔ ملائکہ کی زبان عربی ہے، جنت اور جہنم والوں کی زبان عربی ہے اور مرنے کے بعد قبر میں بھی عربی زبان ہے چاہے کوئی انگریز ہو، پختون ہو، پنجابی ہو کسی بھی زبان والا ہو تو فرشتے نے پوچھنا ہے: "مَنْ رَّبُّكَ" اس وجہ سے اللہ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عربی زبان دی ہے۔

[۳]: اور تیسری وجہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ

علیہ السلام تک جتنے انبیاء علیہم السلام ہیں وہ دائرۂ نبوت ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مرکزِ دائرہ نبوت ہیں اور جو مرکز ہوتا ہے وہ بالکل درمیان میں ہوتا ہے۔ مکہ مکرمہ کو دیکھا جائے تو وہ زمین کے درمیان میں ہے، اسی وجہ سے اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو زمین کے درمیان میں بھیجا ہے تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ نبی ہم سے دور ہیں اور فلاں سے قریب ہیں بلکہ اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو زمین کے مرکز میں بھیج کر سب کو راضی کر دیا اور مرکزِ زمین والوں کی زبان عربی تھی، اس لیے قرآن بھی عربی زبان میں دیا اور اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو زبان بھی عربی دی ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "أَحِبُّوا الْعَرَبَ لِثَلَاثٍ" کہ تین وجوہات کی بنا پر عرب کے ساتھ پیار کیا کرو؛ "لِأَنِّيْ عَرَبِيٌّ" کیونکہ میں عربی ہوں، "وَالْقُرْآنُ عَرَبِيٌّ" اور قرآن بھی عربی ہے "وَكَلَامُ أَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِيٌّ" اور اہلِ جنت کی زبان بھی عربی ہو گی۔[18]

اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید کے لیے ایک زبان کا انتخاب فرمایا ہے اور باقی زبانوں کے ترجمے کا انتظام فرما دیا ہے۔ اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اقوامِ عالم کا نبی بنایا ہے۔ اگر قرآن ہر قوم کی زبان میں ہوتا تو قرآن کو محفوظ رکھنا بہت ہی مشکل ہو جاتا، اس وجہ سے اللہ نے ایک زبان کا انتخاب کیا ہے اور وہ عربی زبان ہے۔

[۴]: اور چوتھی وجہ قرآن کو عربی زبان میں نازل کرنے کی یہ ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پوری کائنات کے نبی ہیں اور قرآن کو ایسی زبان میں ہونا چاہیے تھا

18۔ المعجم الکبیر للطبرانی: ج5 ص324 رقم الحدیث 11278

جس میں جامعیت ہو۔ اور یہ جامعیت باقی تمام زبانوں میں نہیں بلکہ عربی زبان میں تھی۔ اس وجہ سے قرآن مجید کو عربی زبان میں نازل کیا ہے۔

حضور علیہ السلام پوری کائنات کے نبی ہیں:

اور آگے اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے فرمایا:

﴿وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾

اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو بھی دلائل دے کر بھیجا تاکہ وہ اپنی قوم کو ظلمات سے نور کی طرف نکالیں۔

یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے فرمایا گیا ہے ﴿لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ کہ آپ لوگوں کو نکالیں ظلمات سے نور کی طرف اور موسیٰ علیہ السلام کے لیے فرمایا گیا ہے ﴿اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ کہ آپ اپنی قوم کو نکالیں ظلمات سے نور کی طرف۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوری کائنات کے نبی ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پورے لوگوں کے نبی نہیں بلکہ ایک قوم کے نبی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نبی القوم ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبی الناس ہیں۔

احمد سعید ملتانی کے اعتراض کا جواب:

﴿وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۶﴾﴾

اس وقت کو یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے یہ بات کہی تھی

کہ اس نعمت کو یاد کرو جو اللہ نے تم پر کی ہے، وہ نعمت یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں فرعون کے لوگوں سے نجات دی ہے، وہ لوگ تمہیں تکلیف دیتے تھے، تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ رکھتے تھے، اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارا بڑا امتحان تھا۔

ہم واقعات کی تفصیل میں نہیں جاتے، ہم عقائد پر بات کرتے ہیں، نظریات پر بات کرتے ہیں کہ انسان کا نظریہ ٹھیک ہونا چاہیے۔ ہمارے پاکستان کا ایک آدمی تھا جس نے کتاب لکھی "قرآن مقدس اور بخاری محدث" اس کتاب میں اس نے بخاری شریف کی ایسی باون حدیثیں پیش کی ہیں جو اس کے ذہن کے مطابق قرآن کے خلاف ہیں۔ کہتا ہے کہ فلاں حدیث صحیح نہیں ہے، فلاں حدیث صحیح نہیں ہے، کیوں صحیح نہیں؟ اس لیے کہ قرآن کے خلاف ہے۔ اس کا نام ہے احمد سعید ملتانی، اس نے یہ کتاب لکھی۔ یہ خود تو اب فوت ہو گیا ہے لیکن اس کی کتاب موجود ہے۔ اس کتاب میں اس نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نکاح کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ﴾[19]

کہ "نساء" کے ساتھ نکاح کرو، دو کے ساتھ یا تین یا چار کے ساتھ۔

تو اللہ نے لفظ "نساء" بولا ہے۔ احمد سعید کہتا ہے کہ "نساء" کا لفظ عاقلہ بالغہ پر بولا جاتا ہے اور امام بخاری نے حدیث ذکر کی ہے کہ جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا امی عائشہ کے ساتھ نکاح ہوا تو اس وقت امی عائشہ کی عمر 6 سال تھی اور رخصتی کے وقت ان کی عمر 9 سال تھی۔ کہتا ہے کہ یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے کیوں کہ قرآن

19۔ النساء 3:4

کہتا ہے کہ نساء سے نکاح کرو اور نساء بالغہ عورت کو کہتے ہیں جبکہ حدیث میں اس کے بر عکس ہے، کیونکہ نکاح کے وقت حضرت عائشہ کی عمر چھ سال تھی تو چھ سالہ بچی ہوتی ہے عورت نہیں ہوتی! اب اگر ہم اس حدیث کو صحیح مانیں تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے خلاف کام کیا ہے اور اگر قرآن کو صحیح مانیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری نے جھوٹ بولا ہے۔ تو اس نے یہ اعتراض کیا ہے بخاری شریف پر۔

ہمارے ہاں مزاج یہ ہے کہ جو آدمی اٹھے اور اکابر کی تحقیقات پر پانی پھیر دے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ بہت بڑا آدمی ہے۔ میں نے کہا: اگر یہی بات ہے تو سب سے بڑا آدمی تو پھر ابلیس کو کہنا چاہیے کیوں کہ وہ خدا کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا جب اللہ نے حکم دیا تھا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو! تو ابلیس نے تکبر کی وجہ سے انکار کر کے اپنے اعلیٰ ہونے پر دلیل دی کہ میں آگ سے پیدا ہوا ہوں اور آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا ہوئے ہیں، آگ اوپر ہوتی ہے اور مٹی نیچے ہوتی ہے، لہذا افضل؛ مفضول کو سجدہ نہیں کرتا۔ تو پھر ابلیس کو بھی "علامہ" کہنا چاہیے لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے جواب دیا "فَاخْرُجْ" دفع ہو جا! تو ہم سے بحث کرتا ہے!

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "بدائع الفوائد" میں مٹی کے آگ سے افضل ہونے پر سترہ دلائل پیش کیے ہیں۔[20] تو اللہ کو ان دلائل کا علم نہیں تھا؟ بالکل تھا لیکن اللہ نے اسے جواب نہیں دیا بلکہ فرمایا: نکل جا!

تو میں سمجھا رہا تھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ فلاں بہت بڑا آدمی ہے، فلاں بڑا علامہ ہے، کیوں؟ اس لیے کہ اس نے فلاں کے خلاف لکھا ہے، فلاں کے خلاف لکھا

20۔ بدائع الفوائد لابن القیم: ج4 ص949 تا953

ہے حالانکہ یہ بڑے پن کی نشانی نہیں ہے، یہ چھوٹے پن کی نشانی ہے، اکابرین کے خلاف لکھنے سے آدمی بڑا نہیں بنتا۔

میں احمد سعید کا جواب دینے لگا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ نے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ﴾

وہ وقت یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا کہ اللہ کی نعمت کو یاد رکھو جب اللہ نے تم کو فرعون کے لوگوں سے نجات دی، وہ تمہیں تکلیف دیتے تھے، تمہارے بچوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری بچیوں کو زندہ رکھتے تھے۔

اللہ نے بچوں کے لیے ”ابناء“ کا لفظ بولا ہے اور ابناء کے مقابلے میں بچیوں کے لیے ”نساء“ کا لفظ بولا ہے۔ جس طرح ابناء سے مراد بچے ہیں اسی طرح نساء سے مراد بچیاں ہیں۔ میں نے کہا کہ بخاری شریف کی روایت قرآن کے خلاف تب ثابت ہوگی جب نساء کا معنی صرف بالغ عورت ہو اور لیکن قرآن نابالغ کو بھی نساء کہہ رہا ہے تو پھر بخاری کی یہ حدیث قرآن کے خلاف نہیں ہے۔

اب امام بخاری رحمہ اللہ نے بات غلط کی یا ان علامہ صاحب نے بات غلط کی ہے؟ ان علامہ صاحب نے بات غلط کی ہے۔ ہم نے تو دلیل سے بات کی ہے، ہم نے اس پر فتویٰ نہیں لگایا۔ اب تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ لوگ اس جواب دینے کو بھی سختی کہتے ہیں، ہمیں یہ بات سمجھ نہیں آتی۔ بھائی! میں مسئلہ سمجھا رہا ہوں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے درست بات کی ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے غلطی نہیں کی، جو اعتراض کرتا ہے اس کو تو جواب دینا چاہیے۔ اب جواب دینا کون سی سختی ہے؟

فضائل اعمال پر اعتراض کیا گیا تو ہم نے اس کا جواب دیا۔ میں آپ سے یہ

پوچھنا چاہتا ہوں کہ بتاؤ! اعتراض کرنا جرم ہے یا اس کا جواب دینا جرم ہے؟ اعتراض کرنا جرم ہے لیکن جواب دینا جرم نہیں ہے۔ جو شخص اکابر پر اعتراض کرے آپ اس کو فرقہ واریت نہیں کہتے اور جو اکابر کا دفاع کرے آپ اس کو فرقہ واریت کہتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے! لیکن ہم اس کی پروا نہیں کرتے، ہم اپنے اکابر کا دفاع کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے ان شاء اللہ۔

گزشتہ اقوام کے دو اعتراض اور انبیاء کے جواب:

﴿جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَرَدُّوۡۤا اَیۡدِیَهُمۡ فِیۡۤ اَفۡوَاهِهِمۡ وَ قَالُوۡۤا اِنَّا کَفَرۡنَا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ وَ اِنَّا لَفِیۡ شَکٍّ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَنَاۤ اِلَیۡهِ مُرِیۡبٍ ﴿۹﴾ قَالَتۡ رُسُلُهُمۡ اَفِی اللّٰهِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ یَدۡعُوۡکُمۡ لِیَغۡفِرَ لَکُمۡ مِّنۡ ذُنُوۡبِکُمۡ وَ یُؤَخِّرَکُمۡ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ قَالُوۡۤا اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا ؕ تُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ تَصُدُّوۡنَا عَمَّا کَانَ یَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاۡتُوۡنَا بِسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۱۰﴾﴾

پہلی قوموں کے پاس جب ان کے رسول واضح دلائل لے کر آئے اور انہوں نے اپنی قوم کو دعوت دی تو قوم نے دو اعتراضات کیے:

[1]: پہلا اعتراض انبیاء علیہم السلام کی توحید اور ایمان کی دعوت پر تھا۔ قوم کے لوگوں نے کہا: ﴿اِنَّا کَفَرۡنَا بِمَاۤ اُرۡسِلۡتُمۡ بِهٖ وَ اِنَّا لَفِیۡ شَکٍّ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَنَاۤ اِلَیۡهِ مُرِیۡبٍ﴾ کہ جس چیز کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو یعنی توحید پر یقین رکھنے اور ایمان لانے کی طرف تو ہم اس کے منکر ہیں اور ہمیں تمہاری اس دعوت میں شک ہے۔

[2]: اور دوسرا اعتراض ان کا یہ تھا: ﴿اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا﴾ کہ تم ہماری طرح بشر ہو۔

قوم نے یہ اعتراضات کیے تو انبیاء علیہم السلام نے ان کے جوابات دیے۔

پہلے اعتراض کا جواب یہ دیا کہ ﴿اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ کہ کیا تم لوگوں کو اللہ کے بارے میں شک ہے؟ اس کی توحید میں شک ہے؟ حالانکہ اللہ کی ذات تو وہ ذات ہے کہ جس نے آسمان و زمین کو بنایا ہے۔ تو آسمان و زمین کو بنانا خود اللہ کی وحدانیت کی دلیل ہے! لہٰذا جب آسمان و زمین کی تخلیق جیسی عظیم دلیل موجود ہے تو تمہارا شک کرنا نہایت تعجب کی بات ہے!

اور جب انہوں نے دوسرا اعتراض کیا کہ نبی ہماری طرح بشر نہیں ہو سکتا تو انبیاء علیہم السلام نے ان کو جواب میں فرمایا: ﴿اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ﴾ کہ تمہاری یہ بات ٹھیک ہے کہ آپ بھی بشر ہیں اور ہم بھی بشر ہیں لیکن اللہ تعالیٰ جس پر چاہتے ہیں اپنا خصوصی احسان کرتے ہیں۔ تو اللہ نے ہم پر بھی احسان کیا کہ ہمیں نبی بنایا۔ بشریت؛ نبوت کے منافی نہیں ہے۔

انبیاء کا بشر ہونا ہمارے لیے اعزاز ہے:

ایک اعتراض اس وقت تھا اور ایک اعتراض آج کے اس دور میں کیا جاتا ہے۔ اُن لوگوں نے اعتراض یہ تھا کہ نبوت اور بشریت اکٹھی نہیں ہو سکتیں اور آج کے بعض لوگوں نے بھی یہی کہا ہے کہ نبوت اور بشریت اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ بس دونوں میں فرق اتنا ہے کہ انہوں نے بشر مانا لیکن نبی نہیں مانا اور انہوں نے نبی تو مانا لیکن بشر نہیں مانا، انہوں نے نبی کو دیکھا تھا اور انہوں نے نبی کو دیکھا نہیں ہے۔

اور ہم اھل السنۃ والجماعۃ نبی بھی مانتے ہیں اور بشر بھی مانتے ہیں، نبی ہوتا ہی بشر ہے اور جو بشر نہ ہو وہ نبی کیسے بن سکتا ہے؟ یہ تو ہمارے لیے اعزاز کی بات ہے کہ اللہ نے نبی کا انتخاب انسانوں میں سے کیا ہے۔ اللہ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ [21]

اللہ نے مومنین پر احسان کیا ہے کہ انہی میں سے نبی کو پیدا فرمایا ہے۔
یہ ہمارے لیے اعزاز کی بات ہے کہ نبی ہم میں سے ہے، اور کتنی کم عقلی کی بات ہے جو اپنے اعزاز کو چھوڑتا ہے۔ ہم نبی کو بشر بھی مانتے ہیں اور نور بھی مانتے ہیں اور اہلِ بدعت نبی کو بشر نہیں مانتے بلکہ نور مانتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب عرش پر گئے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے جانے والا کون ہے؟ حضرت جبرئیل علیہ السلام جو نوریوں کا سردار ہے، نوریوں کا سردار خادم ہے اور بشر کا سردار کا مخدوم ہے اور مخدوم خادم سے اعلیٰ ہوتا ہے۔

شیطان کا اظہارِ براءت کرنا:

﴿وَ قَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَ وَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَ مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَ لُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ﴾

جب ہر بات کا فیصلہ ہو جائے گا یعنی قیامت والے دن جب جنتی جنت میں چلے جائیں گے اور جہنمی جہنم میں چلے جائیں گے تو اس وقت شیطان ان لوگوں سے کہے گا جو شیطان کی بات مانتے تھے، شیطان کہے گا کہ اللہ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا تو اللہ نے اپنے اس وعدے کو پورا کر دیا۔ میرا تمہارے اوپر کوئی جبر نہیں تھا، صرف اتنی بات تھی کہ میں نے تمہیں دعوت دی تھی اور تم نے میری دعوت کو قبول کر لیا تھا، اس لیے تم مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو!

21۔ آل عمران 164:3

کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کی مثالیں:

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ اِۨجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾﴾

یہاں اللہ تعالیٰ نے مثالیں دے کر بات سمجھائی ہے۔ ایک مثال کلمہ طیبہ کی ہے اور ایک مثال کلمہ خبیثہ کی ہے۔ کلمہ طیبہ سے مراد کلمہ ایمان اور توحید ہے۔ کلمہ خبیثہ سے مراد کفر اور شرک کا کلمہ ہے۔ فرمایا: کلمہ طیبہ اس پاک درخت کی طرح ہے جس کی جڑیں مضبوط ہوں اور اس کی شاخیں آسمان کی طرف بلند ہوں اور کلمہ خبیثہ اس درخت کی طرح ہے جو زمین کے اوپر سے ہی اکھاڑ لیا جاتا ہے، اس درخت کو زمین میں کوئی استحکام اور جماؤ نہیں ہوتا یعنی اسے اکھاڑیں تو فوراً اکھڑ آتا ہے۔

وہ درخت جس کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں، مفسرین فرماتے ہیں کہ اس سے مراد کھجور کا درخت ہے اور وہ درخت جس کی جڑیں مضبوط نہیں ہوتیں اس سے مراد حنظل ہے جو ہلکے سے جھٹکے سے اکھڑ آتا ہے۔ اسی طرح جس نے کلمہ کفر کہا تو وہ ہلکے سے جھٹکے سے ختم ہو جائے گا جس نے کلمہ ایمان کہا تو اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں بھی ثابت قدم رکھیں گے اور آخرت میں بھی ثابت قدم رکھیں گے اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے: ﴿يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ﴾[22] کہ کلمہ تم پڑھو، میں تمہیں دنیا میں بھی ثابت قدم رکھوں گا اور موت

22۔ ابراہیم 27:14

کے بعد بھی ثابت قدم رکھوں گا۔

عذاب قبر کا ثبوت:

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ دس آیات قرآنی اور ستر کے قریب احادیث سے ثابت ہے کہ جس قبر میں میت کو دفن کیا جاتا ہے اس ہی قبر میں اگر میت نیک ہو تو اس کو ثواب ملتا ہے اور اگر میت گناہ گار ہو تو اس کو عذاب ہوتا ہے اس میت کی روح کو اس کی طرف لوٹا کر۔

اس پر محدثین نے کئی احادیث لکھی ہیں، میں آپ کے سامنے ایک حدیث بیان کرتا ہوں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب بندے کو قبر میں اتارا جاتا ہے، ملائکہ آتے ہیں، اسے بٹھاتے ہیں، پھر تین سوال کرتے ہیں: "مَنْ رَبُّكَ؟ وَمَا دِينُكَ؟ وَمَنْ نَبِيُّكَ؟" بندہ ان تین سوالوں کا جواب دے دیتا ہے تو ایک فرشتہ آسمان سے اعلان کرتا ہے کہ اللہ فرما رہے ہیں: "أَنْ قَدْ صَدَقَ عَبْدِيْ" کہ میرے بندے نے سوالوں کا صحیح جواب دیا ہے، "فَأَفْرِشُوهُ مِنَ الْجَنَّةِ" اس کو جنت کا بچھونا دو! "وَأَلْبِسُوهُ مِنَ الْجَنَّةِ" اس کو جنت کا لباس دے دو!، "وَافْتَحُوا لَهُ بَابًا إِلَى الْجَنَّةِ" جنت کی طرف سے دروازہ کھول دو! "فَيَأْتِيهِ مِنْ رَوْحِهَا وَطِيبِهَا" جنت کی ہوائیں اور جنت کی خوشبو اس قبر میں پہنچ جاتی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "فَذٰلِكَ قَوْلُ اللهِ تَعَالٰى ﴿يُثَبِّتُ اللهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ﴾ کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان "يُثَبِّتُ اللهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ" کا یہی مطلب ہے۔[23]

23۔ سنن ابی داؤد، رقم: 4753

اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ ہمارے جو عزیز، رشتہ دار اس دنیا سے جا چکے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی قبروں میں وسعتیں عطا فرمائے، اللہ ان کی قبر کی تنگیاں ختم فرمائے۔ (آمین)

تشہد میں ﴿رَبِّ اجۡعَلۡنِیۡ﴾ پڑھنے پر اعتراض کا جواب:

﴿رَبِّ اجۡعَلۡنِیۡ مُقِیۡمَ الصَّلٰوۃِ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ٭ۖ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلۡ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾ رَبَّنَا اغۡفِرۡ لِیۡ وَ لِوَالِدَیَّ وَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ یَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡحِسَابُ ﴿۴۱﴾﴾

یہاں اس سورت کے آخر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کئی دعائیں ذکر کی گئی ہیں۔ میں صرف ایک دعا پڑھتا ہوں جو میں نے مسئلہ سمجھانا ہے۔ جب ہم تشہد میں بیٹھتے ہیں تو یہ دعا پڑھتے ہیں: ﴿رَبِّ اجۡعَلۡنِیۡ مُقِیۡمَ الصَّلٰوۃِ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ٭ۖ رَبَّنَا وَ تَقَبَّلۡ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾ رَبَّنَا اغۡفِرۡ لِیۡ وَ لِوَالِدَیَّ وَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ یَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡحِسَابُ ﴿۴۱﴾﴾

ہمارا مسلک یہ ہے کہ امام کے پیچھے ہم قرأت نہیں کرتے اور امام کے پیچھے قرأت نہ کرنے پر لوگ ہم پر بہت سارے اعتراضات کرتے ہیں، ان اعتراضات میں سے ایک اعتراض یہ بھی کرتے ہیں کہ تم تو کہتے ہو کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرنی چاہیے اور خود امام کے پیچھے تشہد میں جو دعا پڑھتے ہو ﴿رَبِّ اجۡعَلۡنِیۡ مُقِیۡمَ الصَّلٰوۃِ﴾ یہ بھی تو قرآن ہے۔ تو تم امام کے پیچھے یہ قرآن کیوں پڑھتے ہو؟

ہم ان کو جواب دیتے ہیں کہ تشہد میں یہ ضروری نہیں کہ ﴿رَبِّ اجۡعَلۡنِیۡ مُقِیۡمَ الصَّلٰوۃِ﴾ ہی پڑھیں، اس کے علاوہ بھی آپ اور دعائیں بھی پڑھ سکتے ہیں، اس میں آپ کو اختیار ہے اور ہم جو تشہد میں امام کے پیچھے ﴿رَبِّ اجۡعَلۡنِیۡ مُقِیۡمَ الصَّلٰوۃِ﴾ پڑھتے ہیں تو یہ بطور قرأت نہیں بلکہ بطورِ دعا کے پڑھتے ہیں، قرأت سمجھ

کر پڑھیں تو حکم اور ہے اور دعا سمجھ کر پڑھیں تو حکم اور ہے، اور قرآن تو نماز میں قیام کی حالت میں پڑھتے ہیں قعود کی حالت میں نہیں پڑھتے، قعود کی حالت میں دعائیں پڑھی جاتی ہیں قرآن نہیں اور جو ہم نے دعا پڑھی ہے قعود میں تو اگرچہ یہ قرآن میں ہے لیکن ہم قرآن سمجھ کر نہیں بلکہ دعا سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ میں اس کی مثال دیتا ہوں۔ قرآن میں "فرعون" کا لفظ ہے، اگر اس کو قرآن سمجھ کر پڑھو تو 50 نیکیاں ملتی ہیں اور اگر اس کو قرآن سمجھ کر نہ پڑھو تو کوئی نیکی نہیں۔

اسی طرح نماز جنازہ میں پہلی تکبیر کے بعد ثناء پڑھی جاتی ہے اور دوسری تکبیر کے بعد درود شریف پڑھا جاتا ہے اور تیسری تکبیر کے بعد دعا پڑھی جاتی ہے اور چوتھی تکبیر کے بعد سلام پھیرا جاتا ہے۔ بعض لوگ پہلی تکبیر کے بعد سورۃ فاتحہ پڑھتے ہیں، اگر ان سے پوچھا جائے کہ تم سورۃ فاتحہ کیوں پڑھتے ہو؟ تو وہ کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے پڑھی ہے اس لیے ہم پڑھتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ کو بطورِ دعا پڑھنا تو ٹھیک ہے لیکن بطور قرأت پڑھنا جائز نہیں ہے اور ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ جس کو نماز جنازہ کی دعا نہیں آتی وہ "رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ" پڑھ لے یا اور کوئی دعا پڑھ لے، اور سورۃ فاتحہ دعا ہے یا نہیں؟ (دعا ہے۔ سامعین) اگر کوئی بندہ سورۃ فاتحہ کو قرآن سمجھ کر نہیں بلکہ دعا سمجھ کر پڑھتا ہے تو اب حکم اور ہے اور اگر قران سمجھ کر پڑھے تو حکم اور ہے! دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ اس کو بطور دعا پڑھیں تو حکم اور ہے اور اگر اس کو بطور قرآن پڑھیں تو حکم اور ہے۔

جنازے پر سورۃ فاتحہ کو واجب کہنے والوں سے سوالات:

جو لوگ جنازے پر سورۃ فاتحہ پڑھنا ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں:

"لَا صَلَاةَ لِمَنۡ لَمۡ يَقۡرَأۡ بِفَاتِحَةِ الۡكِتَابِ." [24]

کہ جو فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی، اور نماز جنازہ بھی نماز ہے اس لیے یہ بھی بغیر فاتحہ کے نہیں ہوتی۔

جب وہ یہ دلیل دیتے ہیں تو آپ نے ان سے کہنا ہے کہ کہ اگر یہی بات ہے کہ نماز جنازہ بھی نماز ہے تو نماز تو رکوع کے بغیر بھی نہیں ہوتی، نماز جنازہ بھی نماز ہے تو نماز تو سجدہ کے بغیر بھی نہیں ہوتی، نماز جنازہ بھی نماز ہے تو نماز تو تشہد کے بغیر بھی نہیں ہوتی۔ تو اس میں رکوع، سجدہ بھی کرو! تشہد بھی کرو! یہ تم کیوں نہیں کرتے؟

اگر وہ کہیں کہ اِس نماز سے مراد اور نماز ہے تو آپ نے کہنا ہے کہ اُس نماز سے مراد بھی اور نماز ہے۔ اگر تم سورۃ فاتحہ کو قرأت سمجھ کر پڑھتے ہو تو اس میں رکوع اور سجدہ بھی کرلو! اگر وہ کہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے سورۃ فاتحہ کیوں پڑھی؟ تو آپ نے کہنا ہے کہ اگر سورۃ فاتحہ فرض ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں نہیں پڑھی اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے کیوں نہ پڑھی؟ اگر سورۃ فاتحہ پڑھنی فرض ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور باقی صحابہ پڑھتے۔

خیر میں بتارہا تھا کہ اگر آپ سے کوئی پوچھے کہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرنی تو پھر تشہد میں ﴿رَبِّ اجۡعَلۡنِیۡ مُقِیۡمَ الصَّلٰوةِ﴾ کیوں پڑھتے ہو؟ تو آپ نے کہنا ہے کہ ہم قرأت سمجھ کر نہیں پڑھتے بلکہ دعا سمجھ کر پڑھتے ہیں۔

اللہ ہم سب کو بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعۡوَانَا أَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ.

24۔ صحیح البخاری، رقم:756

سورۃ الحجر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿الٓرٰ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ وَ قُرۡاٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۱﴾﴾

تمہیدی باتیں:

سورۃ الحجر مکی سورت ہے۔ اس میں چھ رکوع اور ننانوے آیات ہیں۔ اس سورت کو سورۃ الحجر اس لیے کہتے ہیں کہ اس سورت میں اللہ رب العزت نے اصحاب الحجر کا ذکر کیا ہے۔ ”حجر“ ایک وادی کا نام ہے جو حجاز اور شام کے درمیان واقع ہے۔ اس میں قوم ثمود آباد تھی۔ قوم ثمود کی طرف اللہ رب العزت نے حضرت صالح علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا تھا۔ ان کا تذکرہ آگے آئے گا۔ چونکہ اس سورت میں خاص اس جگہ کا تذکرہ کیا گیا ہے اس لیے اسی مناسبت سے اس سورت کا نام سورۃ الحجر رکھا گیا ہے۔

قرآن؛ کامل وواضح کتاب:

﴿الٓرٰ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ وَ قُرۡاٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۱﴾﴾

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں قرآن مجید کے لیے دو لفظ ارشاد فرمائے ہیں:

1: کتاب 2: قرآن مبین

”الکتاب“ سے مراد یہ ہے کہ قرآن ایسی کتاب ہے کہ جو کامل اور مکمل ہے

اور ساتھ ہی فرمایا ”قرآن مبین“ کہ یہ مکمل بھی ہے اور واضح بھی ہے۔ اس کتاب کے بعد مزید کسی آسمانی کتاب کی ضرورت بھی نہیں اور وضاحت اتنی مضبوط ہے کہ مزید وضاحت کی ضرورت بھی نہیں۔

قرآن کریم کا اعجاز یہ ہے کہ دنیا کے نصابوں سے بالکل مختلف ہے۔ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ جو وقت آپ نے اس کو دینا ہے اسی وقت میں قرآن یاد بھی ہو جاتا ہے اور تھوڑے سے وقت میں قرآن سمجھ میں بھی آ جاتا ہے۔ اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ قرآن کامل اور مکمل کتاب بھی ہے اور واضح بھی، اس کے بعد مزید کسی آسمانی کتاب کی ضرورت نہیں رہتی۔

کفار کی حسرت کہ کاش ہم مسلمان ہوتے!

﴿رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝٢﴾

دنیا میں بسا اوقات جہالتِ علمی کی وجہ سے مسلمان کافروں کو دیکھ کر رشک کرتا ہے کہ اے کاش! ہم بھی ان جیسے ہوتے۔ لیکن یہ دنیا بہت عارضی ہے، موت اور حشر کے بعد جب مسلمان کو جنت میں مقامات ملیں گے اور کافر کو جہنم میں عذاب ملے گا اور ہر آئے دن اس کے کسی خاص کفر کی وجہ سے عذاب میں ترقی ہو گی تو پھر ہر موقع پر کافر یہ تمنا کرے گا ﴿لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ﴾ کہ اے کاش! ہم بھی مسلمان ہوتے۔

مسلمان؛ کافر سے بہتر ہے:

عجیب بات ہے کہ معاملہ تو انجام پر ہے، معاملہ تو دار الجزاء پر ہے، معاملہ تو نتائج پر ہے، آج تک کسی آیت میں، کسی حدیث مبارک میں ہم نے نہیں پڑھا اور نہ کسی سے آپ نے سنا ہو گا کہ موت کے بعد کسی انسان کی تمنا ہو کہ کاش کہ میں کافر ہوتا لیکن ہر کافر کی تمنا ہو گی کہ کاش میں مسلمان ہوتا! تو آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ

مسلمان جتنا بھی نالائق ہو بہر حال مسلمان ہے اور کافر جتنا بھی اچھا ہو بہر حال وہ کافر ہے۔ مسلمان گندے سے گندا ہو لیکن اچھے سے اچھے کافر سے پھر بھی اچھا ہے۔ اس لیے کافر جتنا بھی اچھا ہو وہ کافر ہی ہے اور مسلمان بظاہر جتنا بھی گندا ہو بہر حال وہ مسلمان ہی ہے۔ اللہ ہمیں اس نعمت کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ہم چونکہ مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہوئے ہیں، اسلام کی ہمیں محنت کرنی نہیں پڑی، بغیر محنت کے ہمیں کلمہ اور ایمان ملا ہے اس لیے عموماً آج ہمیں اس کلمہ کی قدر نہیں ہے، اس کلمہ کے الفاظ کی قدر اس وقت ہو گی کہ جب قبر میں منکر نکیر پوچھیں گے: "مَنْ رَبُّكَ؟ مَنْ نَبِيُّكَ؟ مَادِيْنُكَ؟" کہ بتا تیرا رب کون ہے؟ تیرا نبی کون ہے اور تیرا دین کیا ہے؟ اس وقت احساس ہو گا کہ اس کلمہ کی اہمیت کیا ہے! دنیا بہت تھوڑی ہے اور آخرت بہت لمبی ہے۔

ایمان کی قدر کیجیے!

میں صرف گزارش یہ کر رہا ہوں کہ دنیا میں کوئی ایسا مسلمان نہیں اور نہ آپ ثابت کر سکتے ہیں، نہ آپ نے کہیں سنا ہے کہ جس کی یہ تمنا ہو کہ کاش میں کافر ہوتا اور کوئی ایسا کافر نہیں کہ جس کی یہ تمنا نہ ہو کہ اے کاش میں مسلمان ہوتا! تو بالآخر نتیجہ اللہ پاک نے اسلام کا رکھا ہے۔ اس لیے مسلمان ایمان پر اللہ کا جس قدر شکر ادا کریں وہ کم ہے۔ اللہ ہمیں اس کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

یا بعض حضرات نے یوں لکھا ہے کہ جب جہنم میں کافر بھی ہو گا اور اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے مسلمان بھی اگر جہنم میں چلا گیا تو اس مسلمان کو کافر جب یہ طعنہ دے گا کہ تم کلمہ پڑھ کر جہنم میں اور ہم بغیر کلمہ پڑھے جہنم میں، تو بتاؤ! تم میں اور ہم میں فرق کیا ہوا؟ جب یہ طعنہ دے گا تو اللہ کی رحمت جوش میں آئے گی، اللہ تعالیٰ حکم دیں گے کہ ہر وہ شخص جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان موجود ہے اس کو جہنم سے نکالو

اور جنت میں بھیج دو۔

اب کافروں کو حسرت ہو گی ﴿لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ﴾ اے کاش! کہ ہم مسلمان ہوتے۔ تو یہ نام کے مسلمان کو بھی معمولی مسلمان نہ سمجھیں۔ ہمارے اکابر کا عام اور نام نہاد مسلمانوں کے بارے میں عجیب نظریہ ہے۔

بے نمازی مسلمانوں کے متعلق حضرت تھانوی کا نظریہ:

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ایک جگہ پر بہت عجیب بات ارشاد فرماتے ہیں کہ جو مسلمان نماز نہیں پڑھتا یہ اچھا کام نہیں کرتا، اور کہتے ہیں کہ اگر تم کسی بے نمازی مسلمان سے بات کرو گے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس کا نماز نہ پڑھنا یہ اللہ پر ناز کی وجہ سے ہے۔ جب اس سے پوچھو کہ نماز کیوں نہیں پڑھتا؟ اگر اس کا تھوڑا سا بھی اللہ سے تعلق ہو تو وہ کہتا ہے کہ جنت تیری نہیں ہے، جنت اللہ کی ہے، اللہ نے ہمیں بخش ہی دینا ہے اور ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہیں، ہم نے جنت میں چلے ہی جانا ہے۔ اگر یہ شخص نماز نہیں بھی پڑھتا تو بھی اس کو اللہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ناز ہے۔

اور یہ ناز ایسی چیز ہوتی ہے کہ اللہ اس کی بڑی قدر کرتے ہیں لیکن ناز دل کے ساتھ ہو، یہ بھی دیکھیے کہ میری زبان اور دل ایک ساتھ ہیں یا میری زبان اور دل ایک ساتھ نہیں۔ اللہ رب العزت ہمیں اس کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حفاظتِ قرآن:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹﴾

اللہ رب العزت نے فرمایا کہ قرآن مجید ہم نے ہی نازل کیا ہے اور اس قرآن کریم کی حفاظت بھی ہم ہی کریں گے۔ اس لیے اگر کوئی مسلمان قرآن شریف

کی حفاظت کے لیے محنت یا کوشش کرتا ہے تو یہ سمجھو کہ اللہ نے جو وعدہ فرمایا ہے اس وعدے میں اسباب کے درجے میں اللہ نے کسی مسلمان کو استعمال کرنا ہے۔ خوش قسمت وہ شخص ہے کہ جس کا قلب قرآن کریم کے محفوظ کرنے کے لیے استعمال ہو، جس کا سینہ اس کی حفاظت کے لیے استعمال ہو، یہ اس مسلمان کی سعادت اور خوش بختی ہے۔

جہاں تک تورات اور انجیل کا معاملہ ہے تو اللہ رب العزت نے ان کی حفاظت کا ذمہ خود نہیں لیا بلکہ علمائے تورات اور انجیل کے ذمے تھا کہ حفاظت تم نے کرنی ہے اور قرآن کے بارے میں اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ اس کی حفاظت تم نے کرنی ہے بلکہ فرمایا کہ نازل بھی ہم نے کیا ہے اور حفاظت بھی ہم نے کرنی ہے۔ قرآن کریم قیامت تک کے لیے محفوظ ہو گا۔

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کے تحت تفسیر معارف القرآن میں ایک بڑی عجیب بات لکھی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ یہ جو قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے کہ قرآن نازل بھی ہم نے کیا ہے اور قرآن کی حفاظت بھی ہم کریں گے، اس وعدے میں صرف قرآن شامل نہیں ہے بلکہ اس میں احادیث بھی شامل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہیں قرآن کے الفاظ اور ایک ہے قرآن کا معنی، قرآن کے الفاظ نے بھی قیامت تک رہنا ہے اور قرآن کے معنی نے بھی قیامت تک رہنا ہے۔ قرآن کے الفاظ تو ہمیں نظر آتے ہیں اور اس کا معنی وہ ہے جسے احادیث کہتے ہیں۔ اس لیے کہ قرآن کریم کے نازل کرنے سے مقصد صرف قرآن مجید کے الفاظ کی تلاوت نہیں بلکہ قرآن مجید پر عمل بھی کرنا ہے، عمل تب کریں گے جب قرآن کا معنی آئے گا۔ اس لیے قرآن کے الفاظ نے بھی رہنا ہے اور معانی نے بھی رہنا ہے۔ قرآن بھی قیامت تک محفوظ رہے گا اور احادیث بھی، قرآن

کو محفوظ کرنے والے بھی سینے ہوں گے اور احادیث کو محفوظ کرنے والے بھی قیامت تک سینے ہی رہیں گے۔

نعمتِ باری تعالیٰ کا بیان:

﴿وَ الْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْزُوْنٍ ﴿۱۹﴾ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ وَ مَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِیْنَ ﴿۲۰﴾ وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىِٕنُهٗ ؗ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾﴾

اللہ رب العزت نے فرمایا: زمین کو ہم نے پھیلا دیا اور اس میں پہاڑ بنا کر رکھ دیے اور زمین میں ہر قسم کی چیزیں توازن کے ساتھ پیدا کر دی ہیں۔ زمین میں ہم نے تمہارے لیے رزق کا سامان پیدا کر دیا ہے اور ان مخلوقات کا رزق بھی پیدا کر دیا ہے جنہیں تم روزی نہیں دیتے۔ ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے ہیں اور ہم انہیں مناسب مقدار میں اتارتے رہتے ہیں۔

توزان کے ساتھ پیدا کرنے کا معنی یہ ہے کہ جس قدر چیزیں زمین میں موجود ہیں ہم ایک دم ساری چیزیں نہیں اگا دیتے بلکہ جتنی ضرورت ہوتی ہے اتنی اگا دیتے ہیں۔ مثلاً زمین کی تہ میں جتنی گندم موجود ہے ساری گندم نہیں نکال لیتے بلکہ انسانوں کی ضرورت کے مطابق نکالتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اگر زمین کی تہہ میں موجود سارا اناج ایک بار نکالیں اور انسان اسے سنبھالنا چاہے تب بھی نہیں سنبھال سکے گا، اس لیے اللہ کرم یہ کرتے ہیں کہ ﴿وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ جتنی ضرورت ہوتی ہے اتنی نکالتے رہتے ہیں۔

اور آسمان کے بارے میں یہ بات فرمائی کہ: ﴿وَ اَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَیْنٰكُمُوْهُ ۚ وَ مَاۤ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِیْنَ ﴿۲۲﴾﴾ ہم ہوائیں

بھی چلاتے ہیں جو بادلوں کو پانی سے بھر دیتی ہیں اور آسمان سے بارشیں بھی ہم برساتے ہیں، پھر اس پانی سے تمہیں سیر اب بھی ہم کرتے ہیں اور جس قدر ہمارے خزانہ میں پانی ہے ہم آسمان سے سارا پانی بیک وقت گرا دیں تو تم اس سارے پانی کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔

پھر اللہ رب العزت نے نظام ہی ایسا بنایا ہے کہ سمندر موجود ہیں، سمندر میں پانی ہے، وہاں سے آبی بخارات اوپر اٹھتے ہیں، پھر ہوائیں چلتی ہیں، بادل کی شکل بنتی ہے اور جہاں جتنی ضرورت ہوتی ہے تو اللہ وہاں آسمان سے بارش برسا دیتے ہیں، اکٹھی برف آتی ہے تو بڑے بڑے گلیشیرز کی صورت میں جم جاتی ہے اور جتنی ضرورت ہوتی ہے پگھلتی رہتی ہے اور زمینوں کو سیر اب کرتی رہتی ہے۔

اب دیکھیں اللہ رب العزت نے ایسا نظام بنایا ہے کہ ساری دنیا والے مل کر بھی ایسا نظام نہیں بنا سکتے۔ یہ اللہ رب العزت کا نظام ہے۔

تخلیقِ آدم اور سجدہ ملائکہ:

﴿وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ﴿۲۹﴾﴾

ان آیات میں اللہ رب العزت نے حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا واقعہ بیان کیا ہے، پھر حضرت آدم علیہ السلام کے سجدے کا، پھر ابلیس کے انکار کرنے کا، پھر ابلیس کے مہلت مانگنے کا اور اللہ تعالیٰ کے مہلت دینے کا کسی قدر اللہ نے ذکر فرمایا ہے۔ شروع میں آپ نے پڑھا تھا کہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ﴾ [25]

25۔ البقرۃ 30:2

اے فرشتو! میں زمین میں اپنا خلیفہ پیدا کر رہا ہوں۔

اور یہاں فرمایا:

﴿وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾﴾

کہ میں مٹی کا بشر پیدا کر رہا ہوں۔

وہاں فرمایا تھا کہ خلیفہ پیدا کر رہا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو خلیفہ ہے وہی بشر ہے اور جو بشر ہے وہی اللہ کا خلیفہ ہے۔ اللہ نے اپنی خلافت کی نعمت بشر کو دی ہے، اپنی خلافت نور کو نہیں دی ہے، اس لیے اس دنیا میں نور ہونا کمال نہیں ہے بلکہ بشر ہونا کمال ہے۔

بشریت کمال کا نام ہے:

اب بتاؤ! یہ بات سمجھ آئے تو انسان ذہن بنالیتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں کیونکہ اللہ نے فرشتوں کو خلیفہ نہیں کہا بلکہ بشر کے بارے میں فرمایا کہ میں نے اس کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ تو ہمارا اعزاز اس میں ہے کہ ہم انہیں بشر مانیں لیکن صفات کے اعتبار سے نبی کو نور بھی مانیں۔ ہم پیغمبر کو ذات کے اعتبار سے بشر مانتے ہیں اور صفات کے اعتبار سے نور بھی مانتے ہیں۔

مولانا فضل الرحمٰن کا جواب:

مجھے یاد ہے کہ ہم ایک مرتبہ اسلام آباد میں مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ میں بڑی عزت کے ساتھ مولانا صاحب کا نام لیتا ہوں، آپ میں سے بہت سے حضرات مولانا صاحب کے خلاف بھی ہوں گے، میں آپ کو اختلاف کرنے سے منع نہیں کرتا لیکن عموماً اختلافات ان لوگوں کو ہوتے ہیں جنہوں نے مولانا

صاحب کو قریب سے نہیں دیکھا بلکہ صرف مولانا صاحب کے بارے میں سنا ہے، جو قریب سے دیکھتا ہے وہ سارے اختلافات بھول جاتا ہے۔

ایک بندے کی سیاست میں پوری زندگی گزر جائے، والد اس کا سیاست میں رہا ہو، نہ اس میں اخلاقیات کا مسئلہ ہے نہ اس میں مالیات کا مسئلہ ہے، تمہیں دنیا میں تلاش کرنے سے ایسا سیاست دان نہیں ملے گا۔ ایک ہوتا ہے کہ اخبار میں کوئی کالم آئے، کالم تو مخالفت میں لکھے جاتے ہیں لیکن کبھی کوئی شخص ان کے بارے میں اخلاقیات اور مالیات کے بارے میں ثبوت نہیں دے سکتا، اس ڈاڑھی کے ساتھ اسمبلی میں رہنا، اس پگڑی کے ساتھ اسمبلی میں رہنا، اس مسنون لباس میں رہ کر فرعونِ وقت کو للکارنا یہ ہر بندے کے بس کی بات نہیں، بڑوں بڑوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ یہ مولانا صاحب ہیں کہ اس ماحول میں رہ کر بھی دین کی بات کرتے ہیں، مولانا جب کام آتے ہیں تب ہمیں احساس ہوتا ہے۔

اب دیکھیں! حکومت نے کتنی بڑی تعداد میں فارم تقسیم کیے مدارس کے لیے، مدارس کا تھوڑا سا مسئلہ بنا تو اب بھی مولانا صاحب کا بیان آ گیا کہ ہم ڈٹ کر مقابلہ کریں گے اور مدارس کا تحفظ کریں گے، اب سب کو احساس ہو گیا کہ مولانا کتنے قیمتی آدمی ہیں۔ اللہ ہمیں ان کی قدر کی توفیق عطا فرمائے۔

خیر ہم وہاں بیٹھے تھے تو مولانا فضل الرحمٰن صاحب فرمانے لگے کہ میں قاسم العلوم ملتان میں کتابیں پڑھاتا تھا، مدرس تھا تو اس وقت میرے پاس چند ایک نوجوان آئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے آپ سے ایک مسئلہ پوچھنا ہے۔ میں نے کہا: پوچھیں۔ تو انہوں نے کہا کہ یہ بتائیں کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نور ہیں یا بشر ہیں؟ مولانا صاحب نے کہا کہ میں نے انہیں کہا کہ آپ کا سوال ٹھیک نہیں ہے، پہلے سوال ٹھیک ہو تو پھر جواب ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ سوال کیوں ٹھیک نہیں؟ مولانا صاحب نے

فرمایا کہ آپ سوال کرتے کہ نور ہیں یا ظلمت؟ پھر میں جواب دیتا کہ نور ہیں کیونکہ نور اور ظلمت میں ٹکراؤ ہے، نور اور بشر میں تو کوئی ٹکراؤ نہیں ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ذات کے اعتبار سے بشر ہیں اور اوصاف کے اعتبار سے نور بھی ہیں، اس میں تو ٹکراؤ ہے ہی نہیں تو آپ نے ٹکراؤ کیسے پیدا کیا ہے!

تخلیقِ آدم کے مراحل:

میں صرف گزارش یہ کر رہا تھا کہ اللہ نے اس آیت میں فرمایا:

﴿اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾

پہلے اللہ رب العزت نے مٹی پیدا فرمائی، پھر اس مٹی کو اپنی قدرت سے گوندھنے کا انتظام فرمایا، پھر اس مٹی کا خمیر پیدا فرمایا اور ایک عرصہ تک مٹی رہ جائے تو جیسے بو آنا شروع ہو جائے تو وہ ایسے سڑی ہوئی مٹی بن گئی، پھر اس کو خشک کیا اور خشک کرنے کے بعد پھر حضرت آدم علیہ السلام کو وجود بخشا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نرم مٹی سے بنانا آسان ہے، نرم مٹی کو خشک کیا پھر بنایا تو جو مشکل کام تھا خدا کی قدرت نے وہ ظاہر فرمایا۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کا پہلے وجود بنالیا۔

﴿وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾

پھر اللہ نے اس میں روح کو ڈالا۔ اب یہاں جو لفظ ہے ذرا وہ سمجھیں۔ اللہ رب العزت فرماتے ہیں: ﴿وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾ کہ میں نے آدم میں اپنی روح کو ڈالا۔ اب اس کا معنی یہ تو نہیں ہے کہ اللہ کی روح ہے اور وہ ڈالی ہے۔ تو یہ روح کی نسبت اللہ نے اپنی طرف کیوں کی ہے؟ اصل میں ہمارے ہاں ایک ہوتا ہے مضاف اور ایک ہوتا ہے مضاف الیہ۔ جیسے گرائمر کی زبان میں کہتے ہیں کہ یہ میری مسجد

ہے... یہ میرا کھانا ہے... یہ میری گاڑی ہے... اسے اضافت کہتے ہیں۔ اللہ رب العزت بعض چیزوں کو اعزاز دینے کے لیے نسبت اپنی طرف کرتے ہیں۔ اسے اضافتِ تشریفیہ کہتے ہیں جیسے سارے انسان اللہ کے بندے ہیں لیکن جن کو اللہ اعزاز دیتے ہیں تو انہیں خطاب کرتے ہیں:

﴿يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿٢٩﴾﴾[26]

اللہ تعالی نیک لوگوں سے فرماتے ہیں کہ یہ میرے بندے ہیں حالانکہ بندے تو سارے اللہ کے ہیں لیکن جن کو اللہ اعزاز دینا چاہتے ہیں ان کی نسبت اللہ اپنی ذات کی طرف فرماتے ہیں۔ یہاں بھی حضرت آدم علیہ السلام کی روح کو خدا نے اعزاز بخشا ہے اس لیے فرمایا کہ میں نے اپنی روح کو ڈالا۔ یعنی ہر کسی کی روح تو میں نے پیدا کی ہے لیکن اعزاز دینے کے لیے اللہ نے نسبت اپنی طرف کی ہے۔

﴿فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿٣٠﴾﴾

تمام فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا۔

یہاں پورا واقعہ تو نہیں ہے۔ سورۃ البقرۃ میں ہے کہ جب اللہ رب العزت نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرما دیا تو فرشتوں سے فرمایا: ﴿اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾[27] کہ حضرت آدم علیہ السلام کو سب مل کر سجدہ کرو۔ یہاں اس سورت میں ہے: ﴿فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿٣٠﴾﴾ تمام فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا، ﴿اِلَّاۤ

26۔ الفجر 27:89 تا 30

27۔ البقرۃ 34:2

اِبۡلِیۡسَ ؕ﴾ لیکن ابلیس نے سجدہ نہیں کیا۔

ابلیس کو سجدے کا حکم نہیں تو اس پر عتاب کیوں؟

اب عام بندے کے ذہن میں سوال آتا ہے کہ حکم تو دیا تھا فرشتوں کو، اگر ابلیس نے سجدہ نہیں کیا تو اس پر الزام کیوں ہے؟

اس کا جواب سمجھیں کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم فرشتوں کو دیا گیا، الگ سے ابلیس کو حکم کیوں نہیں دیا اس لیے کہ ابلیس انہی ملائکہ میں رہتا تھا اس لیے مستقل فرد کو حکم دینے کی ضرورت نہیں تھی، جو ملائکہ میں رہتا تھا اس کو بھی یہی حکم تھا جو ملائکہ کو تھا۔ اس لیے فرمایا کہ تم سارے سجدہ کرو اور ابلیس سمجھتا تھا کہ مجھے سجدہ کا حکم ہے۔ اسی وجہ سے ابلیس نے یہ نہیں کہا کہ اللہ مجھے تو حکم ہی نہیں ہے تو میں سجدہ کیوں کروں؟ اس کو پتا تھا کہ مجھے حکم ہے اس لیے ابلیس نے جب سجدے سے انکار کیا۔ تو اللہ نے فرمایا کہ تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ اور یہاں عجیب بات یہ ہے:

﴿اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ اَبٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنَ مَعَ السّٰجِدِیۡنَ ﴿۳۱﴾﴾

اصل میں تو مزہ انہی کو آتا ہے جو کچھ عربی بلاغت سمجھتے ہوں، ان کو قرآن کے الفاظ کا مزہ آتا ہے۔ یہاں فرمایا: ﴿اَبٰۤی اَنۡ یَّکُوۡنَ مَعَ السّٰجِدِیۡنَ ﴿۳۱﴾﴾ یہ نہیں فرمایا "اَبٰی اَنۡ یَّسۡجُدَ" کہ ابلیس نے انکار کیا کہ میں سجدہ نہیں کرتا بلکہ فرمایا کہ ابلیس نے انکار کیا کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جائے، انکار کیا سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہونے سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل حکم ملائکہ کو تھا لیکن ابلیس چونکہ ان میں سے تھا اس لیے ضمنی حکم اس کو بھی تھا۔

میں بسا اوقات یہ نکات پیش کر دیتا ہوں۔ ہر آدمی کو سمجھ نہ بھی آئے تو جن کو بلاغت سے تعلق ہے ان کو ضرور سمجھ آئے گا کہ میں نے جو نکتہ بیان کیا اس نکتے کی

حیثیت کیا ہے؟

ابلیس کی دلیل کا خدائی جواب:

خیر اس نے انکار کر دیا۔ اللہ نے پوچھا:

﴿يٰٓاِبۡلِيۡسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوۡنَ مَعَ السّٰجِدِيۡنَ ۝٣٢﴾

اے ابلیس! تو سجدہ کرنے والوں میں سے کیوں نہیں ہوا؟

ابلیس نے جواب دیا:

﴿لَمۡ اَكُنۡ لِّاَسۡجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقۡتَهٗ مِنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ۝٣٣﴾

میں سجدہ اس مٹی کے وجود کو نہیں کر سکتا۔

دوسرے مقام پر ہے کہ ابلیس نے کہا تھا:

﴿خَلَقۡتَنِىۡ مِنۡ نَّارٍ وَّخَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِيۡنٍ ۝١٢﴾[28]

کہ مجھے آپ نے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو آپ نے مٹی سے پیدا کیا۔ تو مٹی کو آگ کیسے سجدہ کرے؟ آگ تو شعلے والی ہے اور اوپر جاتی ہے، مٹی کو اوپر پھینکو تو نیچے آتی ہے، مٹی میں عاجزی ہے اور میرے اندر بلندی ہے۔ تو بلند؛ پست کو بھلا سجدہ کر سکتا ہے؟

یہ ابلیس نے عقلی دلیل پیش کی ہے۔ اس دلیل کو توڑا جا سکتا تھا لیکن اللہ نے توڑا نہیں ہے، اللہ نے فرمایا کہ تو یہاں سے نکل جا! یہ میرا حکم تھا اور تو اس میں اعتراض کرتا ہے۔ خدا کے حکم کے سامنے عقل کی بات نہیں کرتے بلکہ خدا کے حکم کو مالک کا حکم سمجھ کر قبول کر لینا چاہیے، اس لیے تمہیں اعتراض نہیں کرنا چاہیے تھا۔

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے سترہ دلائل اس بات پر پیش فرمائے ہیں کہ

28۔ الاعراف 12:7

مٹی؛ آگ سے افضل ہے۔[29] تو کیا یہ دلائل خدا کے علم میں نہیں تھے؟ جس خدا نے ابن القیم کو دلائل دیے ہیں تو خدا کے علم میں وہ دلائل ہیں لیکن اللہ نے دلیل نہیں دی۔ معلوم ہوا کہ ہر موقع پر دلیل نہیں دیتے بلکہ بعض اوقات بغیر دلیل دیے اسے نکال دیتے ہیں۔ ہر موقع دلیل کا نہیں ہوتا۔

سب سے پہلا اجماع اور پہلا منکرِ اجماع:

اور اس سے ایک بات اور ذہن میں رکھ لیں۔ یہ ہمارا استدلال نہیں ہے ہمارے مشائخ کا ہے۔ جس کا استدلال ہو میں نام لے کر بتاتا ہوں۔ ہمارے جھنگ کے ایک بزرگ ہیں حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی صاحب دامت برکاتہم، ہمارے مسلک دیوبند کے بہت بڑے شیخ ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں کہ اس تاریخِ انسانی میں جس مسئلے پر سارے جمع ہوئے ہیں وہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا ہے اور جس نے اس اتفاق کا سب سے پہلے انکار کیا اس کا نام ابلیس ہے۔ معلوم ہوا کہ ملائکہ نے حضرت آدم علیہ السلام کے سجدے پر اتفاق کر لیا اور ابلیس نے انکار کر دیا۔ تو سب سے پہلے دنیا میں اجماع کا انکار کرنے والا ابلیس ہے۔ جو اجماع کو مانے گا وہ جنت میں ملائکہ کے مقام کو پہنچ جائے گا اور جو اجماع کا انکار کرے گا وہ ابلیس کے مقام تک پہنچ جائے گا یعنی جہنم میں۔

آپ اندازہ فرمائیں کہ اجماع کی اہمیت کتنی زیادہ ہے! یہ سب سے پہلا اجماع ہے جس کی شیطان نے مخالفت کی ہے اور اجماع کس کا ہے؟ ملائکہ اور فرشتوں کا اور جس نے انکار کیا وہ ابلیس ہے۔ تو جو ملائکہ کی صفت کو اختیار کرے گا تو وہ جنتی ہے اور جو ابلیس کی صفت اختیار کرے گا تو وہ جنت کے بجائے جہنم میں ہو گا۔

29۔ بدائع الفوائد لابن القیم: ج4 ص949 تا 953

ابلیس نے انکار کیا تو اللہ نے فرمایا: ﴿فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ۝۳۴﴾

یہاں ایک بات اچھی طرح سمجھ لیں۔ میں پہلے بھی کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہیں، یہ ہمارا عقیدہ ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا روضہ اطہر، قبر مبارک یہ جنت کا ٹکڑا ہے، یہ بھی ہمارا نظریہ ہے۔

”روضہ جنت ہے“ پر اشکال کا جواب:

ایک صاحب کہنے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا روضہ یہ جنت نہیں ہے اور کہنے والے بھی آپ کے شہر سرگودھا کے ہیں اور جنت نہ ہونے کی دلیل انہوں نے یہ دی کہ صحیح بخاری میں حدیث موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مسجد نبوی والی جگہ کو کھدوایا مسجد نبوی کو تعمیر کرنے کے لیے تو وہاں چند ایک ہڈیاں نکلیں جو مشرکین کی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو باہر پھینکوا دیا اور وہاں مسجد نبوی تعمیر کی۔ اب وہ دلیل دینے لگے کہ اگر یہ جنت ہے تو جنت میں تو مشرک کی ہڈی نہیں ہو سکتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنت نہیں ہے۔

ہم نے کہا کہ اس کا آسان سا جواب تو قران کریم میں ہے کہ جب اللہ پاک نے حکم دیا تھا فرشتوں کو کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو تو ابلیس نے سجدہ نہیں کیا۔ ابلیس کہاں رہتا تھا؟ جنت میں، آپ تو کہتے ہیں کہ مشرک کی ہڈی نہیں ہو سکتی اور یہاں تو پورا ابلیس جنت میں ہے۔

اب وہ کہنے لگے کہ آگے بھی پڑھیں، اللہ نے آگے فرمایا ہے: ﴿فَاخْرُجْ﴾ کہ اللہ نے اسے وہاں سے نکال دیا۔ تو میں نے کہا کہ بخاری میں بھی آگے پڑھیں، اس میں ہے کہ مشرک کی ہڈی تھی لیکن اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نکال دی۔ اِس جنت سے مشرکین کی ہڈی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکالی ہے اور اُس جنت سے

ابلیس کو خدا نے نکالا ہے، یہ بھی جنت ہے اور وہ بھی جنت ہے۔

اچھا عجیب بات یہ ہے کہ پھر یہی لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں قرآن بہت آتا ہے۔ اس بات پر آپ نے قرآن کو چھوڑ کر احادیث کو لے لیا ہے اور ہم نے احادیث کو بھی نہیں چھوڑا، ہم نے قرآن کو بھی نہیں چھوڑا کیونکہ ہمارے اکابر کو قرآن بھی آتا ہے اور ہمارے اکابر کو احادیث بھی آتی ہیں، قرآن بھی ہمارا ساتھ دے رہا ہے اور حدیث بھی ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔

مجھے ایک شخص کہنے لگا کہ آپ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا روضہ جنت ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ کہنے لگا: حدیث کون سی ہے؟ میں نے کہا کہ صحیح بخاری میں ہے:

مَا بَيْنَ بَيْتِي وَمِنْبَرِي رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ.[30]

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرا ممبر اور جو میرا حجرہ ہے اس کے درمیان کی جگہ جنت ہے۔

بعض دلائل ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں تھوڑی سی توجہ دینی پڑتی ہے پھر وہ سمجھ میں آجاتے ہیں۔ بسا اوقات میں ایک دلیل بار بار اس لیے دیتا ہوں کہ اگر پہلے درس میں نہ بھی سمجھ آئے تو جب کوئی شخص اس کو آپ کے خلاف استعمال کرے گا تو خدانخواستہ اس کا جواب آپ کو نہ بھی آئے لیکن یہ تو ذہن میں ہو گا کہ اس کا جواب ہے۔ اگر وہ کہے کہ کون سا جواب ہے؟ تو کہو گے کہ میرے ذہن میں نہیں آرہا لیکن میں نے اس کا جواب سنا تھا، مجھے یاد نہیں رہا، یہ تو نہیں ہو گا کہ جواب ہے ہی نہیں۔

خیر جب میں نے اسے صحیح بخاری کی روایت پیش کی تو اس نے کہا کہ جو

30۔ صحیح البخاری، رقم: 1195

درمیان والی جگہ جنت ہے تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر تو شامل نہیں ہے۔

میں نے اسے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو فرمایا ہے:

"مَا بَيْنَ بَيْتِيْ وَمِنْبَرِيْ رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ."

کہ میرے گھر اور منبر کے درمیان جو جگہ ہے وہ جنت کا ٹکڑا ہے۔

آپ مجھے بتائیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جو منبر ہے وہ کہاں پر ہے؟ کہا کہ ریاض الجنۃ میں ہے۔ میں نے کہا: وہ جنت میں ہے یا نہیں؟ کہا کہ ہے۔ میں نے کہا: پھر یہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر ہے یہ باہر کیسے ہے؟ میں نے کہا کہ دیکھیں! اگر گھر اور منبر کے درمیان والی جگہ جنت ہے اور گھر اور ممبر اس میں شامل نہیں ہے تو منبر تو آج بھی ریاض الجنۃ میں ہے۔ آپ مسجد نبوی میں جا کر دیکھ لیں۔ میں نے کہا کہ منبر کو نکال دو پھر ریاض الجنۃ سے۔ کہنے لگا کہ منبر تو نہیں نکال سکتے۔ تو میں نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمرے کو پھر کیوں نکال رہے ہو؟

اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر بھی جنت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا روضۃ بھی جنت ہے۔ اللہ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ابلیس عاشق نہیں تھا:

خیر اللہ رب العزت نے اسے فرمایا کہ یہاں سے نکل جا! تو اس نے فوراً کہا: ﴿رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿٣٦﴾﴾ کہ اللہ! مجھے قیامت تک کے لیے مہلت دے دے۔ توجہ رکھنا! جب اللہ نے حکم دیا کہ سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا لیکن ابلیس نے سجدہ نہیں کیا۔ پھر اللہ نے اس پر لعنت بھیجی ہے۔ تو اللہ رب العزت لعنت کس پر بھیجتے ہیں؟ جس سے پیار کریں یا جس پر غصہ ہوں؟ (جس پر غصہ ہوں۔ سامعین)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ حالتِ غضب میں ہیں اور فرما رہے ہیں کہ اس ابلیس پر میری لعنت ہو اور اس وقت یہ ابلیس کیا کہہ رہا ہے کہ ﴿رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ﴾ وہ

دعا مانگ رہا ہے اور اللہ حالت غضب میں ہیں۔ بتاؤ! اگر باپ غصے میں ہو اور اپنے بیٹے سے کہے کہ نکل جاؤ تو وہ کہے ابو جی! مجھے پیسے تو دو۔ بندہ کہے گا کہ عجیب بات ہے کہ باپ نے گھر سے نکالا ہے اور یہ کرایہ مانگ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ابلیس پر ناراض ہو رہے ہیں کہ نکل جا، تو ملعون ہے اور وہ کہہ رہا ہے: ﴿رَبِّ فَاَنۡظِرۡنِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ﴾ اے اللہ! مجھے قیامت تک کی مہلت دے دو۔ اللہ نے فرمایا: ﴿فَاِنَّکَ مِنَ الۡمُنۡظَرِیۡنَ ﴿۳۷﴾ اِلٰی یَوۡمِ الۡوَقۡتِ الۡمَعۡلُوۡمِ ﴿۳۸﴾﴾ کہ جاؤ! وقت مقرر تک ہم نے تمہیں مہلت دے دی ہے۔

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سے معلوم ہوا کہ شیطان عالم بھی تھا، عارف بھی تھا اور عابد بھی تھا، عالم کا پتا ایسے چلا کہ اللہ اسے فرما رہے ہیں کہ تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ تو وہ جواب میں دلیل دے رہا تھا تو دلیل دینا عالم کا کام ہے۔ حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ عالم بھی بہت بڑا تھا، اتنا بڑا عالم تھا کہ خدا کے سامنے بحث کر رہا ہے اور فرمایا: عارف بھی تھا جو اللہ کے مزاج کو سمجھتا ہو۔ معرفتِ خداوندی بھی اس کو تھی۔ عارف اس لیے تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ اللہ جتنے بھی غصے میں ہوں اللہ غصے سے مغلوب نہیں ہوتے اس حال میں بھی مانگیں تو دے دیتے ہیں۔ عابد بھی تھا کہ عبادت کرتے کرتے ملائکہ کی صف میں بیٹھا ہوا ہے، عابد اتنا ہے ملائکہ میں اس کا شمار ہے لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں ایک چیز کی کمی تھی کہ یہ عاشق نہیں تھا۔ اگر عاشق ہوتا تو اللہ کے سامنے دلائل سے بات نہ کرتا بلکہ بات مان لیتا۔ کیوں کہ جب آدمی کو کسی سے عشق ہوتا ہے تو اس کے دل کو دکھایا نہیں کرتا، دلیلوں سے بات نہیں کرتا بلکہ بات سمجھ نہ بھی آئے تب بھی مان لیتا ہے۔

تذکرہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ:

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ عابد بھی تھے، عالم بھی تھے، عارف بھی تھے اور عاشق بھی تھے۔ اس لیے انہوں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ مجھے بات سمجھ میں آرہی ہے یا سمجھ میں نہیں آرہی، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس قدر عشقِ پیغمبر میں فنا ہیں کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بیت اللہ میں ہیں، مشرکین نے انہیں اتنامارااتنامارا کہ صدیق کو پہچاننا مشکل ہو گیا تھا، اٹھا کر گھر لائے گئے۔ جب تھوڑی سی ہوش آگئی تو پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ ماں نے کہا کہ اب بھی تو حضور کی بات کرتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ماں! میں نے قسم اٹھار کھی ہے کہ جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرا نہ دیکھوں گا میں ایک گھونٹ بھی پانی نہیں پیوں گا، پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ دکھاؤ کہ حضور ٹھیک ہیں یا نہیں؟ ٹھیک ہیں تو پھر پانی پیوں گا۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو افسوس یہ تھا کہیں ایسا نہ ہو کہ میں بچ جاؤں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہوں۔ پہلے دیکھ لوں پھر پانی پی لوں گا۔ اس لیے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے تو صدیق نے دنیا میں رہ کر کیا کرنا ہے!

اب دیکھیں! صدیق اکبر عاشق پیغمبر ہیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو خبر ملی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے عرش پر گئے ہیں اور واپس آئے ہیں۔ ابو جہل نے کہا تھا کہ میں نہیں مانتا کیوں کہ وہ عقلیات کی بات کر رہا تھا۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ چونکہ عارف بھی تھے، عابد بھی تھے، حضور کے عاشق بھی تھے جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ یہ بتائیں کہ اگر کوئی بندہ یہ بات کہے کہ میں ایک رات میں عرش پر گیا اور واپس آیا ہوں تو ابو بکر آپ مان لیں گے؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ ابو جہل بہت بے ایمان ہے خیر کی اس سے توقع نہیں ہے۔ صدیق

اکبر نے پہلا سوال یہ کیا کہ ابو جہل! پہلے یہ بتا کہ اس بات کا کہنے والا کون ہے؟ اگلی بات پھر کریں گے کہ ماننی ہے یا نہیں ماننی! ابو جہل نے کہا کہ آپ کے دوست نے کہا ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پھر ہوا ہے، پھر نہ پوچھنا کہ ہوا ہے یا نہیں ہوا۔

اللہ ہمیں عالم بھی بنائے، اللہ ہمیں عارف بھی بنائے، اللہ ہمیں عابد بھی بنائے اور اللہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا عاشق بھی بنائے۔ تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ عالم بھی تھا، یہ عارف بھی تھا اور یہ عابد بھی تھا، کمی یہ تھی یہ عاشق نہیں تھا اس لیے یہ مار کھا گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عشقِ پیغمبر کو بھی پیدا کریں، جب تک یہ باتیں پیدا نہ ہوں تو شریعت پر عمل کرنا بڑا ہی مشکل ہوتا ہے اور دلائل کا جواب دینا تو بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے۔

کبھی کبھی عاشقانہ جواب بھی دیا کریں!

حضرت مولانا محمد امین صفدر اوکاڑوی رحمہ اللہ کا میں نے ایک بیان سنا۔ حضرت فرمانے لگے کہ میرا ایک مرتبہ شاہدرہ میں عیسائی پادری کے ساتھ مناظرہ ہوا۔ عیسائی پادری نے مجھ سے سوال یہ کیا کہ تم مسلمان خنزیر نہیں کھاتے، تم بکرا کھا لیتے ہو اس کی کیا وجہ ہے؟ حضرت فرمانے لگے: میں نے اسے عقلی دلیل پیش کی کہ دیکھو! خنزیر اور بکرے میں فرق یہ ہے کہ خنزیر حلال اور حرام میں امتیاز نہیں کرتا۔ اس نے کہا کہ یہ تو کوئی بنیاد نہیں ہے، اگر حلال حرام میں تمیز نہ کرنے کی بات ہے تو وہ تو بکرا بھی نہیں کرتا۔ اس نے کہا کہ ایک بکرا پیدا ہوا اس کو یہاں باندھ لو اور ایک بکری اس کے ساتھ ہی پیدا ہوئی ہو تو اس کو بھی یہیں باندھ لو تو اس بکرے کو تو نہیں پتا کہ یہ میری بہن ہے۔ تو بکرا بھی حلال حرام کا خیال نہیں کرتا اور خنزیر بھی نہیں کرتا۔ تو دونوں برابر ہوئے نا!

حضرت اوکاڑوی رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے کہ میرا خیال تھا کہ میں نے اس کو بڑی اچھی دلیل دی ہے، جب دلیل ٹوٹی تو میرے دل میں فوراً وہ بات آئی جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہر موقع پر عالمانہ بات نہ کرو اس موقع پر عاشقانہ بات کرو۔ حضرت اوکاڑوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہمیں خدا نے حکم دیا ہے کہ بکرا کھالو اور حکم دیا ہے کہ خنزیر نہ کھاؤ! ہم حکمِ الٰہی کے پابند ہیں، ہم یہ نہیں دیکھتے کہ حکم کیوں دیا ہے؟ ہاں اس پر ہم سے بات کر لو کہ یہ اللہ کا حکم ہے یا اللہ کا حکم نہیں ہے؟ ہم ثابت کریں تو ٹھیک اور اگر ثابت نہ کریں تو ہماری کمزوری ہے۔

ابلیس کی تمنا:

خیر میں یہ بات سمجھا رہا تھا کہ ابلیس نے اللہ سے دعا کی تو اللہ نے قبول فرما لی۔ جب واپس جانے لگا تو اس نے کہا:

﴿رَبِّ بِمَآ اَغۡوَيۡتَنِىۡ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ وَلَاُغۡوِيَنَّهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ۝۳۹﴾

کیونکہ اس کو خدا کے وعدے پر یقین تھا، اس کو پتا تھا کہ اب خدا نے وعدہ کر لیا ہے، میں کچھ بھی کہتا رہوں تو مجھے اللہ نے قیامت سے پہلے ہلاک نہیں کرنا ہے۔ تو اس نے کہا کہ یا اللہ! چونکہ آپ نے مجھے یہاں سے رد کر دیا اس لیے میں بھی زمین میں انسانوں کی نظروں میں گناہوں کو محبوب بنا دوں گا اور میں سب کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا اور خود اس نے کہا: ﴿اِلَّا عِبَادَكَ مِنۡهُمُ الۡمُخۡلَصِيۡنَ ۝۴۰﴾ ہاں اللہ! یہ بات ٹھیک ہے کہ میں سب کو گمراہ کر لوں گا لیکن جو تیرے مخلص بندے ہیں ان کو گمراہ کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔

اب آپ کے ذہن میں ایک سوال آئے گا اور یہ سوال آنا بھی چاہیے کہ اگر شیطان کا کسی مخلص بندے پر زور نہیں چلتا تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ کسی نیک بندے سے گناہ نہ ہو حالانکہ نیک سے نیک بندہ ہو گناہ اس سے بھی ہو جاتا ہے تو پھر اس کا کیا

مطلب ہے کہ اللہ کے نیک بندوں پر اس کا بس نہیں چلے گا؟ اس آیت سے کچھ آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَٰنٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ ﴿٤٢﴾﴾

تو جس کو چاہے گمراہ کر لیکن میرے جو بندے ہوں گے ان پر تیرا زور نہیں چل سکتا۔

اللہ رب العزت نے بھی فرما دیا اور شیطان بھی کہہ رہا ہے کہ میرا زور مخلص بندوں پر نہیں چل سکتا اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ نیک سے نیک بندہ بھی گناہ کر گزرتا ہے۔ پھر آخر ان آیات کا مطلب کیا ہو گا؟

حضرت مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا آسان سا مطلب یہ ہے ایسا زور چلنا کہ موت تک گناہ کریں اور جہنم میں چلے جائیں ایسا زور اللہ کے نیک بندوں پر نہیں چل سکتا۔ ابلیس کی تمنا یہ ہے کہ میں ایسا زور لگاؤں گا کہ اپنے ساتھ جہنم میں لے جاؤں گا، خدا کا جو نیک بندہ ہے اگر اس سے گناہ ہو بھی گیا تو بعد میں وہ توبہ کرے گا۔

ایک صحابی کا قصہ:

جیسے ایک صحابی اور ایک ولی کا واقعہ ہے۔ صحابی کا واقعہ یہ ہے کہ ان سے زنا ہو گیا۔ وہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور اعتراف کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعراض فرمایا۔ انہوں نے پھر اعتراف کیا، پھر اعتراف کیا، پھر اعتراف کیا۔ جب چار مرتبہ اعتراف کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو سنگسار کر دو! جب انہیں سنگسار کرنے لگے تو پتھر لگتے ہی وہ دوڑے۔ جب ان کی موت واقع ہو گئی تو کسی نے ان کے بارے میں سخت بات کہہ دی تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے:

"قَدْ تَابَ تَوْبَةً لَوْ تَابَهَا أُمَّةٌ مِنَ الْأُمَمِ لَقُبِلَ مِنْهُمْ "[31]

اب اس کے بارے میں کوئی جملہ نہ کہنا! اس نے اتنی مقبول توبہ کی ہے کہ اگر امتوں میں سے کوئی امت اس طرح توبہ کرتی تو یہ توبہ پوری امت کی طرف سے کفایت کر جاتی۔

اب دیکھیں! شیطان نے کوشش کی تھی کہ میں بدکاری کرا کر جہنم میں لے جاؤں گا، ان سے بدکاری بھی ہوئی ہے لیکن توبہ اتنی بڑی سطح پر چلی گئی ہے کہ بدکاری کرنے کی باوجود بھی بندہ جنت میں جارہا ہے، اس لیے فرمایا کہ ابلیس کا ایسازور نہیں چلے گا کہ بندہ جہنم میں چلا جائے۔

ایک ولی کا قصہ:

اسی طرح ایک ولی کا قصہ ہے۔ ہمارے استاذ صاحب فرماتے تھے کہ ایک ولی تھے، عالم تھے اور وہ تہجد کی بڑی پابندی فرماتے تھے۔ ایک روز معمول کے مطابق ان کا ارادہ ہوا کہ تہجد پڑھوں لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ جیسے کوئی ان کے پاؤں کو دبا کر سلا رہا ہے۔ خیر غفلت ہو گئی اور وہ تہجد نہیں پڑھ سکے۔ تہجد فرض نہیں ہے سنت ہے لیکن وہ اپنی اس تہجد کو برقرار رکھنے کے لیے جب اٹھے تو فجر کی سنتیں پڑھیں، نماز پڑھی، پھر ذکر میں مشغول رہے اور اشراق کی نماز پڑھی اور عشاء کے بعد جو رات کی تہجد تھی وہ بھی پڑھ لی۔

تہجد کی قضا تو ان کے ذمے نہیں تھی لیکن کمی کو پورا کرنے کے لیے پڑھی اور پھر رونا شروع کر دیا کہ اے اللہ! میں کتنے عرصے سے تہجد پڑھ رہا تھا، آج میری تہجد قضا ہو گئی ہے، میں تہجد نہیں پڑھ سکا، اے اللہ! تو مجھے معاف فرما دے، میرے معمول

31۔ مسند البزار: ج10 ص197 رقم الحدیث 4283

میں کمی آئی ہے۔ یہ رونا تھا کہ دوسرے دن وہ شخص آیا جس نے پاؤں دبا کر سلا دیا تھا۔ اس نے اٹھایا کہ اٹھیں اور تہجد پڑھ لیں۔ اس ولی نے اس شخص کو پکڑ لیا کہ خلوت خانے میں یہ کون ہے؟ یہاں تو کوئی بندہ آ ہی نہیں سکتا۔

اس نے کہا کہ بس آپ اٹھیں اور تہجد پڑھیں۔ مجھے نہ پوچھیں کہ میں کون ہوں؟ انہوں نے پھر اصرار سے پوچھا تو اس نے کہا کہ میں شیطان ہوں۔ انہوں نے پوچھا کہ تُو شیطان ہے اور تہجد کے لیے اٹھا رہا ہے! شیطان نے کہا کہ کل جو سلایا تھا اور آپ روئے ہیں تو وہ عمل تہجد سے بھی آگے نکل گیا ہے، اس لیے میں نے اٹھایا کہ اٹھ کر تہجد ہی پڑھ لیں۔

تو جو اللہ کے نیک بندے ہیں ان کے ساتھ شیطان چھیڑ چھاڑ تو کرتا ہے لیکن اس کے بدلے میں جو توبہ کرتے ہیں تو پھر شیطان کو بھی افسوس ہوتا ہے کہ میں یہ چھیڑ چھاڑ نہ کرتا تو بہتر تھا۔

گمراہوں ٹھکانہ جہنم ہے:

﴿وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٤٣﴾﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو تیری بات مانے گا وہ جہنم میں جائے گا۔

اس کے بعد فرمایا:

﴿لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ ط﴾

کہ جہنم کے سات دروازے ہیں۔ اللہ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔

جہنم کے سات دروازے ہیں اور جنت کے آٹھ دروازے ہیں۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ "سبعۃ ابواب" سے جہنم کے سات طبقات مراد ہیں۔ ان سات طبقات کے نام جہنم، لظیٰ، حطمہ، سعیر، سقر، جحیم اور ھاویہ ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ کھلی ایک جہنم ہے اسی کے سات دروازے مراد ہیں جس

طرح عام دروازے ہوتے ہیں۔

یہاں میں ایک بات عرض کرتا ہوں کہ جہنم کے دروازے سات ہیں اور جنت کے دروازے آٹھ ہیں۔ یہ آٹھواں دروازہ کیوں ہے؟ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں لکھا ہے۔ معارف القرآن دو الگ الگ تفسیریں ہیں، ایک مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہے اور دوسری مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔

حضرت کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جہنم کے سات دروازے مخصوص اعمال والوں کے لیے جہنم میں جانے کے ہیں اور جنت کے سات دروازے مخصوص اعمال والوں کے لیے جنت میں جانے کے ہیں لیکن جنت کا ایک دروازہ اضافی رکھا ہے کہ جس سے اہلِ توحید بغیر حساب کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ تو جنت کا ایک دروازہ بغیر حساب والوں کے لیے ہو گا کہ جن کے لیے اعمال کا مسئلہ ہی نہیں ہو گا، ان کے لیے اعلان ہو گا کہ تمہارا دروازہ یہ ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کے مہمان:

﴿وَنَبِّئۡهُمۡ عَنۡ ضَيۡفِ اِبۡرٰهِيۡمَ ﴿۵۱﴾ اِذۡ دَخَلُوۡا عَلَيۡهِ فَقَالُوۡا سَلٰمًا ؕ قَالَ اِنَّا مِنۡكُمۡ وَجِلُوۡنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوۡا لَا تَوۡجَلۡ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيۡمٍ ﴿۵۳﴾﴾

اس سورت مبارکہ میں اللہ رب العزت نے ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بالکل اختصار سے بیان فرمایا ہے۔ لوط علیہ السلام کا بھی ذکر کیا ہے اور حضرت شعیب علیہ السلام کا بھی کچھ ذکر فرمایا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں صرف اتنی بات فرمائی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام تشریف فرما تھے تو کچھ فرشتے انسانی شکل میں ان کے پاس آئے۔ ابراہیم علیہ السلام بہت مہمان نواز تھے۔ بغیر پوچھے ان کے لیے بچھڑا ذبح کیا اور کھانا

پکا کر ان کے پاس لے آئے۔ جب بچھڑا سامنے رکھ دیا تو انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا۔ ابراہیم علیہ السلام کو تھوڑا سا خوف محسوس ہوا کہ یہ کیسے مہمان ہیں جو کھانا نہیں کھاتے؟ کہیں یہ میرے لیے نقصان کا سبب نہ ہوں۔ اس وقت ملائکہ نے کہا کہ اے ابراہیم! آپ ہم سے ڈریں مت، ہم آپ کے پاس کھانا کھانے کے لیے نہیں آئے، ﴿اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝۵۳﴾ ہم تو آپ کو ایک بہت بڑے علم والے بیٹے کی خوشخبری دینے کے لیے آئے ہیں، اس لیے آپ ڈر محسوس نہ کریں۔ آپ علیہ السلام نے انہیں فرمایا:

﴿اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ۝۵۴﴾

میں تو بوڑھا ہو گیا ہوں، بڑھاپے میں آپ مجھے بچے کی بشارت دیتے ہو!

انہوں نے کہا: ﴿بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ۝۵۵﴾ ہم نے آپ کو سچی خوشخبری دی ہے، آپ اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہوں۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ﴿وَ مَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ۝۵۶﴾ کہ اللہ کی رحمت سے ناامید تو گمراہ آدمی ہی ہوتا ہے، میں ناامید تو نہیں بس ویسے میں نے تعجب میں کہا ہے کہ میں بوڑھا ہوں اور تم مجھے بشارت دے رہے ہو۔

پھر ابراہیم علیہ السلام نے ان ملائکہ سے محسوس کیا کہ یہ صرف بچے کی بشارت دینے کے لیے نہیں آئے ہیں، لگتا ہے کہ کوئی کام اور بھی ہے۔ فرمایا کہ تم نے بیٹے کی تو مجھے بشارت دی ہے، کوئی اور مقصد ہو تو وہ بھی بتا دو! حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی تھے تو محسوس ہوا کہ ان فرشتوں کا کوئی اور مقصد بھی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کی طرف تو نہیں آئے آپ کو تو صرف بشارت دینی تھی، اللہ نے ہمیں لوط علیہ السلام کی قوم کی طرف عذاب دینے کے لیے بھیجا ہے۔

فرشتوں کی لوط علیہ السلام کے پاس آمد:

جب وہاں پر پہنچے تو لوط علیہ السلام نے فرمایا: ﴿إِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنكَرُونَ﴾ کہ تم اجنبی لوگ لگتے ہو اور مجھے بہت دکھ ہے کہ تم میرے مہمان بنو گے۔ میری بد بخت قسم کی قوم ہے، یہ مردوں پر جنس پرستی کی وجہ سے ہاتھ ڈالتے ہیں، میں تمہاری حفاظت اپنی قوم سے کیسے کروں گا؟ یہ جنس پرستی کا جو مرض ہے یہ لوط علیہ السلام کی قوم سے چلا ہے، اس سے پہلے جنس پرستی کا کوئی تصور بھی نہیں تھا، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ قرآن کریم میں ہے کہ فرشتوں نے لوط علیہ السلام سے کہا:

﴿فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَ اتَّبِعْ أَدْبَارَهُمْ وَ لَا يَلْتَفِتْ مِنكُمْ أَحَدٌ وَّامْضُوا حَيْثُ تُؤْمَرُونَ ﴿٦٥﴾﴾

کہ آپ فکر نہ کریں، آپ تیاری کریں اور رات کو کسی وقت اپنے گھر والوں کو لے کر یہاں سے نکلیں اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلیں۔ آپ میں سے کوئی بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے بلکہ جہاں تک جانے کا حکم ہے وہیں تک چلتے رہیں۔

حضرت لوط علیہ السلام نے تیاری کی۔ ادھر قوم کو پتا چلا کہ لوط علیہ السلام کے پاس مہمان آئے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَجَآءَ أَهْلُ الْمَدِينَةِ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿٦٧﴾﴾

یہ لوگ ایک دوسرے کو خوش خبری دیتے ہوئے لوط علیہ السلام کے پاس پہنچے۔ اندازہ کریں کہ لوط علیہ السلام کس قدر غم زدہ ہو کر یہ بات فرماتے ہوں گے کہ:

﴿إِنَّ هَٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِي فَلَا تَفْضَحُونِ ﴿٦٨﴾ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُونِ ﴿٦٩﴾﴾

کہ یہ میرے مہمان ہیں، اللہ کے لیے مجھے رسوا نہ کرو! خدا سے ڈرو اور مجھے غمگین نہ کرو!

قومِ لوط کی بد بختی:

لیکن قوم ایسی بد بخت تھی کہ اس نے کہا: ﴿اَوَ لَمۡ نَنۡهَكَ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾ کہ اے لوط! ہم نے تمہیں کئی بار منع نہیں کیا کہ اپنے گھر میں دنیا جہان کے لوگوں کو مہمان نہ بنایا کرو۔

لوط علیہ السلام فرمانے لگے: ﴿هٰٓؤُلَاۤءِ بَنٰتِىۡۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِيۡنَ﴾

تمہاری بیویاں جو میری روحانی بیٹیاں ہیں وہ تمہارے گھروں میں موجود ہیں اس لیے تم کیوں اس جرم کا ارتکاب کرتے ہو؟ لوط علیہ السلام مسافر تھے۔ اپنا علاقہ نہیں تھا، عراق کے علاقے سے چلے تھے شام میں ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ گئے، وہاں سے حکم ہوا تو ہجرت کر کے بستی سدوم میں گئے۔ آپ تصور کرسکتے ہیں کہ نبی ہیں اور اجنبی علاقے میں رہتے ہیں اور اللہ کے حکم کی وجہ سے وہاں پہنچے ہیں تو کس قدر ان کو شرمندگی ہوگی جب ان کے مہمانوں پر قوم ہاتھ ڈالتی ہوگی۔ سوائے جزع فزع کے لوط علیہ السلام اور کیا کرسکتے تھے؟ لوط علیہ السلام نے بس ایک حسرت کا جملہ کہا تھا جو یہاں نہیں ہے ایک دوسرے مقام پر ہے، فرمایا:

﴿لَوۡ اَنَّ لِىۡ بِكُمۡ قُوَّةً اَوۡ اٰوِىۡۤ اِلٰى رُكۡنٍ شَدِيۡدٍ﴾ 32

کاش آج میری طاقت ہوتی یا میرا مضبوط قبیلہ ہوتا تو تم یہ حرکت کبھی نہ کرتے۔ خیر لوط علیہ السلام کو فرشتوں نے کہا کہ آپ ہماری پرواہ نہ کریں، ہم ان کو ہلاک کرنے کے لیے ہی آئے ہیں۔ اللہ رب العزت نے اس جگہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی قسم کھا کر فرمایا:

32۔ ھود 11:80

﴿لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿٧٢﴾﴾

کہ ہم آپ کی ذات کی قسم اٹھا کر کہہ رہے ہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام کی یہ قوم مدہوشی اور بے حیائی میں اتنی مست تھی کہ ان کو احساس ہی نہیں ہوا کہ پیغمبر ہمیں کس عذاب سے ڈرا رہا ہے اور ہمیں کس گناہ سے روکتا ہے؟! وہ لوگ بے حیائی پر ڈٹے رہے۔ بالآخر لوط علیہ السلام رات کو نکلے اور یہ پیچھے رہ گئے۔ لوط علیہ السلام کی اہلیہ وہ زانیہ نہیں تھی، کافرہ ضرور تھی۔

نبی کے گھر میں کافرہ عورت تو آسکتی ہے لیکن نبی کے گھر میں زانیہ عورت کبھی نہیں آسکتی۔ اس لیے کہ ہمارے معاشرے میں جس قدر عیب زنا کو سمجھا جاتا ہے اس قدر عیب کفر کو نہیں سمجھا جاتا۔ اس لیے اللہ اپنے نبی کے گھر میں کبھی بھی فاحشہ عورت کو نہیں آنے دیتے۔ ہاں کافرہ عورت آسکتی ہے۔ اس عذاب میں ان کی بیوی بھی رہ گئی اور باقی لوگ بھی رہ گئے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ اتنا سخت عذاب تھا کہ:

قومِ لوط پر عذاب:

﴿فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿٧٤﴾﴾

پہلے اللہ نے اس بستی کو پہلے اوپر لے جا کر نیچے کی طرف پلٹا اور پھر اوپر سے ان پر پتھر برسائے۔ آج بھی وہ بستی اس طرح تباہ شدہ ہے۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ بحرِ میت انہی بستیوں کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔ اس وقت سے لے کر آج تک نہ اس پانی میں کوئی مچھلی رہ سکی ہے نہ اس پانی میں کوئی اور جانور رہ سکا ہے۔ اللہ ہم سب کی ان عذابوں سے حفاظت فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)

اصحابِ حِجر والوں کا انجام:

﴿وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٨٠﴾﴾

حِجر والوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا۔

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے کہ وادی حجر میں قوم ثمود آباد تھی۔ ان کی طرف حضرت صالح علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ انہوں نے اپنی قوم کو دعوت دی لیکن قوم نے آپ کو جھٹلایا جس کے نتیجے میں اللہ نے اس قوم کو ایک ہیبت ناک آواز کے ذریعے ہلاک کر دیا۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب قوم ثمود کی طرف حضرت صالح علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا اور انہوں نے آپ کو جھٹلایا تھا تو پھر یہاں جمع کا صیغہ کیوں لائے؟ یعنی یہ کیوں کہا ﴿وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۸۰﴾﴾ کہ حِجر والوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا حالانکہ جھٹلایا تو ایک نبی کو تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ تمام انبیا علیہم السلام کی دعوت مشترک ہوتی ہے اس لیے ایک نبی کو جھٹلانا گویا تمام انبیاء کی دعوت کا انکار کرنا ہے۔ اس لیے یہاں جمع کا لفظ لائے یعنی حِجر والوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا۔

سورۃ الفاتحہ کو "قرآن عظیم" کہنے کی وجہ:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾﴾

اللہ رب العزت نے ان قوموں کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا کہ اے میرے پیغمبر! آپ کی قوم اگر آپ کی بات نہ مانے تو آپ گزشتہ انبیاء علیہم السلام کو دیکھیں۔ وہ بھی اپنی قوموں کو دعوت دیتے رہے ہیں اس لیے آپ بھی قوم کو دعوت دیتے رہیں۔ اگر یہ نہ مانیں تو آپ درگزر فرمائیں، آپ سختی نہ فرمائیں، جو دلائل آپ کے پاس ہیں آپ ان کو دے دیں اور دعا بھی مانگیں۔ اے پیغمبر! آپ کا اعزاز یہ ہے کہ ہم نے آپ کو وہ سورت دی ہے جو بار بار پڑھی جاتی ہے اور اس سورت کو اللہ نے قرآن عظیم بھی فرمایا ہے۔ مراد اس سے سورۃ الفاتحہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو

اللہ نے خاص طور پر عطا فرمائی تھی۔

یہاں پر دو باتیں سمجھ لیں:

[۱]: پہلی بات جو مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے کہ یہاں پر قرآن عظیم سے مراد "فاتحہ" ہے۔ اللہ نے سورۃ فاتحہ کو قرآن عظیم کیوں فرمایا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ پورے قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے چھ مضامین بیان فرمائے ہیں:

توحید، رسالت، قیامت، احکام، ماننے والے، نہ ماننے والے

یہ چھ مضامین اللہ نے سورۃ الفاتحہ میں اختصار سے بیان فرمادیے ہیں:

[1]: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱﴾ میں توحید۔

[2]: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳﴾ میں قیامت

[3]: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۴﴾ میں احکام

[4،5]: ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ میں رسالت اور ماننے والے

[6]: ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝۷﴾ میں نہ ماننے والے

اس لیے فاتحہ کو قرآن عظیم کہا کہ اس میں الفاظ تھوڑے ہیں اور پورے قرآن کا خلاصہ موجود ہے اور نماز کی جتنی بھی رکعتیں ہیں باقی سورت ہو یا باقی سورت نہ ہو لیکن فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ جیسے عشاء کی پہلی دو رکعتوں میں فاتحہ بھی ہے اور دوسری سورت بھی ہے اور آخری دو رکعتوں میں فاتحہ تو ہے لیکن اور کوئی سورت نہیں ہے۔ مغرب کی پہلی دو رکعتوں میں فاتحہ بھی ہے اور دوسری سورت بھی ہے اور آخری یعنی تیسری رکعت میں سورۃ الفاتحہ تو ہے لیکن دوسری کوئی سورت نہیں ہے۔

آپ کو تعجب ہو گا کہ ہر رکعت میں سورۃ الفاتحہ کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ

ہے کہ اللہ چاہتے ہیں کہ بندہ میرے سامنے کھڑا ہے، بندہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے تو میرا کلام پڑھے، پورا قرآن ہر رکعت میں بندہ اللہ کے سامنے نہیں پڑھ سکتا تو اللہ نے فرمایا کہ فاتحہ پڑھو گویا کہ تم نے سارا قرآن پڑھ لیا ہے۔ ایک تو یہ ذہن میں رکھ لیں۔

[۲]: اور دوسری بات کہ آپ یہ دو کتابیں اپنے پاس رکھ لیں؛ ایک مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ کی کتاب "سیرت المصطفی صلی اللہ علیہ وسلم" اور دوسری ڈاکٹر عبد الحئی عارفی رحمہ اللہ کی کتاب "اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم"۔

ان دونوں کتابوں کا اہتمام فرمائیں۔ یہ دو کتابیں ہر شخص کے پاس ضرور ہونی چاہییں۔ ان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کے حالات آپ کے سامنے موجود ہوں گے۔ "اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم" حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے خلیفہ مجاز ڈاکٹر عبد الحئی عارفی رحمہ اللہ نے لکھی ہے، ایک جلد میں ہے اور سارے معمولات جمع کیے ہیں کہ کھانا کیسے ہے، پینا کیسے ہے، پگڑی کیسے باندھنی ہے، ٹوپی کیسے پہننی ہے، سونا کیسے ہے؟ یہ سب معمولات جمع کر دیے ہیں۔

پیغمبر پاک علیہ السلام کو تسلی:

جب اللہ رب العزت نے یہ ساری باتیں ارشاد فرمائیں تو آخر میں ایک جملہ یہ ارشاد فرمایا:

﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾﴾

اے پیغمبر! ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ جو باتیں بناتے ہیں ان کی وجہ سے آپ کا سینہ تنگ ہوتا ہے۔ ہمیں اس بات کا پتا ہے۔ اب اس کا حل یہ ہے ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ

رَبِّكَ وَكُنۡ مِّنَ السّٰجِدِیۡنَ ﴿۹۸﴾ کہ آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہیے اور سجدہ کرنے والوں میں شامل رہیے!

اس آیت کے تحت مفسرین نے لکھا ہے خصوصاً مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہ اللہ نے اپنے نبی کو تسلی دی ہے کہ آپ دعوت دیتے ہیں اور یہ قبول نہیں کرتے تو آپ کا دل تنگ ہو تو اس کا حل یہ ہے کہ آپ اللہ کی تعریف بھی کریں، اللہ کو سجدے بھی کریں۔ معلوم ہوا کہ دکھ پر خدا کو یاد کرنے سے خدا دکھ کو ختم فرما دیتے ہیں اور آپ کو تسلی مل جائے گی۔

عقیدہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اشکال کا جواب:

﴿وَاعۡبُدۡ رَبَّکَ حَتّٰی یَاۡتِیَکَ الۡیَقِیۡنُ ﴿۹۹﴾﴾

پیغمبر! آپ اللہ کو یاد کیا کریں۔ یہ کفار آپ کی بات نہ بھی مانیں تو بھی آپ وفات تک اللہ کی عبادت میں لگے رہیں۔ آپ سے آپ کی عبادت کے بارے میں سوال ہو گا، ان کی عبادت کے بارے میں سوال نہیں ہو گا۔

اس آیت سے یہ مسئلہ ذہن نشین فرمالیں کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں۔ جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں نماز نہیں پڑھتے وہ اس آیت کو ہمارے خلاف بطور دلیل کے پیش کرتے ہیں اور یہ دلیل کیسے ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں ہے: ﴿وَاعۡبُدۡ رَبَّکَ حَتّٰی یَاۡتِیَکَ الۡیَقِیۡنُ﴾ کہ اے پیغمبر! آپ موت آنے تک عبادت کریں! یہ نہیں کہ موت کے بعد بھی عبادت کریں اور تم جو حدیث پیش کرتے ہو کہ:

"اَلْأَنْبِيَاءُ أَحْيَاءٌ فِيْ قُبُوْرِهِمْ يُصَلُّوْنَ"[33]

انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں، جبکہ قرآن کہتا ہے کہ موت تک نماز ہے اور حدیث کہتی ہے کہ قبروں میں بھی نماز ہے۔ تو یہ حدیث قرآن کے خلاف ہو گئی۔ ان کی دلیل سمجھ میں آگئی؟ (جی ہاں۔ سامعین)

اب بندہ سمجھتا ہے کہ یہ بہت بڑا علامہ ہے، بہت بڑا شیخ القرآن ہے کہ حدیثیں بھی قرآن کے خلاف ثابت کرتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو قرآن کے خلاف ثابت کر دیا یہ کتنا بڑا عالم ہے! لوگ اس کا نام "علامہ" رکھتے ہیں جو نبی کی حدیثوں کو قرآن کے خلاف ثابت کرتے ہیں۔

بابا! یہ عالم نہیں ہے، اس سے بڑا جاہل کون ہو سکتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو قرآن سے ٹکراتا ہے!

عبادتِ تکلیفی اور عبادتِ تلذذی:

حکیم الامت مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا بہت پیارا جواب دیا ہے۔ حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ عبادت کی دو قسمیں ہیں:

ایک عبادت تکلیفی ہے اور ایک عبادت تلذذی ہے۔ عبادت تکلیفی اسے کہتے ہیں کہ نماز پڑھیں تو ثواب ملے اور عبادت نہ کریں تو گناہ ملے۔ اب فجر کی نماز پڑھیں گے تو ثواب ملے گا اور نہیں پڑھیں گے تو گناہ ملے گا۔ انسان نماز پڑھنے کا مکلف ہے، اور عبادت تلذذی کا معنی یہ ہے کہ عبادت کریں گے تو مزا آئے گا اور عبادت نہیں کریں گے تو مزا نہیں آئے گا۔ اس کا گناہ اور ثواب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

33۔ مسند ابی یعلی الموصلی: ص658 رقم الحدیث 3425

آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے مثال دے کر یہ بات سمجھائی تھی کہ رمضان میں آپ اگر افطاری کریں تو ثواب ملے گا اور اگر چیزیں موجود ہوں اور افطاری پھر بھی نہ کریں تو ثواب ملے گا یا گناہ ہو گا؟ (گناہ ہو گا۔ سامعین) اب افطاری کے وقت یہ جو آپ کولڈ ڈرنک استعمال کرتے ہیں، شربت استعمال کرتے ہیں، جوس استعمال کرتے ہیں اس کے استعمال کرنے پر ثواب ہے اور نہ استعمال کرنے پر گناہ ہے تو افطاری کے وقت جو کھانا پینا ہے یہ تکلیفی ہے، اور جب تراویح کے بعد آپ کہتے ہیں کہ ہم نے تراویح پڑھ لی ہے، اب آئس کریم ہونی چاہیے، اب اگر آئس کریم نہ کھائیں تو پھر گناہ نہیں ہو گا، کھائیں گے تو مزا آئے گا۔ تو یہ تراویح والی جو آئس کریم ہے یہ تلذذی ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ جو دنیا میں عبادت ہے یہ عبادت تکلیفی ہے، ہمارے پیغمبر! موت تک آپ نے عبادت تکلیفی کرنی ہے، اور جو قبر میں نماز ہے وہ تکلیفی نہیں ہے وہ تلذذی ہے۔ تو آیت میں عبادت اور ہے اور حدیث میں عبادت اور ہے۔ اب بتائیں ٹکراؤ کیسے ہے؟ قرآن اور بات کہہ رہا ہے، حدیث اور بات کہہ رہی ہے۔ اللہ پاک ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جب جنتی جنت میں جائیں گے تو جنت میں اللہ کی نعمتوں کو کھائیں گے تو کہیں گے: "الحمد للہ!" تو یہ عبادت نہیں ہے؟ (عبادت ہے۔ سامعین) تو جب قرآن میں ہے کہ موت کے بعد عبادت نہیں ہے تو یہ جنت میں کیسے عبادت کریں گے؟ ہم کہتے ہیں کہ یہ عبادت تلذذی ہو گی۔ اللہ ہم سب کو جنت عطا فرمائے۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

سورۃ النحل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰہِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡہُ ؕ سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ﴿۱﴾﴾

تمہیدی باتیں:

آج ہمارے درس قرآن کا عنوان ہے ”سورۃ النحل کے مضامین“۔ اس سورت کا ایک نام سورۃ النحل ہے اور ایک نام سورۃ النِعَم بھی ہے۔ نِعَم کا معنی ہے نعمتیں۔ تو اس سورت میں اللہ پاک نے بہت سارے انعامات کا تذکرہ فرمایا ہے جو اللہ نے انسان کو عطا فرمائے ہیں۔ مثلاً اس میں ایک بہت بڑی نعمت یہ ہے کہ انسان کو دودھ کے لیے بھینس عطا فرمائی۔ بھینس گھاس کھاتی ہے تو اس کا ایک حصہ گوبر بن جاتا ہے اور ایک حصہ دودھ بنتا ہے۔ گوبر اور خون کے درمیان میں سے اللہ پاک خالص دودھ عطا فرماتے ہیں، یہ اللہ کا کتنا بڑا احسان اور اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔

اللہ نے اس قسم کی بہت سی نعمتوں کا تذکرہ فرمایا ہے اس لیے اس سورت کا نام ”سورۃ النعم“ بھی ہے کیوں کہ اس میں خاص نعمتوں کا تذکرہ ہے لیکن سورت کا معروف نام سورۃ النحل ہے۔ عربی زبان میں ”نحل“ کہتے ہیں شہد کی مکھی کو۔ کیونکہ اس سورت مبارکہ میں شہد کی مکھی اور شہد کا بطورِ خاص ذکر فرمایا اس لیے اس سورت کا نام بھی سورۃ النحل رکھ دیا گیا۔

اس سورت کے 16 رکوع ہیں اور 128 آیات ہیں۔ میں عرض کیا کرتا ہوں کہ ساری آیات کی تفصیل ذکر نہیں کی جاتی چند آیات کی تفصیل اور پھر پوری سورت کا خلاصہ آپ کی خدمت میں ذکر کر دیا جاتا ہے۔

شہد کی مکھی:

اس سورت کی آیت نمبر 68 میں اللہ نے شہد کی مکھی کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اللہ رب العزت شہد کی مکھی کے دل میں کئی طرح کے پیغام بھیجتے ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے:

﴿اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعْرِشُوْنَ ﴿۶۸﴾﴾

شہد کی مکھی کو حکم یہ ہے کہ شہد کا وہ چھتا جس پر وہ شہد بناتی ہے اسے پہاڑ پر لگائے یا کسی درخت پر لگائے یا کسی اونچی منزل پر بنائے یعنی شہد کا مخصوص چھتا جس پر شہد بنتا ہو اس کو زمین پر نہیں لگانا! اس چھتے کو بطورِ خاص غلاظت سے پاک صاف رکھنا ہوتا ہے اس لیے اللہ اس کو بلند جگہ رکھنے کا حکم فرماتے ہیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ شہد کو اللہ پاک نے صاف رکھنا ہے تو بلند جگہ پر بھی رکھوایا، پھر شہد کے چھتے کو اللہ پاک نے فرمایا: "بُیُوْتًا" یہ جمع ہے "بیت" کی، بیت کہتے ہیں مکان کو۔ عام طور پر جو مکان انسان کے رہنے کے لیے ہوتے ہیں عربی زبان میں ان کو بیت کہتے ہیں۔ اللہ پاک نے شہد کی مکھی کی جگہ کے لیے بھی وہی لفظ استعمال کیا ہے جو انسان کے مکان کے لیے ہے یعنی بیت۔ تو جس طرح انسان کے گھر کو بیت کہتے ہیں تو شہد کی مکھی کے گھر کو بھی بیت کہتے ہیں۔ اللہ پاک انسان کے گھر کی حفاظت بھی کرتے ہیں اور شہد کی مکھی کے گھر کی حفاظت بھی کرتے ہیں۔

جس طرح انسانی سوسائٹی میں ایک بڑا ہوتا ہے اور باقی اس کے ماتحت ہوتے ہیں بالکل اسی طرح شہد کی مکھیوں میں بھی ایک بڑا ہوتا ہے اور باقی اس کے ماتحت

ہوتے ہیں۔ شہد کی مکھی کے بڑے کو ’’ملکہ‘‘ کہتے ہیں۔ ان کا جسم اور قد بھی عام مکھیوں سے قدرے بڑا ہوتا ہے۔ یہ ملکہ باقی سب مکھیوں کی ڈیوٹیاں لگا دیتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس ملکہ کو اتنی طاقت عطا فرما دیتے ہیں کہ یہ سیزن میں یومیہ ایک ہزار سے زیادہ انڈے دیتی ہے جس سے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ خاص قسم کی گھنگھناہٹ پیدا کرنے کے لیے شہد کی مکھی ایک منٹ میں گیارہ ہزار مرتبہ اپنے پروں کو حرکت دیتی ہے اور اس سے ایک خاص قسم کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ شہد کی مکھی جب پھولوں کا رس چوسنے کے لیے سفر کرتی ہے تو آدھا کلو شہد تیار کرنے کے لیے اسے مجموعی طور پر 55 ہزار کلومیٹر کا سفر طے کرنا پڑتا ہے اور ایک سفر میں ایک مکھی پچاس سے لے کر سو تک پھولوں سے رس چوستی ہے اور اس سے شہد تیار ہوتا ہے جو کہ چھوٹی محنت نہیں ہے۔

شہد کی مکھی اتنی محنت کرتی ہے۔ بارہ کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے سفر کرتی ہے اور پچپن ہزار کلومیٹر کا سفر طے کرتی ہے۔ اگر کوئی شہد کی مکھی راستے میں کسی گندگی پر بیٹھ جائے اور پھر شہد کے چھتے میں آئے تو مکھیوں کی جو ملکہ ہوتی ہے اس نے باقاعدہ پولیس رکھی ہوئی ہوتی ہے، یہ پولیس یا گارڈ باہر پہرہ دیتے ہیں، جب ایسی مکھی آئے تو اس کو چھتہ سے باہر ہی روک لیتے ہیں اور اسے قتل کر دیتے ہیں کہ تم صاف چیزوں کے بجائے گندگی لے کر کیوں آئی ہو؟

شہد کا چھتا؛ عظیم کاریگری کا نمونہ:

اللہ پاک نے جو شہد ہمارے لیے پیدا فرمایا ہے اس کا اتنا انتظام فرماتے ہیں۔ اور آپ حیران ہوں گے کہ خوردبین جس سے چھوٹی چھوٹی چیزیں دیکھا کرتے ہیں اس خوردبین میں ایک عکسہ اور شیشہ ہوتا ہے، شہد کی مکھی کی آنکھیں بھی خوردبین کی طرح کام کرتی ہیں۔ اب انسان اس کو سوچنا چاہے تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ شہد کی مکھی جس مکان میں شہد بناتی ہے پہلے اس مکان میں مخصوص چھتا بنتا ہے۔ وہ چھتا خاص قسم کے

مواد سے تیار ہوتا ہے۔ شہد کی مکھی جو چھتا بناتی ہے اس کے خانے نہ مثلث ہیں نہ مربع ہیں نہ مخمس ہیں بلکہ مسدس ہیں یعنی تین بھی نہیں، چار بھی نہیں، پانچ بھی نہیں ہے بلکہ چھ کونوں والے خانے ہیں۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ چھ کیوں ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس خانے کے تین کونے ہوں اسے آپ جب بھی صاف کریں گے تو کچھ نہ کچھ اس میں ذرے رہ جائیں گے، چار ہوں گے تب بھی رہ جائیں گے، پانچ ہوں گے تب بھی رہ جائیں گے اور اگر آپ مسدس یعنی چھ کونے والا ایک خانہ بنائیں تو اس کے ہر کونے کے درمیان میں بالکل بھی فاصلہ نہیں ہوتا اس لیے مکھی مسدس شکل کو اختیار کرتی ہے۔ یہ مکان میں چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں جیسے ہمارے مکان میں کمرے ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک ایک کمرہ مسدس بنتا ہے۔ دنیا میں آپ کو کوئی انجینئر اتنا اچھا کام کرنے والا نہیں ملے گا جو اللہ مکھی کے ذریعے لیتے ہیں۔

شہد کی مکھی کو پیغام:

﴿وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ﴾

جس طرح نبی پر اللہ اپنا کلام اتاریں اسے "وحی" کہتے ہیں، مکھی پر وحی تو نہیں ہوتی لیکن اللہ نے لفظ وحی والا استعمال کر کے اس کو براہِ راست یہ حکم دیا کہ پہاڑوں درختوں اور اونچی جگہوں پر اپنا گھر بنا۔

﴿فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ﴾

اور مکھی کے لیے اللہ رب العزت راستے بہت آسان بنا دیتے ہیں۔ یہ گزشتہ دور میں سمجھنا مشکل تھا لیکن آج کے دور میں سمجھنا بہت آسان ہے۔ اب دیکھیں! ہمارے لیے ایک راستہ زمین پر ہے اور ایک راستہ فضا میں جہازوں کے لیے ہے، ہم جیسا بندہ جو اِن چیزوں کے علم کو نہیں جانتا وہ نہیں سمجھ سکتا کہ فضا میں ایئر لائن کا راستہ

کیسے ہوتا ہے؟ گویا یہ راستہ پہلے مکھیوں کے لیے تھا اور آج جہازوں کے لیے بنا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے فضائی راستے موجود ہیں جو آج انسان جہازوں کے لیے استعمال کرتا ہے اور ہزروں لاکھوں سال سے ان کو شہد کی مکھی استعمال کر رہی ہے۔

تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے:

﴿يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ﴾

فرمایا مکھی کے پیٹ سے پینے کی ایسی چیز نکلتی ہے جس کے رنگ مختلف ہیں، اس میں انسان کی بیماری کے لیے اللہ نے شفا رکھی ہے۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کرنے لگا کہ میرا بھائی بیمار ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے شہد پلاؤ! اس نے شہد پلایا۔ آکر پھر کہنے لگا کہ بیماری ابھی ویسے ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی مشورہ دیا۔ اس نے جا کر پلایا لیکن بیماری ابھی بھی ویسے تھی۔ تیسری بار پھر آیا اور آکر کہا کہ اب بھی کوئی فرق نہیں۔ تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "صَدَقَ اللّٰهُ وَ كَذَبَ بَطْنُ أَخِيْكَ" اللہ کا قرآن سچا ہے اور تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے، "اِسْقِهِ عَسَلًا" اس کو پھر جا کر شہد پلاؤ! اس نے جا کر پھر پلایا تو مریض ٹھیک ہو گیا۔[34]

شہد کی مکھی کے بارے میں حدیث:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

34۔ صحیح البخاری، رقم:5684

"اَلذُّبَّانُ کُلُّھَا فِی النَّارِ یَجْعَلُھَا عَذَابًا لِأَھْلِ النَّارِ إِلَّا النَّحْل" [35]

یعنی دوسرے تکلیف دینے والے جانداروں کی طرح مکھیوں کی بھی تمام قسمیں جہنم میں جائیں گی مگر شہد کی مکھی جہنم میں نہیں جائے گی۔

تو اللہ تعالیٰ مکھیوں کی تمام اقسام کو عذاب دینے کے لیے جہنم میں نہیں ڈالیں گے بلکہ اس لیے ڈالیں گے کہ یہ مکھیاں جہنمیوں کو عذاب دیں، ان کو کاٹیں اور انہیں تکلیف دیں لیکن شہد کی مکھی وہ واحد جانور ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ جہنم میں عذاب دینے کے لیے تو درکنار جہنمیوں کو عذاب دینے کے لیے بھی نہیں بھیجیں گے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عام حالات میں شہد کی مکھیوں کو مارنے سے منع بھی کیا ہے کہ ان کو قتل نہ کرو۔ [36]

ہاں اگر وہ آپ کو تکلیف دینا چاہ رہی ہو اور آپ نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے کوئی تدبیر کی اور وہ مر گئی تو یہ بات الگ ہے لیکن کوشش کیا کریں کہ اس کو قتل نہ کریں۔

دنیا کی حقیقت:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں دو چیزیں انسان کے لیے بڑی اہم ہیں؛ انسان کا لباس اور انسان کی خوراک۔ دنیا میں سب سے بہترین اور قیمتی اور نرم لباس ریشم کا ہے اور دنیا میں سب سے بہترین مشروب شہد کا ہے۔ "أَشْرَفُ لِبَاسِ ابْنِ آدَمَ فِیهَا لُعَابُ دُوْدَةٍ" دنیا میں انسان کا سب سے قیمتی لباس ریشم کے کیڑے کا لعاب ہے، "وَ أَشْرَفُ شَرَابِہٖ رَجِیْعُ نَحْلَةٍ" اور اس کا نفیس لذت بخش

35۔ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ج2 ص1781

36۔ سنن ابی داوٗد، رقم: 5267

مشروب شہد کی مکھی کا فضلہ ہے۔[37]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دنیا کی حقارت بیان فرمائی ہے کہ سب سے قیمتی لباس بھی ایک جانور کا تھوک ہے اور سب سے قیمتی مشروب بھی ایک جانور کا فضلہ ہے۔

اللہ ہمیں یہ ساری باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

جانوروں کی پیدائش:

﴿وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝﴾

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کچھ نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے اور جانوروں کا بطور خاص ذکر فرمایا ہے۔ فرمایا کہ چوپایوں کو اللہ ہی نے تمہارے لیے بنایا ہے، ان میں تمہارے لیے سردی سے بچنے کا سامان ہے یعنی جانوروں کی اون سے تم گرم لباس بنا کر سردی سے اپنا بچاؤ کرتے ہو۔ مزید فرمایا کہ ان میں تمہارے لیے اور بھی منافع ہیں اور ایک نفع یہ بھی ہے کہ تم ان کا گوشت کھاتے ہو۔

آگے فرمایا کہ ان جانوروں پر تم بوجھ لادتے ہو جو تم اٹھا کر نہیں لے جا سکتے تھے، یہ جانور تمہارا بوجھ بھی اٹھاتے ہیں۔

﴿وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ۭ﴾

یہاں تین قسم کے جانوروں کا ذکر کیا: گھوڑا، خچر اور گدھا۔ ان کو کیوں پیدا کیا؟ تو یہاں یہ فائدے ارشاد فرمائے:

1: ﴿لِتَرْكَبُوْهَا﴾ کہ تم ان پر سواری کرو۔

37۔ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ج2 ص1782

2: ﴿وَ زِیۡنَۃً﴾ تا کہ تمہاری زینت کا سبب بنیں۔

گھوڑے کا گوشت نہ کھائیں:

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ کی دور نظری دیکھیں! امام صاحب فرماتے ہیں کہ اس آیت سے پتا چلتا ہے کہ گھوڑے کا گوشت نہیں کھانا چاہیے۔ کیوں کہ اللہ نے پہلے ذکر فرمایا: ﴿وَ الۡاَنۡعَامَ خَلَقَهَا﴾ کہ اللہ ہی نے جانور پیدا فرمائے، پیدا اس لیے فرمائے کہ ﴿لَكُمۡ فِيۡهَا دِفۡءٌ﴾ اس کے اون کا لباس استعمال کر کے سردی سے بچو، ﴿وَّ مَنَافِعُ﴾ اس سے نفع حاصل کرو، ﴿وَمِنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ﴾ اور ان کو کھاؤ، لیکن جب گھوڑے کی باری آئی تو فرمایا: ﴿لِتَرۡكَبُوۡهَا وَ زِيۡنَةً﴾ کہ گھوڑے کو اس لیے پیدا نہیں کیا کہ اسے کھاؤ بلکہ اس اس لیے پیدا کیا کہ اس پر سواری کرو اور اس سے زینت کا کام لو۔

حضرت امام صاحب کا دماغ دیکھیں! قرآن کی آیت سے استدلال فرمایا کہ گھوڑے کو کھانا جائز نہیں ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اللہ نے گھوڑے، خچر اور گدھے کا اکٹھا ذکر فرمایا اور فرمایا: ﴿لِتَرۡكَبُوۡهَا وَ زِيۡنَةً﴾ پہلے اور جانوروں کا ذکر کر دیا اور بعد میں ان تین کا اکٹھا ذکر کر دیا۔ معلوم ہوا کہ جس طرح گدھے کو نہیں کھانا چاہیے، جس طرح خچر کو نہیں کھانا چاہیے اسی طرح گھوڑے کو بھی نہیں کھانا چاہیے۔ گھوڑے کے کھانے سے بچنا چاہیے۔

فقہاء نے اس کی وجوہات اور بھی لکھی ہیں۔ مثلاً صاحبِ ہدایہ نے ایک وجہ یہ لکھی ہے کہ گھوڑا چونکہ جہاد کا آلہ ہے اس لیے گھوڑے کا گوشت نہ کھانے میں گھوڑے کا احترام ہے اور اس لیے گھوڑے کو نہیں کھانا چاہیے کہ اگر آلات جہاد کو کھانا شروع کر دیں تو آلاتِ جہاد کم ہو جائیں گے اور شریعت نے آلات جہاد بڑھانے کا حکم

دیا ہے، کم کرنے کا حکم نہیں دیا ہے۔

بہر حال میں نے صرف یہ عرض کیا ہے کہ گھوڑے کو کھانا نہیں۔ آپ ایمانداری کے ساتھ بتائیں کہ جس جانور کو عام حالات میں کھانا مکروہ ہے اس جانور کی قربانی کرنا کیسے جائز ہو گا؟ اور آج لوگوں نے نیا مسئلہ نکال رکھا ہے، پہلے گھوڑے کی قربانی پر فتوے دیتے تھے اور اب گھوڑے کی قربانی شروع بھی کر دی ہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو زندہ کیا جارہا ہے! اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک کام کو نہ فرمائیں تو وہ سنت کیسے ہو سکتی ہے؟

سمندر کے فائدے:

﴿وَ هُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا﴾

وہی ذات ہے جس نے سمندر تمہارے لیے مسخر کر دیے ہیں یعنی تمہارے کام پر لگا دیے ہیں تاکہ تم اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس میں سے زیورات نکالو جنہیں تم پہنتے ہو!

تازہ گوشت سے مراد مچھلی ہے:

مفسرین نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ یہ جو اللہ رب العزت نے فرمایا ہے کہ ہم نے سمندر کو تمہارے کے لیے مسخر کر دیا ہے تاکہ تم اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ، اس سے مراد مچھلی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مچھلی ایسا جانور ہے اگر زندہ ہو تب بھی تازہ ہے اور اگر تم اسے مار دو تب بھی تازہ ہے۔ اس آیت سے پتا چلا کہ مچھلی کو ذبح کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اللہ نے ان کے گوشت کو تازہ قرار دیا ہے، لہذا ذبح کیے بغیر استعمال کی جاتی ہے۔

منکرینِ حیات الانبیاء کے استدلال کا جواب:

﴿وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝٢٠ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝٢١﴾

ان آیات کو بطور خاص سمجھیں!

اللہ رب العزت نے ان آیات میں مشرکینِ مکہ کی یا ان سے پہلے کے مشرکین جو بتوں کی عبادت کرتے تھے، ان کی تردید کی ہے، فرمایا:

یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر جن چیزوں کی پوجا کرتے ہیں وہ کسی چیز کو بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ ﴿وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ﴾ بلکہ یہ تو خود پیدا ہوتے ہیں یعنی یہ خالق نہیں ہیں بلکہ خود مخلوق ہیں، ﴿اَمْوَاتٌ﴾ یہ مردہ ہیں، ﴿غَيْرُ اَحْيَآءٍ﴾ ان میں زندگی نہیں ہے، ﴿وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ﴾ اور ان کو خود پتا نہیں کہ کب اٹھیں گے۔ لہذا ایسے آدمی کو معبود نہ مانو، ایسے آدمی کی عبادت نہ کرو اور اس کو خدا نہ سمجھو۔

یہ آیت خدا نے بتوں کے بارے میں نازل کی ہے۔ بہت سے حضرات اس آیت سے دلیل یہ پکڑتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام بھی وفات کے بعد مردہ ہیں، انبیاء علیہم السلام بھی اپنے قبروں میں زندہ نہیں ہیں، دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾

کہ جن کو وہ اللہ کے علاوہ پکارتے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ کے علاوہ بت بھی ہیں، اللہ کے علاوہ جن بھی ہیں، اللہ کے علاوہ فرشتے بھی ہیں، اللہ کے علاوہ انسانوں میں نبی بھی ہیں، ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ عام ہے، اللہ کے علاوہ جو بھی ہیں وہ سارے اس آیت میں شامل ہو جائیں گے۔ دلیل سمجھ میں آ گئی ان کی؟ (جی ہاں۔ سامعین)

کہ اللہ کے علاوہ جس کی بھی یہ پوجا کریں یہ سارے کے سارے ﴿اَمۡوَاتٌ﴾ ہیں یعنی مردہ ہیں، ﴿غَیۡرُ اَحۡیَآءٍ﴾ اور یہ زندہ نہیں ہیں۔ اس میں نبی بھی شامل ہیں اور غیر نبی بھی شامل ہیں۔ قرآن نے سب کو مردہ کہہ دیا ہے۔

اور ﴿وَمَا یَشۡعُرُوۡنَ ۙ اَیَّانَ یُبۡعَثُوۡنَ﴾

ان کو پتا ہی نہیں ہے کہ کب اٹھائے جائیں گے؟ اگر یہ زندہ ہوتے تو ان کو پتا ہوتا، جب ان کو پتا ہی نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زندہ نہیں ہیں۔ اس سے پتا چلا کہ نبی زندہ بھی نہیں ہے اور نبی قبر میں سنتا بھی نہیں ہے۔

منکرِ حیات سے گفتگو:

گزشتہ سے پیوستہ عید الفطر کی بات ہے، میں وہاں 87 جنوبی اپنے مرکز میں بیٹھا ہوا تھا۔ منڈی بہاؤ الدین کے ایک عالم مجھ سے بیعت ہیں وہ مجھے ملنے کے لیے آئے۔ ان کے ساتھ دو ساتھی اور بھی تھے۔ تو ان کے ساتھ جو آدمی آئے تھے انہوں نے مجھ سے اسی آیت پر بات کی کہ مولانا صاحب! آپ تو کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور قرآن کہتا ہے کہ مردہ ہیں، زندہ نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ دلیل کیا ہے؟ انہوں نے کہا: قرآن میں ہے: ﴿وَالَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ﴾ کہ جن کو یہ مشرکین پوجتے ہیں اللہ کے علاوہ، ﴿اَمۡوَاتٌ﴾ وہ سارے کے سارے اموات ہیں۔ ﴿مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ﴾ میں تو نبی بھی شامل ہے۔ اس سے پتا چلا کہ نبی بھی اموات ہیں اور ﴿وَمَا یَشۡعُرُوۡنَ ۙ اَیَّانَ یُبۡعَثُوۡنَ﴾ ان کو پتا ہی نہیں ہے کہ کب اٹھائے جائیں گے؟ جب انہیں پتا ہی نہیں تو یہ زندہ بھی نہیں ہیں۔

میں نے ان سے کہا کہ آپ کی دلیل کی بنیاد دو چیزیں ہیں:

1: اللہ نے ﴿اَمۡوَاتٌ﴾ کہا کہ یہ مردے ہیں۔

2: ﴿وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ﴾ کہ ان کو پتا نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے؟

میں نے کہا کہ اگر اس آیت کو آپ بطور دلیل پیش کرتے ہیں تو آپ سے دو سوال ہیں:

(1): اللہ نے فرمایا: ﴿اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ﴾۔ یہاں صرف ﴿اَمْوَاتٌ﴾ فرمایا یا ﴿غَيْرُ اَحْيَآءٍ﴾ بھی فرمایا؟ کہا کہ ﴿غَيْرُ اَحْيَآءٍ﴾ بھی فرمایا۔ میں نے کہا کہ اموات کا معنی تو ہے کہ مردے ہیں، غیر احیاء کا کیا معنی ہے؟ کہنے لگے کہ "زندہ نہیں ہیں"۔ تو میں نے کہا کہ جب "اموات" فرما دیا تھا تو اب بتاؤ "غیر احیاء" کہنے کا کیا مطلب تھا؟

مثلاً میں کہتا ہوں کہ مجھے بھوک لگی ہے۔ اس کا کیا معنی ہے کہ میں نے کھانا کھایا ہے یا نہیں؟ (نہیں کھایا، سامعین) اب میں آپ سے کہوں کہ "مجھے بھوک لگی ہے، میں نے کھانا نہیں کھایا۔" تو آپ کہیں گے کہ مولانا صاحب! آپ کو بھوک لگی ہے اس سے ہمیں سمجھ آ گیا ہے کہ آپ نے کھانا نہیں کھایا ہے، اس لیے آپ کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ "میں نے کھانا نہیں کھایا"۔

میں نے کہا کہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿اَمْوَاتٌ﴾ اور آگے فرمایا: ﴿غَيْرُ اَحْيَآءٍ﴾ تو جب "اموات" کا معنی بھی زندہ نہیں ہیں تو پھر "غیر احیاء" کہنے کی ضرورت کیا ہے؟ میں نے کہا کہ ایک تو آپ یہ بتائیں!

(2): دوسرا میں نے ان سے کہا کہ قرآن میں ہے: ﴿وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ﴾ کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے یہ انہیں پتا ہی نہیں ہے۔

آپ نے کہا تھا کہ چونکہ انہیں پتا نہیں ہے لہذا زندہ بھی نہیں ہیں۔ مجھے

بتائیں! آپ یہاں سے کب اٹھیں گے؟ وہ کہنے لگے: ہمیں پتا نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ زندہ ہیں یا مردہ؟ کہنے لگے: زندہ۔ میں نے کہا کہ ہمیں تو سمجھ نہیں آ رہی کہ آپ زندہ ہیں یا مردہ؟ بات سمجھ آ گئی ہے؟ (جی ہاں۔ سامعین)

میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ میں کب اٹھوں گا؟ (نہیں۔ سامعین) اس سے معلوم ہوا کہ آپ زندہ نہیں ہیں کیونکہ آپ کو پتا ہی نہیں۔ میں نے کہا: اگر پتا نہ چلنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ زندہ نہیں ہیں تو آپ لوگوں کو بھی پتا نہیں ہے، اب بتاؤ میں آپ کو زندہ مانوں یا مردہ مانوں؟ کہنے لگے کہ زندہ مانیں! میں نے کہا کہ جب آپ کو پتا نہیں تو زندہ کیسے؟ اگر آپ کو پتا نہیں تو آپ زندہ اور اگر ان کو پتا نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے تو وہ بھی زندہ!

میں نے ان سے کہا کہ اچھا یہ بتائیں کہ ہماری موت کب آئے گی؟ کہا کہ پتا نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ زندہ ہیں یا مردہ؟ کہا کہ زندہ۔ میں نے کہا: جس طرح اس جہان میں پتا نہیں کہ موت کب آنی ہے؟ اسی طرح قبر کے بعد پتا نہیں کہ کب اٹھنا ہے۔ تو یہاں بھی زندہ اور وہاں بھی زندہ۔ یہاں مرنے کا پتا نہیں اور وہاں دوبارہ اٹھنے کا پتا نہیں۔ یہ تو اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ مردہ ہیں۔ آپ کوئی دلیل پیش کریں!

میت کی دو قسمیں:

باقی یہ جو آپ نے نقل کیا: ﴿اَمۡوَاتٌ غَیۡرُ اَحۡیَآءٍ﴾ اللہ نے یہاں پہلے فرمایا: ﴿اَمۡوَاتٌ﴾ اور پھر فرمایا: ﴿غَیۡرُ اَحۡیَآءٍ﴾۔ پہلے اموات کہا اور پھر غیر احیاء کہا، اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں ایک مقام پر ہے:

﴿اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّہُمۡ مَّیِّتُوۡنَ ﴿۳۰﴾﴾ [38]

38۔ الزمر 30:39

یہاں صرف "میت" کہا، ساتھ "غیر احیاء" نہیں کہا۔ پتا یہ چلا کہ دنیا کی میت دو قسم کی ہیں: ایک میت وہ ہے کہ جس میں روح آئی اور نکل گئی یہ بھی میت ہے، اور ایک میت وہ ہے کہ جس میں سرے سے روح آئی ہی نہیں۔ بات سمجھ میں آگئی؟

انسان پر موت آئے تو یہ "میت" ہے لیکن یہ ایسا میت ہے کہ جس میں پہلے روح تھی اور نکل گئی اور ایک میت یہ ہے جیسے میرے سامنے یہ موبائل ہے، یہ مردہ ہے یا زندہ؟ (مردہ۔ سامعین) اس میں کبھی روح آئی ہے؟ (نہیں۔ سامعین) اب یہ ایسا میت ہے کہ جس میں روح آئی ہی نہیں ہے۔ جس میں روح آئے اور نکل جائے اس کو "مَیِّتٌ" کہتے ہیں اور جس میں روح آئی ہی نہ ہو اس کو "مَیِّتٌ غَیْرُ حَیٍّ" کہتے ہیں۔

اللہ رب العزت نے یہاں صرف ﴿اَمۡوَاتٌ﴾ نہیں فرمایا بلکہ ﴿اَمۡوَاتٌ غَیۡرُ اَحۡیَآءٍ﴾ فرمایا ہے کہ اے مشرکو! خدا کو چھوڑ کر جن کی تم پوجا کرتے ہو یہ ایسے مردے ہیں کہ جن میں کبھی روح آئی ہی نہیں ہے۔ تو ان سے مراد نبی نہیں بلکہ یہاں مراد بت ہیں، نبی میں روح آئی اور نکلی اور اس بت میں روح آئی ہی نہیں۔ جس میں روح آئے اور نکل جائے وہ "میت" ہوتا ہے اور جس میں روح آئے ہی نہیں اسے "مَیِّتٌ غَیْرُ حَیٍّ" کہتے ہیں۔ تو یہ آیت بتوں کے بارے میں ہے، یہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں نہیں ہے۔

اور یہ جو آپ کہتے ہیں کہ ﴿مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ﴾ میں اللہ کے ماسوا انسان، نبی، فرشتہ اور جن سب شامل ہیں تو میں نے کہا کہ کچھ غور کریں کہ ﴿مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ﴾ کا کلہاڑا کس پر چلا رہے ہیں؟ ﴿مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ﴾ کو اتنا عام نہ کریں ورنہ نقصان ہو گا۔ کہنے لگے کہ وہ کیسے؟ میں نے کہا: قرآن کریم میں ہے:

﴿اِنَّکُمۡ وَ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ حَصَبُ جَہَنَّمَ ؕ﴾[39]

اے مشرکو! تم بھی اور اللہ کے علاوہ جس کو تم پکارتے ہو وہ سارے جہنم کا ایندھن ہو۔

اگر ﴿مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ﴾ میں نبی مراد ہے العیاذ باللہ تو نبی کو جہنم کا ایندھن کہہ سکتے ہو؟ اگر ﴿مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ﴾ میں مراد فرشتے ہوں تو فرشتوں کو جہنم والا کہہ سکتے ہو؟ میں نے کہا کہ ﴿مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ﴾ سے مراد نبی نہیں بلکہ مراد بت ہیں کہ یہ مشرکین خود بھی جہنم میں جائیں گے اور جن بتوں کی وہ پوجا کرتے ہیں وہ بت بھی جہنم میں جائیں گے۔

میں نے ان سے کہا کہ اپنے عقیدے کی بہت اصلاح فرمایا کریں۔ مجھے کہنے لگے: اچھا! اگر اس سے مراد بت ہوں تو پھر یہ جو اللہ نے فرمایا ہے کہ ان کو پتا نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے؟ کیا بت بھی اٹھائے جائیں گے؟ میں نے کہا: اٹھائے جائیں گے۔ کہنے لگے کہ کہاں لکھا ہے؟ میں نے کہا: قرآن میں ہے:

﴿اِنَّکُمۡ وَ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ حَصَبُ جَہَنَّمَ ؕ﴾

کہ اے مشرکو! تم بھی اور خدا کے علاوہ جن کی تم پوجا کرتے ہو تم سب جہنم کا ایندھن ہو!

بت پہلے سے تو جہنم میں نہیں جائے گا، البتہ یہاں سے اٹھے گا تو جہنم میں جائے گا۔ تو مشرک نے بھی وہیں جانا ہے اور اس کے بت نے بھی وہیں جانا ہے۔

میں بار بار عقائد پر اس لیے بات کرتا ہوں کہ عقائد کے معاملے میں آپ دل بڑا رکھا کریں، ہمارے عقائد قرآن و سنت کے بالکل موافق ہیں۔

39۔ الانبیاء 98:21

تقلید کا ثبوت:

﴿وَ مَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡهِمۡ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۳﴾﴾

توجہ رکھنا! ہم تقلید کو مانتے ہیں، اس پر دلیل یہی آیت ہے۔ اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے آپ سے پہلے بھی انسانوں ہی کو نبی بنا کر بھیجا ہے۔ اگر تمہارے پاس علم نہیں ہے تو اہلِ علم سے پوچھ لو۔

آدمی کے پاس دلیل نہ ہو تو اہلِ علم سے پوچھنا اسی کا نام ”تقلید“ ہے۔

ایک شخص مجھ سے کہنے لگا کہ اگر تقلید کا حکم قرآن میں ہے تو تقلید کا لفظ قرآن میں دکھاؤ؟ میں نے کہا کہ تم اللہ کو ایک مانتے ہو؟ کہا: جی ہاں، ایک مانتا ہوں۔ میں نے کہا کہ اللہ کو ایک ماننے کو کیا کہتے ہیں؟ کہتا ہے: ”توحید“۔ میں نے کہا کہ پورے قرآن میں مجھے توحید کا لفظ دکھا دیں؟ اس نے کہا: نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ پھر توحید کو ماننا چھوڑ دے! کہتا ہے کہ توحید کا لفظ نہیں ہے لیکن توحید کا معنی تو موجود ہے۔ میں نے کہا کہ تقلید کا لفظ تو نہیں ہے لیکن تقلید کا معنی تو موجود ہے۔ ہم تقلید کرتے ہیں اور تقلید کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔

عالم باعمل سے مسئلہ پوچھیں:

اس پر ایک چھوٹا سا نکتہ ذہن نشین فرمالیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ﴾

اگر تمہارے پاس علم نہیں ہے تو ﴿فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ﴾ اہل ذکر سے پوچھ لو، یہاں یہ نہیں فرمایا کہ اہلِ علم سے پوچھ لو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر اہلِ علم سے نہیں پوچھنا بلکہ ایسے اہلِ علم سے پوچھو

جو اہلِ علم بھی ہو اور اہل ذکر بھی ہو۔ کیا مطلب کہ علم بھی ہو اور علم یاد بھی ہو۔ جس کو علم یاد ہو وہ گناہ نہیں کرتا۔ علماء فرماتے ہیں کہ اس کے پاس علم بھی ہو اور عمل بھی ہو۔ جو خود نہیں بچتا وہ قوم کو کیسے بچائے گا؟ اگر میں خود نماز نہیں پڑھتا تو تمہیں کیسے سمجھاؤں گا؟ میری اپنی شلوار ٹخنوں سے نیچے ہے تو تمہاری کیسے اوپر کراؤں گا؟ میری اپنی ڈاڑھی پوری نہیں ہے تو تمہاری کیسے رکھواؤں گا؟ میرے گھر میں ٹی وی ہے تو تمہاری جان ٹی وی سے کیسے چھڑاؤں گا؟ میری اپنی بیوی پردہ نہیں کرتی تو تمہیں کیسے پردہ سمجھاؤں گا؟ میں خود سود کھاؤں گا تو تمہیں کیسے بتاؤں گا کہ سود حرام ہے؟ اس لیے فرمایا کہ علم اس سے پوچھو جس کے پاس علم بھی ہو اور عمل بھی ہو۔

حدیث حجت ہے:

﴿وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡہِمۡ وَ لَعَلَّہُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۴۴﴾﴾

اے میرے پیغمبر! ہم نے آپ کی طرف قرآن اتارا تاکہ آپ ان کو معنی سمجھائیں! معلوم ہوتا ہے کہ معنی وہ ہے جو نبی کا فرمان ہو۔

ہم قرآن بھی مانتے ہیں اور حدیث بھی مانتے ہیں۔ اسے علماء کی زبان میں ”حجیت حدیث“ کہتے ہیں۔ ہم قرآن کو بھی دلیل مانتے ہیں اور حدیث کو بھی دلیل مانتے ہیں۔

بچی کی پیدائش اور مشرکین مکہ کی حالت:

﴿وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُہُمۡ بِالۡاُنۡثٰی ظَلَّ وَجۡہُہٗ مُسۡوَدًّا وَّ ہُوَ کَظِیۡمٌ ﴿۵۸﴾﴾

ان آیات میں مشرکینِ مکہ کی بری عادت کو بیان کیا ہے کہ ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوتا تو بڑے خوش ہوتے اور اگر لڑکی پیدا ہوتی تو ان کا چہرا سیاہ ہو جاتا اور وہ دل ہی

دل میں کڑھتے رہتے، ﴿يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ﴾ اس خوشخبری کو برا سمجھ کر لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ کسی کو پتا نہ چلے کہ ان کے ہاں بچی پیدا ہوئی ہے، اور پریشان ہوتے کس بات پر ہیں؟ ﴿اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ؕ﴾ اس بات پر کہ ذلت برداشت کر کے اس بچی کو رکھ لوں یا اس کو زندہ درگور کر دوں؟

اللہ نے ان کی مذمت بیان کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آج بھی بچے کی پیدائش پر خوش ہونا اور بچی کی پیدائش پر غمگین ہونا یہ مؤمن کا کام نہیں ہے، یہ مشرک کا کام ہے۔

اور آپ حیران ہوں گے کہ مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "معارف القرآن" میں ایک عجیب نکتہ لکھا ہے بلکہ انہوں نے تو حدیث کا حوالہ بھی دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک حدیث میں ہے کہ ایسی عورت جس کے ہاں پہلی بچی پیدا ہو تو یہ عورت برکت والی ہے۔ کیوں کہ جب اللہ نے قرآن مجید میں بچی کی پیدائش کی بات کی ہے تو بیٹوں اور بیٹیوں کی اللہ نے ترتیب یہ بیان کی ہے:

﴿يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ﴿٤٩﴾ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿٥٠﴾﴾ [40]

ترتیب یہ بتائی کہ اللہ جسے چاہیں بیٹیاں دیں، جسے چاہیں بیٹے دیں، جسے چاہیں بیٹیاں اور بیٹے دونوں دیں اور جسے چاہے بانجھ کر دیں۔

اللہ تعالی نے بات بیٹی سے شروع کی ہے۔ جس عورت کے ہاں پہلی بیٹی پیدا ہو وہ زیادہ سعادت مند ہے اور ہم ہیں کہ بیٹی کی پیدائش پر پریشان ہیں، بیٹے کی پیدائش

40۔ الشوریٰ 42:49، 50

پر خوش ہیں۔ بیٹے کی پیدائش پر خوش ہونا اور بیٹی کی پیدائش پر پریشان ہونا یہ مؤمن کا کام نہیں ہے، یہ مشرک کا کام ہے۔ ہم پریشان اس وجہ سے ہیں کہ ہم نے نکاح کو اتنا مہنگا کر دیا ہے کہ اب بیٹی کی پیدائش پر پریشان ہوتے ہیں کہ بارات سنبھالنا پڑے گی، جہیز دینا پڑے گا.... تو دو بیٹیوں کے نکاح کیسے کروں گا؟ لیکن اگر سنت عمل پر آجاتے نہ بارات نہ جہیز بلکہ سادہ سادہ نکاح کرتے تو اللہ کی قسم بیٹی کے حوالے سے گھر رحمت کا گہوارہ بن جاتا زحمت کا گھر کبھی نہ بنتا۔ مشکل ہم نے خود پیدا کی ہے، شریعت کا قصور تو نہیں ہے۔

میں ایک بات عرض کرتا ہوں آپ ذہن میں رکھ لیں! ہمارے ہاں عموماً مزاج یہ ہے کہ جس عورت کے ہاں ایک دو تین چار بیٹیاں پیدا ہوں تو ہم اس عورت کو منحوس سمجھتے ہیں اور اس پر مشورے شروع کر دیتے ہیں کہ اس کو طلاق دے دیں، کیوں کہ اس کے ہاں بیٹا پیدا نہیں ہوا، اس کی بیٹیاں ہی پیدا ہوتی ہیں حالانکہ اگر عورت کے ہاں بیٹا پیدا نہ ہو تو اس میں عورت کا قصور تو نہیں ہے، اگر مقدر میں بیٹا ہو گا تو بیٹا پیدا ہو گا، مقدر میں بیٹی ہو گی تو پھر بیٹی پیدا ہو گی۔

قصور تیرا ہے یا میرا!

شاید آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے اس پر آپ کی خدمت میں ایک واقعہ پیش کیا تھا کہ ایک آدمی ابو حمزہ تھا، اس کی بیوی کے ہاں پہلی بیٹی، دوسری بیٹی، تیسری بیٹی، چوتھی بیٹی پیدا ہوئی۔ اس نے ارادہ کیا کہ میں بیوی کو فارغ کر دوں۔ اس لیے اس نے گھر میں آنا چھوڑ دیا۔ بیوی اس کی سمجھدار تھی اور بلا کی شاعرہ تھی، اس بیوی نے اپنے شوہر کے نام پر ایک خط لکھا:

مَا لِأَبِيْ حَمْزَةَ لَا يَأْتِيْنَا غَضْبَانَ أَنْ لَّا نَلِدَ الْبَنِيْنَا

ہمارے شوہر ابو حمزہ کو کیا ہو گیا کہ ہمارے پاس نہیں آتے، وہ ناراض ہو گئے

کہ ہمارے ہاں بیٹا نہیں ہوتا۔

تَاللّٰهِ مَا ذٰلِكَ فِيْ أَيْدِيْنَا فَنَحنُ كَالْأَرْضِ لِزَارِعِيْنَا

اللہ کی قسم! یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے، ہماری مثال زمین کی ہے اور تمہاری مثال کسان کی ہے۔

وَإِنَّمَا نَأْخُذُ مَا أُعْطِيْنَا وَنُنْبِتُ مَا ذَرَعُوْهُ فِيْنَا

زمین اسی بیج کو لیتی ہے جو بیج کسان ڈالتا ہے اور زمین وہی پودا اگاتی ہے جو کسان نے بیج ڈالا ہوتا ہے۔

ابو حمزہ! اب بتا کہ یہ میرا قصور ہے یا تیرا قصور ہے؟[41]

یونیورسٹی کے ایک پروفیسر صاحب ہیں وہ آج ہمارے ہاں جمعہ میں آئے اور کہہ رہے تھے کہ ہم نے دنیا ٹی وی پر آپ کے درس میں آپ سے یہ اشعار سنے تھے، وہ شعر آپ مجھے لکھ کر دے دیں۔

اور مجھے بڑا تعجب ہوا کہ ایک عالم ہیں، مجھ سے بیعت ہیں اور ضلع اوکاڑہ میں ہوتے ہیں۔ وہ مجھے کہہ رہے تھے کہ ہم نے آپ کا دنیا ٹی وی والا درس ڈاؤن لوڈ کیا ہے اور میں نے کچھ خواتین کو دیا سکول میں اور میں نے کہا کہ ہمارے مولانا کا یہ کلپ سکول میں عورتوں کو سناؤ! اس نے کہا کہ جی یہ کلپ اس لیے مقبول نہیں کہ یہ ایک عالم کا ہے۔ اگر یہ کسی اسکول ٹیچر، پروفیسر یا ڈاکٹر کا ہوتا تو لوگ کہتے کہ دیکھو! کتنا بڑا آدمی ہے یہ، کتنی نکتے کی بات کی ہے! لیکن اب یہ نکتہ نکتہ کیوں نہیں بن رہا اس لیے کہ یہ پروفیسر کا نہیں بلکہ مولوی کا کلپ ہے۔ انہوں نے بتایا کہ عورتوں نے کہا: اگر یہ کوئی کالج کا پروفیسر ہوتا تو لوگ کہتے کہ یہ عورتوں کے حقوق کے بارے میں بات کرتا ہے۔

41۔ تفسیر الشعراوی: ج1 ص4942 باب 59، وغیرہ

تلاوت سے پہلے تعوذ کا حکم:

﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿٩٨﴾﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب قرآن مجید کی تلاوت کرنے لگو تو "أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" پڑھ لیا کرو۔

جان اور ایمان کے دشمن سے بچاؤ کا طریقہ:

قرآن پڑھنے سے پہلے "أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ" پڑھنے کی بات کیوں کی ہے؟ اس لیے کہ انسان کے دشمن دو ہیں:

1: انسان

2: شیطان

چونکہ دشمن دو ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اپنے ان دونوں دشمنوں سے بچو! جو کافر انسان؛ مسلمان کا دشمن ہے اس سے بچنے کے لیے اللہ نے مسلمان کو جہاد کی نعمت عطا کی ہے اور جو شیطان ہمارا دشمن ہے اس سے بچنے کے لیے اللہ نے تعوذ کی نعمت ہمیں عطا فرمائی ہے۔ جہاد کریں گے تو کافر دشمن سے بچ جائیں گے جو انسان ہے اور اعوذ باللہ پڑھیں گے تو شیطان سے بچ جائیں گے جو بے ایمان ہے۔ اللہ چاہتے ہیں کہ انسان کی جان کی بھی حفاظت ہو اور انسان کے ایمان کی بھی حفاظت ہو۔ لہذا جہاد بھی ضروری ہے اور تعوذ بھی ضروری ہے۔

کافر انسان چونکہ نظر آتا ہے اس کو آدمی طاقت سے روک سکتا ہے اور شیطان ایسا کافر ہے جو نظر نہیں آتا اس لیے اس کو اعوذ باللہ پڑھ کر اللہ کی غیبی طاقت سے روکا جائے گا۔ شیطان کو روکنے کے لیے غیبی طاقت چاہیے کیونکہ جب شیطان نظر نہیں آ رہا تو غیبی طاقت کی ضرورت ہے۔

دل میں ایمان ہو تو کلمہ کفر کہنے کا حکم:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱۰۶)﴾

حضرت عمار رضی اللہ عنہ ؛ حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں اور حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کی بیوی حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا مکہ مکرمہ میں تھیں، غلامی کی زندگی تھی، جب مسلمان ہو گئیں تو کافروں نے سزائیں دینا شروع کیں۔ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیہ اور مسلمان عورت ہیں۔ جب دشمن نے سزا دی تو ایک ٹانگ ایک اونٹ سے باندھی اور دوسری ٹانگ دوسرے اونٹ سے باندھی اور اونٹوں کو مخالف سمت میں چلایا تو حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کے جسم کے دو ٹکڑے ہو گئے لیکن اس شہیدہ نے اپنی زبان سے کلمہ کفر نہیں کہا۔

ہمارے اسلام کا سب سے پہلا شہید مرد نہیں بلکہ عورت ہے، ان کے شوہر حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کو دشمن نے اتنا مارا کہ انہوں نے جان دے دی لیکن اپنی زبان سے کلمۂ کفر نہیں کہا۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ ان کے بیٹے تھے۔ جب انہیں مارا اور جان سے مارنے کی دھمکی دی تو حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے اپنی زبان سے ایسے کلمات کہہ دیے جو ایمان والے نہیں تھے، جان بچ گئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کی: یارسول اللہ! ابو شہید ہو گئے، اماں بھی شہید ہو گئی اور میں بچ گیا ہوں، میں نے کچھ کلمات زبان سے کہہ دیے ہیں جو مجھے نہیں کہنے چاہیے تھے تو میرے لیے کیا حکم ہے؟ اللہ نے ان کی تسلی کے لیے قرآن اتارا ہے، فرمایا:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ

بِالْاِیْمَانِ﴾

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: عمار! تمہارے دل میں ایمان تھا؟ کہا: حضور! دل میں ایمان تھا، میں نے بچنے کے لیے زبان سے کہا تھا۔ تو اللہ نے صفائی میں قرآن کی آیت نازل کر دی، فرمایا اس سے کہہ دو کہ تمہارا ایمان بالکل ٹھیک ہے۔

جان بچانے کے لیے کلمۂ کفر کہنے کی شرائط:

یہاں اچھی طرح مسئلہ ذہن نشین فرمالیں! ایک مسئلہ ہے ایمان کا، ایک مسئلہ ہے اعمال کا۔ اگر آدمی کو یہ خطرہ ہو کہ اگر میں نے زبان سے کلمۂ کفر نہ کہا تو میری جان چلی جائے گی یا میرا کوئی عضو ختم ہو جائے گا تو اگر اس نے اپنی جان بچانے کے لیے زبان سے کلمۂ کفر کہہ دیا بشرطیکہ اس کے دل میں ایمان ہو تو شریعت نے اس کی اجازت دی ہے۔ اجازت کا معنی یہ نہیں کہ ضرور کریں لیکن اگر ایمان پر جان دے اور شہید ہو جائے تو یہ عزیمت اور بڑا مرتبہ ہے۔ اگر جان بچالی اور کلمۂ کفر کہہ دیا تو یہ رخصت کا مرتبہ ہے۔ رخصت کی شریعت میں گنجائش موجود ہے۔

لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ جس آدمی نے دھمکی دی ہے وہ واقعی جان سے مارنے پر قادر بھی ہو، اس کے پاس طاقت بھی ہو اور آپ کو پورا یقین بھی ہو کہ مار دے گا، ایسے نہیں کہ کوئی ہلکی سی دھمکی دے دے اور آپ زبان سے کلمۂ کفر شروع کر دیں۔

دو قسم کے اعمال کے نفاذ و عدمِ نفاذ کا مسئلہ:

ایمان کے علاوہ جو ہمارے مسائل ہیں وہ دو قسم کے ہیں:

بعض کلمات وہ ہیں کہ زبان سے کہنے سے بندے کو کچھ نہیں ہوتا جب تک آدمی دل سے راضی نہ ہو مثلاً خرید و فروخت کا معاملہ ہے۔ خرید و فروخت مکمل تب ہوتی ہے جب انسان دل سے کرے، صدقہ تب ہوتا ہے جب انسان دل سے کرے،

زکوٰۃ تب ادا ہوتی ہے جب انسان دل سے دے وگرنہ ادائیگی نہیں ہوتی لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں کہ دل سے راضی نہ بھی ہو محض زبان سے کہہ دے تب بھی ہو جاتی ہیں۔ حدیث مبارک میں تین چیزیں بیان فرمائی گئی ہیں:

"ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَهَزْلُهُنَّ جِدٌّ النِّكَاحُ وَالطَّلَاقُ وَالرَّجْعَةُ." [42]

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر حقیقت میں ہوں تب بھی ہو جاتی ہیں اور اگر مذاق میں ہوں تب بھی ہو جاتی ہیں اور وہ تین چیزیں: نکاح، طلاق اور رجوع ہیں۔

نکاح کے حوالے سے یہ بات ذہن نشین فرمالیں کہ اگر ایک مرد اور ایک عورت اور دو گواہ موجود ہوں اور یہ مذاق مذاق میں ایجاب و قبول کرلیں اور خاوند بیوی بن جائیں تو حقیقتاً نکاح ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر مذاق مذاق میں بیوی سے کہہ دے کہ تجھے طلاق ہے تو بیوی کو طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ ایک شخص کی بیوی عدت میں تھی اور اس نے مذاق میں رجوع کیا تو رجوع ہو جائے گا۔

اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ اگر ایک شخص کسی سے کہے کہ میں تجھے مار دوں گا ورنہ زکوٰۃ مجھے دے دے اور یہ شخص زکوٰۃ ادا بھی کر دے گا تو شرعاً زکوٰۃ ادا نہیں ہو گی کیونکہ زکوٰۃ تب ادا ہو گی جب آدمی دل سے دے اور یہ دل سے نہیں دے رہا اس لیے ادائیگی شمار نہیں ہو گی۔ اگر کوئی شخص کہے کہ یہ مکان مجھے بیچ دے ورنہ میں تجھے مار دوں گا، اگر وہ مجبور ہو کر بیچ بھی دے تو جب تک دل سے نہیں بیچے گا یہ مکان اس آدمی کی ملک میں نہیں آئے گا لیکن اگر کوئی آدمی کسی بندے کے سر پر بندوق رکھے کہ میں تجھے گولی مار دوں گا وگرنہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور یہ مجبور ہو کر طلاق

42۔ سنن ابی داؤد، رقم 2194

دے دے تو بھی طلاق ہو جائے گی کیوں کہ طلاق کا تعلق دل کے ساتھ نہیں بلکہ اس کا تعلق زبان کے ساتھ ہے۔ اس لیے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ طلاق مکرہ یعنی جبر کے ساتھ دی جانے والی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔(آمین)

ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ:

﴿إِنَّ إِبْرٰهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيفًا ؕ وَ لَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰهُ وَ هَدٰىهُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿۱۲۱﴾ وَ اٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَإِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۲۲﴾﴾

ان آیات میں اللہ رب العزت نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام ایک آدمی تھے لیکن پوری جماعت والا کام کیا، خدا نے انہیں فرد نہیں فرمایا بلکہ ابراہیم علیہ السلام کو امت کہا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام اللہ کے فرمانبردار تھے، مشرکین میں سے نہ تھے، اللہ کی نعمتوں کی شکر ادا کرتے تھے، اللہ نے ان کو چن لیا تھا اور انہیں سیدھا راستہ دکھایا تھا۔ ہم نے ان کو دنیا میں بھی نعمتیں دیں اور آخرت میں بھی ان کا شمار ہمارے نیک صالح بندوں میں ہو گا۔

ملت اور امت میں فرق:

اللہ اپنے مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہیں:

﴿أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرٰهِيمَ حَنِيفًا ؕ﴾

میرا ابراہیم اس مقام پر ہے کہ اے پیغمبر! آپ بھی ان کی ملت کی اتباع فرمائیں۔

ملت اور چیز ہے اور امت اور چیز ہے۔ دونوں میں فرق سمجھیں۔ اصولوں

کے مل جانے سے اور اصولوں کے ایک ہونے سے ملت بنتی ہے امت نہیں بنتی اور اصول و مسائل ایک ہوں تو پھر ملت نہیں بلکہ امت بنتی ہے۔ ہم ملت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہیں اور امت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں۔ اصول وہی ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہیں اور اصول و مسائل دونوں وہی ہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں۔

دعوتِ دین کے طریقے:

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾

اس آیت میں اللہ پاک نے دعوت کی ترتیب بتائی ہے کہ جب آپ نے دعوت دینی ہے تو تین طریقے استعمال کریں:

[1]: ﴿بِالْحِكْمَةِ﴾ دلیل سے بات کرو۔

[2]: ﴿الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ فضائل اور ترغیب سے بات کرو۔

[3]: ﴿وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ اور اگر شبہات پیش کیے جائیں تو ان کو اچھے انداز سے رد بھی کرو۔

ایمان و عمل پہ لانا اور بچانا:

ان تین طریقوں کو میں اپنی زبان میں سمجھانے کے لیے دو جملے کہتا ہوں کہ ہمارے ذمے دو کام ہیں:

1: امت کو ایمان واعمال پر لانا۔

2: امت کے ایمان واعمال کو بچانا۔

امت ایمان واعمال پر آتی ہے فضائل سے اور امت کا ایمان واعمال بچتا ہے

دلائل سے، تبلیغ والوں کے ذمے لانا ہے اور ہمارے ذمے بچانا ہے۔

حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ نے جو کام شروع کیا وہ اعمال پر لانے والا ہے اور ہم نے جو کام شروع کیا وہ بچانے والا ہے، لانے والی محنت کرنے والے کا نام حضرت مولانا الیاس دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ہے اور بچانے والی محنت کرنے والے کا نام بھی حضرت تو نہیں لیکن مولوی محمد الیاس گھمن ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

میں رائیونڈ اجتماع پر تھا۔ جیسے علماء میں پیار محبت کی باتیں چلتی ہیں تو مجھے ایک ساتھی نے کہا کہ مولانا صاحب! یہ کام جو آپ کرتے ہو کہ اس عقیدے پر یہ اعتراض ہے اور یہ جواب ہے، یہ اعتراض ہے اور یہ جواب ہے، یہ کہاں لکھا ہے؟ میں نے کہا: جو کام آپ کر رہے ہو وہ کہاں لکھا ہے؟ مجھے کہنے لگے کہ یہ تو قرآن میں ہے۔ میں نے کہا کہ آیت پڑھیں تو انہوں نے یہی آیت پڑھی:

﴿اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ الۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ﴾

میں نے کہا کہ آیت پوری ہو گئی ہے یا کچھ باقی ہے؟ کہنے لگے: آدھی ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ پوری پڑھیں! آگے ہے: ﴿وَ جَادِلۡہُمۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ﴾" میں نے کہا کہ ﴿اُدۡعُ﴾ والا کام آپ کا ہے اور ﴿جَادِلۡہُمۡ﴾ والا کام میرا ہے، ﴿اُدۡعُ﴾ کا معنی لانا ہے اور ﴿جَادِلۡہُمۡ﴾ کا معنی بچانا ہے۔ آپ بڑے ہیں آپ کا ذکر پہلے ہے، ہم چھوٹے ہیں ہمارا ذکر بعد میں ہے۔

رائیونڈ مرکز اور سرگودھا مرکز:

میں نے کہا کہ ہم نے لانا بھی ہے اور بچانا بھی ہے۔ ایک مرکز رائیونڈ بنا ہے اور ایک مرکز آپ کے سرگودھا چک 87 جنوبی لاہور روڈ پر مرکز اھل السنۃ والجماعۃ بنا ہے۔ آپ آج مان لیں تب بھی آپ نے ماننا ہے اور پچاس سال بعد مان لیں تب بھی

آپ نے ماننا ہے۔ ماننا تو ہے ہی، کوئی جلدی مانتا ہے اور کوئی دیر سے مانتا ہے۔ رائیونڈ مرکز کا کام ہے لانا اور ہمارے مرکز کا کام ہے بچانا، لانا بھی ہم نے ہے اور بچانا بھی ہم نے ہے، بتاؤ تبلیغ والے لارہے ہیں یا نہیں؟ (لارہے ہیں۔ سامعین) اور ہم بچارہے ہیں یا نہیں؟ (بچارہے ہیں۔ سامعین) آپ کے پاس ثبوت ہے کہ نہیں ہے آپ پوری دنیا میں جا کر دیکھ لیں۔ دنیا کے جس کونے میں آپ جائیں گے ان شاء اللہ آپ کو وہاں ہماری محنت نظر آئے گی کہ ہم نے امت کو بچایا کیسے ہے۔

فضائل نماز اور نماز اھل السنۃ والجماعۃ:

میں سمجھانے کے لیے کہتا ہوں کہ اگر آپ نے نمازی بنانا ہو تو فضائلِ نماز پڑھیں اور جب نمازی کو بچانا تو پھر تو پھر دلائلِ نماز پڑھیں۔ حضرت شیخ زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب فضائلِ نماز ہے اور میری کتاب دلائلِ نماز ہے، آپ فضائلِ نماز پڑھیں تو امت نماز پر آجائے گی اور جب غیر مقلد کھسر پھسر کریں تو ہماری کتاب "نماز اھل السنۃ والجماعۃ" پیش کریں ان شاء اللہ آپ کے نمازی بچ جائیں گے۔

رائیونڈ جائیں سہ روزہ لگائیں اور کوئی دلیل پوچھے تو آپ کو نہیں آنی۔ یہ میں مذاق نہیں کر رہا، مسجد میں بیٹھ کر کہہ رہا ہوں کہ ماہانہ سہ روزہ کی دلیل تمہیں رائیونڈ مرکز نہیں دے گا، دلائل آپ کو سرگودھا مرکز دے گا۔ نہ یقین آئے تو یہاں بیٹھا ہوا کوئی ایک شخص پیش کر دو جو یہ کہے کہ میں سہ روزہ لگاتا ہوں اور اس کی یہ دلیل ہے۔ہاں وہ یہ تو کہے گا کہ ہمارے بزرگوں کی ترتیب ہے لیکن دلیل اس کے پاس نہیں ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں کی ترتیب ہے اور اس ترتیب پر دلیل یہ ہے! میں اپنے ساتھیوں سے کہتا ہوں کہ ہمارے حضرات جو فرماتے ہیں کہ بزرگوں نے فرمایا.... بزرگوں سے سنا.... تو مخالف اعتراض کرتے ہیں کہ ہم قرآن پیش کرتے

ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ بزرگوں نے فرمایا۔ میں نے کہا کہ ہم قرآن سے ثابت کریں گے کہ بزرگوں کی باتیں بھی ماننی ہیں۔

توڑ نہیں، جوڑ پیدا کریں!

تو ہم نے لانا بھی ہے اور ساتھ بچانا بھی ہے۔ صبح سے لے کر شام تک آپ کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر مال جمع کرتے ہیں اور جب جمع ہو جائے تو کاؤنٹر پر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں؟ (نہیں۔ سامعین) اس جمع کیے ہوئے مال کو اپنے لاک میں رکھتے ہیں، بینک میں رکھتے ہیں، گھر لے کر آتے ہیں۔ تو کمانے کا طریقہ اور ہوتا ہے اور جمع کیے ہوئے مال کو محفوظ کرنے کا طریقہ اور ہوتا ہے۔ لانے والا طریقہ دعوت والا ہے اور بچانے والا طریقہ دلائل والا ہے۔ ہم دونوں کام کرتے ہیں یا ایک کام کرتے ہیں؟ (دونوں کام کرتے ہیں۔ سامعین)

میں ایک جگہ جلسہ پر تھا۔ تو رائیونڈ کا اجتماع ہوتا ہے 6 دن کا اور ہمارا 87 مرکز کا اجتماع ہوتا ہے 6 گھنٹوں کا۔ میں نے کہا کہ آپ 6 دن والا مانتے ہیں اور 6 گھنٹے والا نہیں مانتے! بھائی جب ہم نے چھ دن والا مانا ہے تو آپ چھ گھنٹے والا تو مانیں! اس لیے کہ ہم نے امت کو لے کر چلنا ہے، امت میں توڑ پیدا نہیں کرنا۔ اللہ ہمیں جوڑ کی توفیق عطا فرمائے۔

ایمان و تقویٰ:

﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ الَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝۱۲۸﴾

اس آیت میں اللہ نے یہ بات سمجھائی ہے کہ اللہ کی مدد ان کے ساتھ ہے جو ایمان بھی لائیں اور تقویٰ بھی اختیار کریں۔ دعا کریں کہ اللہ ہمیں ایمان پر ثابت قدمی بھی عطا فرمائے اور تقویٰ کی نعمت بھی عطا فرمائے۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ بنی اسرائیل

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿سُبۡحٰنَ الَّذِىۡۤ اَسۡرٰى بِعَبۡدِهٖ لَيۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ اِلَى الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِىۡ بٰرَكۡنَا حَوۡلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنۡ اٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡبَصِيۡرُ ۝۱﴾

تمہیدی گفتگو:

میں نے سورت بنی اسرائیل کی پہلی آیت تلاوت کی ہے۔ اس سورت میں اللہ نے واقعۂ معراج کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اب مہینہ بھی رجب کا شروع ہے۔ اس لیے اس مناسبت سے معراج کا واقعہ قدرے تفصیل سے پیش کرتا ہوں۔

اس بات میں مؤرخین کا اختلاف ہوا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج کس سال، کس مہینے اور کس تاریخ کو ہوا۔ راجح اور زیادہ قوی رائے یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے گیارھویں سال معراج کے لیے تشریف لے گئے اور گیارھویں سال بھی رجب کا مہینا تھا اور ستائیس تاریخ تھی۔ چونکہ اقوال اس میں کئی ہیں اور ائمہ کا اختلاف بھی ہے اس لیے میں نے آپ کی خدمت میں صرف ایک قول پیش کیا ہے جو راجح اور سب سے بہتر ہے۔

معراج کیوں ہوا؟

پہلی بات تو یہ سمجھیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ رب العزت

نے معراج کیوں کروایا ہے؟ اس کی وجہ کیا ہے؟ اصل میں اللہ رب العزت کا نظام یہ ہے کہ جب کوئی انسان اللہ کے دین کے لیے مشقت برداشت کرتا ہے تو جس قدر مشقت برداشت کرے اللہ اس سے زیادہ اس کو عزتیں دیتا ہے۔ کچھ دیر تو انسان کو مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے لیکن نتیجہ مشقت نہیں بلکہ نتیجہ عزت ہی ہوتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کفارِ مکہ نے ہر قسم کے دکھ کے دروازے کھولے اور راحت کے دروازے بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے خیال کے مطابق وہ جس قدر تکالیف دے سکتے تھے انہوں نے دی ہیں۔ سب سے زیادہ زیادتی کا آخری مرحلہ کسی معزز آدمی کے ساتھ اس کا بائیکاٹ ہوتا ہے۔ اہلِ مکہ نے تین سال تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بائیکاٹ کیا اور شعب ابی طالب میں تین سال تک بند رکھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شعب ابی طالب سے نکلے - آج کی زبان میں اسے جیل کہہ دیں جو بغیر چار دیواری کے تھی - اسی سال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غمخوار بیوی ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا۔

پیغمبر علیہ السلام کی تکالیف:

اب دیکھیں! بناتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم؛ رقیہ، ام کلثوم، اور فاطمہ رضی الہ عنہن چھوٹی چھوٹی بچیاں گھر میں ہیں اور دنیا مخالف ہے، پورے عالم کی فکر ہے، دن رات ایک بندہ کام میں لگا ہو اور ایک غمخوار بیوی گھر میں ہو اور وہ بھی فوت ہو جائے تو انسان کے دل پر کیا گزرتی ہے! اس لیے اس سال کو "عام الحزن" یعنی غم کا سال کہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائف کی طرف تشریف لے گئے۔ اہلِ مکہ بات بھی نہیں سنتے اور دکھ بھی دیتے تھے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سوچا شاید

طائف والے میری بات سمجھ لیں۔ طائف والوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات قبول کرنے کے بجائے مزید ظلم یہ کیا کہ طائف کے اوباش بد معاش لڑکوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے لگا دیا۔ وہ تالیاں بھی پیٹتے تھے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق بھی اڑاتے تھے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو پتھر بھی مارتے تھے جس کی وجہ سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں مبارک خون کی وجہ سے رنگین بھی ہوئے۔

جب نبی کا خون کسی زمین پر گر جائے تو اللہ اس وقت اس زمین والوں کو زندہ نہیں رہنے دیتے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خون گرا ہے اس کے لیے اللہ نے فرشتے بھیجے، فرشتوں نے آکر عرض کیا کہ حضور! آپ اجازت دیں تو ہم ان کو ان دو پہاڑوں کے درمیان پیس کر کے رکھ دیں گے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

میں اللہ سے امید رکھتا ہوں کہ اگر یہ طائف والے مسلمان نہیں ہوئے تو اللہ ان کی اولاد میں ایسے لوگ پیدا فرما دے گا جو اللہ کی عبادت کریں گے۔[43]

اس حالت میں بھی اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کے لیے بد دعا نہیں فرما رہے بلکہ اللہ سے امید لگائے ہوئے ہیں کہ اللہ ان کی اولاد کو اسلام کی توفیق دے گا۔ اس لیے میں ان کے حق میں بد دعا نہیں کرتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں مکہ واپس تشریف لائے تو جب مکہ والوں نے تکلیف دینے کی انتہا کر دی تو اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ اے میرے محبوب! اب میں تمھیں عزت دینے کی انتہا کرتا ہوں۔ انہوں نے سمجھا تھا کہ نام ونشان مٹا دیں گے لیکن ہم فرش پر نہیں بلکہ عرش پر تیرے چرچے کرتے ہیں، یہاں

43۔ فضائل اعمال: ص 11، السیرۃ لابن ہشام: ج 1 ص 384 وغیرہ

فرش پر عداوت ہے آپ عرش پر اپنی عزت دیکھیں! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے لیے جو مشقت برداشت کی ہے اس کے بدلے میں خدا نے یہ اعزاز معراج کی صورت میں بخشا ہے۔

سفر معراج کے دو حصے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کا سفر دو حصوں کا ہے؛ ایک مکہ سے بیت المقدس اور ایک بیت المقدس سے عرش معلیٰ تک۔ مکہ مکرمہ سے بیت المقدس کے اس سفر کو "اسراء" کہتے ہیں جو سورۃ بنی اسرائیل میں ہے اور پھر وہاں سے عرش معلیٰ تک کے سفر کو "معراج" کہتے ہیں جس کا ذکر سورۃ النجم کی پہلی اٹھارہ آیات میں ہے۔

تو یہاں "اسراء" کا ذکر بھی ہے اور معراج کا ذکر بھی ہے لیکن عام طور پر چونکہ مکہ سے بیت المقدس کا سفر زمینی ہے اگرچہ عجیب تر تھا لیکن عجیب شمار نہیں ہوتا اور بیت المقدس سے عرش معلیٰ تک کا سفر عجیب تر ہے اس لیے اس پورے سفر کو اسراء کے بجائے "معراج" ہی کہہ دیتے ہیں۔

معراج جسمانی ہوئی ہے:

بعض لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معراجِ جسمانی کا انکار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ معراج روحانی ہوئی ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم اطہر نہیں گیا بلکہ فقط حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک گئی ہے۔

جبکہ اھل السنۃ والجماعۃ کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف روحانی معراج نہیں بلکہ جسمانی معراج ہوئی ہے، اس لیے کہ روحانی معراج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال نہیں ہے۔ کوئی بندہ یہاں سویا ہوا ہو اور دیکھے کہ میں آسمان پر گیا ہوں، میں عرش پر گیا ہوں، میں مکہ گیا ہوں، میں مدینہ گیا ہوں تو یہ کوئی

کمال نہیں ہے کیوں کہ صرف روح تو عام بندے کی بھی جا سکتی ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اعزاز اور اعجاز یہ ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف روح نہیں بلکہ جسم بھی ساتھ جائے۔ اس لیے ہمارے علماء کہتے ہیں کہ آج کے دور میں جب کوئی کہے کہ ہم معراج مانتے ہیں تو ان سے یہ پوچھیں کہ معراج مانتے ہو یا معراجِ جسمانی مانتے ہو؟ کیوں کہ وہ کہے گا معراج اور نیت کرے گا روحانی کی، جبکہ روحانی پر اختلاف نہیں ہے، اختلاف تو معراجِ جسمانی پر ہے۔

بالکل اسی طرح جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موت کے بعد قبر مبارک میں زندہ ہیں۔ اگر کوئی بندہ کہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زندہ مانتے ہیں تو آپ نے پوچھنا ہے کہ حیاتِ روحانی مانتے ہو یا جسمانی مانتے ہو؟ وگرنہ لوگ دھوکہ دیں گے حیات کہہ کر اور روحانی مان کر ڈنڈی مار جائیں گے۔ معراج کہیں گے اور روحانی مان کر ڈنڈی مار لیں گے۔ ہم وفات کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات بھی جسمانی مانتے ہیں اور مکہ سے عرش تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج بھی جسمانی مانتے ہیں۔

معراج جسمانی پر دلائل:

معراجِ جسمانی پر تو دلائل کئی ہیں، آپ موٹے موٹے دلائل ذہن میں رکھ لیں:

دلیل نمبر1:

اللہ رب العزت اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سفر کو ذکر کرتے ہوئے لفظ ﴿سُبْحٰنَ﴾ کو لائے ہیں۔ لفظ "سبحان" عربی زبان میں وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں کوئی عجیب واقعہ ہو۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کا معراج پر جانا عجیب نہیں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم کا جانا یہ عجیب تر ہے۔ خدا نے لفظ "سبحان" کہہ کر بتایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح نہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم گیا ہے،

روح تو ساتھ ہے ہی۔

دلیل نمبر2:

اللہ نے فرمایا: ﴿اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ﴾ کہ اللہ نے معراج کرایا ہے اپنے عبد کو۔ ”عبد“ صرف روح کا نام نہیں ہے، عبد اس جسم کا نام ہے جس کے اندر روح ہو۔ تو معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم کو خدا نے معراج کروایا ہے۔

یہ دو دلیلیں تو میں نے قرآن سے پیش کی ہیں۔ اب دو دلیلیں احادیث سے ذہن میں رکھ لیں:

دلیل نمبر3:

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج سے واپس تشریف لائے تو حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ مکے والوں میں اپنے سفر کا تذکرہ نہ کیجیے گا، یہ لوگ پہلے آپ کی مخالفت کرتے ہیں ان کو اور موقع ہاتھ میں آجائے گا۔[44]

اگر صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روح گئی تھی تو پھر حضرت ام ہانی کو یہ بات کہنے کی ضرورت کیا تھی؟ اس کا معنی یہ ہے کہ جسم گیا ہے اور اس کو خلافِ عادت سمجھ کر مکہ ولوں نے انکار کرنا ہے۔

دلیل نمبر4:

اور دوسری بات سمجھیں کہ مکہ مکرمہ میں ایک شخص بڑا عقل مند تھا اور اس عقل مند کو ابوالحکم کہتے تھے لیکن بعد میں ابوالحکم کا نام ”ابو جہل“ پڑا اور ایک شخص جسے ابوبکر کہتے تھے اس واقعے کے بعد یہ ابوبکر سے آگے ”صدیق“ بنا ہے۔ یہ صدیق

44۔ تفسیر ابن کثیر: ج4ص112

کیوں بنا ہے اور وہ ابو الحکم کے بجائے ابو جہل کیوں بنا رہا؟ اس لیے کہ جب اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے اور فرمایا کہ میں معراج کر کے آیا ہوں، دیدارِ خدا کر کے آیا ہوں تو ابو جہل نے کہا کہ میری عقل نہیں مانتی، تو جسے ابو الحکم یعنی حکمت والا کہتے تھے اس کا لقب ''ابو جہل''یعنی جہالت والا ہونا چاہیے اور بعد میں ایسا ہی ہوا؛ وہ اپنی عقل سے پرکھ رہا تھا جبکہ نبوت کے معاملات عقل سے نہیں بلکہ خدا کی وحی سے ہوتے ہیں، نبی کا تو کمال یہ ہے کہ جہاں عقل جواب دے دے وہاں سے وحی اپنا کام شروع کرتی ہے۔ ابو جہل نے حضرت ابو بکر سے کہا کہ اگر کوئی شخص یہ بات کہے کہ میں ایک رات میں عرش پر گیا اور واپس آیا ہوں تو کیا آپ مان لیں گے؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یہ بتاؤ یہ بات کہی کس نے ہے؟ اس نے کہا کہ آپ کے یار نے کہا ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یار نے کہا ہے تو پھر سچ ہے، پھر وہ واقعی ہو کر آئے ہیں۔

اگر روحانی معراج تھی تو پھر جھگڑا کیوں تھا؟ یہ جھگڑا تو اس پر تھا کہ جسمانی معراج ہوئی ہے۔ اگر میں آپ سے کہہ دوں کہ رات کو میں سویا تھا، خواب میں میں نے وہ جگہ دیکھی ہے جہاں سے سورج نکلتا ہے، پھر میں مدینہ میں گیا، پھر میں مکہ میں گیا۔ آپ کو کوئی بھی تعجب نہیں ہونا لیکن اگر میں کہوں کہ صبح جہاں سے سورج نکلتا ہے میں وہاں گیا، جہاں ڈوبا تھا وہاں گیا، پھر فلاں جگہ گیا، پھر فلاں جگہ گیا، ایک دن میں اتنا لمبا سفر کیا ہے تو اب آپ کو یقیناً تعجب ہو گا کہ یار مولانا صاحب کیسی بات کر رہے ہیں؟

تعجب تبھی ہوتا ہے کہ جب نبی کا معراج جسمانی مانیں، روحانی مانیں تو پھر تعجب کی بات ہی نہیں ہے۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج جسمانی ہے۔

صفتِ عبد تمام صفات میں افضل ہے:

تیسری بات سمجھیں! اللہ رب العزت نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو

معراج کرایا ہے۔ پیغمبر میں ایک صفت نہیں ہے کئی ان گنت اوصاف ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک کمال نہیں ہے بلکہ بے شمار کمالات موجود ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خصوصیت نہیں ہے بلکہ رسالت کے کئی خصائص ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف میں سے سب سے بہتر وصف کا تذکرہ کیا۔ فرمایا: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ﴾ یہاں "بِعَبْدِہٖ" فرمایا ہے، "بِنَبِیِّہٖ" نہیں فرمایا۔ کیوں کہ اللہ نے اپنے نبی کے سب اوصاف میں سب سے بہتر وصف "عبودیت" کو ذکر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں جتنی صفتیں آتی ہیں ان تمام صفات میں بہتر صفت عبودیت یعنی عاجزی اور تواضع ہے۔ اب اس کو حدیث مبارک کی روشنی میں سمجھیں۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ"[45]

کہ جب انسان عاجزی اختیار کرتا ہے تو اللہ اتنی ہی بلندیاں عطا فرماتے ہیں۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر دنیا میں متواضع کوئی نہیں اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر خدا نے دنیا میں بلندی بھی کسی کو عطا نہیں فرمائی ہے۔

انسان میں جس قدر تواضع بڑھتی جائے گی اللہ اسی قدر لوگوں کے دلوں میں اس کا احترام بھی بڑھاتے جائیں گے اور بندہ جس قدر تکبر کرتا چلا جائے گا تو اللہ اسی قدر اس کو فنا کرتے چلے جائیں گے۔

اس امت کے متواضع کے ہاتھوں امت کے متکبر کا قتل:

اس سے آپ ایک چھوٹی سی بات سمجھیں! اس امت کا فرعون ابوجہل ہے۔ ابوجہل میں کبر اور تکبر کی انتہا ہے۔ دنیا میں اگر کسی نے اکڑ والے لوگ دیکھے ہوں تو

45۔ المعجم الاوسط للطبرانی: ج3 ص382 رقم الحدیث 4894

شاید ابو جہل سے زیادہ اکڑنے والا کوئی نظر نہ آئے۔ یہ بے ایمان فرعون سے بھی زیادہ متکبر تھا۔ جب فرشتے فرعون کی موت کا پیغام لے کر آئے، فرعون جب مرنے اور پانی میں بہنے لگا تو اس نے بھی کہا تھا: ﴿اٰمَنۡتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیۡۤ اٰمَنَتۡ بِهٖ بَنُوۡۤا اِسۡرَآءِیۡلَ ﴿۹۰﴾﴾ کہ میں اب ایمان لاتا ہوں۔ اللہ نے فرمایا: ﴿آٰلۡـٰٔنَ وَ قَدۡ عَصَیۡتَ قَبۡلُ وَ کُنۡتَ مِنَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۹۱﴾﴾ [46] کہ اب کلمہ پڑھتا ہے، عذاب کو دیکھ کر کلمہ پڑھتا ہے، پہلے کلمہ کیوں نہیں پڑھا؟ فرعون متکبر تھا لیکن عذاب کو دیکھ کر وہ بھی کلمہ پڑھنے لگا لیکن ابو جہل کی گردن کاٹی جارہی ہے، عذاب میں مبتلا ہے، جہنم میں داخل ہونے لگا ہے لیکن اس بے ایمان نے اس وقت بھی حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا: او چرواہے! تو میرے سینے پر چڑھ کر بیٹھا ہے، دنیا میں اس سے بڑھ کر تیرے لیے اعزاز کیا ہے کہ تو چرواہا ہو کر سردار کے سینے پر بیٹھا ہے۔ تو اپنی تلوار سے مجھے نہ مارنا! لوگ طعنہ دیں گے کہ چرواہے کی تلوار سے کٹا ہے، یہ میری تلوار پکڑ اور اس سے مجھے قتل کر!

آپ اندازہ کریں کہ ابو جہل نے متکبرانہ انداز میں کہا کہ میری تلوار سے مجھے قتل کر تا کہ لوگ طعنہ نہ دیں کہ چرواہے کی تلوار سے سردار کا قتل ہوا تھا۔ پھر ابو جہل نے کہا کہ گلہ ادھر اوپر سے نہیں بلکہ ذرا نیچے سے کاٹنا تا کہ پتا چلے کہ سردار کا سر پڑا ہے اور کہا کہ عبد اللہ! جا کر اپنے ساتھی (رحمتِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہنا کہ جتنی مجھے تجھ سے دنیا میں نفرت تھی آج اس سے بھی زیادہ ہے العیاذ باللہ۔ [47]

اللہ کی شان دیکھیں! ابو جہل سے زیادہ متکبر کوئی نہیں اور عبد اللہ بن مسعود

46۔ یونس 91:10

47۔ سیرۃ المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم: ج2 ص98

رضی اللہ عنہ وہ صحابی ہیں کہ جن کے بارے میں روایات میں ہے کہ اگر ایسے شخص کو دیکھنا ہو کہ جس کے دل میں کبر کا نام ونشان تک نہ ہو تو عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو دیکھ لو! جو آدمی عبودیت کے اعلیٰ مقام پر تھا خدا نے اس سے اس شخص کو قتل کروایا ہے جو تکبر کے آخری مقام پر تھا۔ اللہ کا نظام یہ ہے کہ جب انسان اکڑتا ہے اللہ اسے ہلاک کر دیتے ہیں۔ دعا کریں اللہ رب العزت ہمیں کبر سے محفوظ فرمائے، اللہ ہمیں عاجزی عطا فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)

تو میں کہہ رہا تھا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف میں سے صفتِ عبد کو خدا نے ذکر فرمایا کہ میں نے اپنے محبوب کو معراج کرایا ہے، یہ میرا محبوب بھی ہے اور عبد بھی ہے۔

حدیث مبارک میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب کھانے کے لیے بیٹھتے تو ایسے بیٹھتے جیسے غلام بیٹھتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"آكُلُ كَمَا يَأْكُلُ الْعَبْدُ." [48]

کہ میں ایسے کھاتا ہوں جیسے غلام کھاتا ہے۔

ام ہانی کے گھر سے سفر کی ابتدا:

چوتھی بات سمجھیں! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج پر تشریف لے جانے لگے تو حضرت ام ہانی کے گھر سوئے ہیں، جبرائیل امین چھت پھاڑ کر آئے ہیں دروازے سے نہیں آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھایا اور کعبہ لے گئے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم حطیمِ کعبہ میں سو گئے۔ وہاں سے ان کو جگایا اور زم زم کے کنویں کے پاس لے گئے۔ وہاں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک سینہ کو شَق کیا

48۔ شعب الایمان للبیہقی: ج5 ص107 رقم الحدیث 5975

اور قلبِ اطہر کو نکال کر زم زم کے پانی سے دھویا اور سونے کا طشت جنت سے لائے تھے، اس میں ایمان اور حکمت بھرا ہوا تھا وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر میں ڈالا، پھر سینہ مبارک کو بند کیا، پھر براق سواری پر بٹھایا۔ حضرت جبرائیل نے لگام پکڑی ہے اور حضرت میکائیل نے رِکاب تھامی ہے۔ اس اعزاز کے ساتھ لے جارہے ہیں۔ ایک طرف جبرئیل اور ایک طرف میکائیل ہے۔

حضرت ام ہانی کے گھر جب جبرائیل آئے تو دروازے سے نہیں آئے چھت پھاڑ کر آئے ہیں یہ بتانے کے لیے کہ آج کے سارے معاملات عادت سے ہٹ کر ہیں، یہ روٹین کی زندگی نہیں ہے، یہ روٹین سے بالکل مختلف ہے۔ حضور! آپ ذہنی طور پر تیار ہو جائیں۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم حطیمِ کعبہ کے بجائے حضرت ام ہانی کے گھر سے بھی جاسکتے تھے لیکن اللہ نے حضرت ام ہانی کے گھر کے بجائے کعبہ سے معراج کا آغاز کروا کر یہ بتایا کہ جس مقام سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کا آغاز ہوا ہے اس کا نام کعبہ ہے اور جہاں پر اختتام ہوا ہے اس کا نام عرشِ معلیٰ ہے۔

"کعبہ" مکانِ اول کا نام ہے اور "عرش" مکانِ آخر کا نام ہے۔ یہ بتانے کے لیے کہ جس طرح کعبہ سے مکانات کی ابتدا ہے اور عرش پر مکانات کی انتہا ہے اسی طرح میرے محبوب سے مقامات کی ابتدا ہے اور میرے محبوب پر مقامات کی انتہا ہے، عرش سے اوپر مکان نہیں ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کا مقام نہیں ہے، عرش پر مکانات کی انتہا ہوتی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مقامات کی انتہا ہے۔

محدثین نے لکھا ہے کہ اس سے یہ بھی پتا چلا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں۔ کیوں کہ اگر اس کے بعد کوئی اور مقام ہوتا تو اللہ وہاں تک بھی لے کر جاتے، مقامات سارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کرا دیے۔ فرمایا کہ نبیوں کو

مقامات دیے ہیں لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سارے مقامات ختم کر کے بتا دیا کہ اس کے بعد نہ کوئی نبی آئے گا اونہ اس کے بعد کوئی مقام ہے اور نہ ہی کوئی مکان ہے۔

حطیمِ کعبہ سے سفر کی ابتدا کی وجہ:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج کے لیے گئے ہیں تو کعبہ کے دو حصے ہیں؛ ایک جو تعمیر شدہ ہے اور ایک حطیمِ کعبہ ہے جو تعمیر شدہ نہیں ہے، ثواب میں دونوں برابر ہیں لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ ایک کمرہ بنا ہوا ہے اور ایک کی دیوار پانچ فٹ کے قریب ہے۔ اس پر تین فانوس بھی لگے ہوئے ہیں۔ ایک راستہ آنے کا اور ایک راستہ جانے کا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ وہاں سے لے جا سکتے تھے جو حصہ تعمیر شدہ ہوا ہے لیکن وہاں سے لے گئے جو تعمیر شدہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے ہم غریبوں اور مسکینوں پر کرم فرمایا ہے کہ اگر کعبہ کے چھتے ہوئے حصے سے جاتے تو میں اور آپ چاہتے کہ وہ جگہ دیکھیں جہاں سے حضور گئے تھے، وہاں کے منتظمین نے کہنا تھا کہ یہ دروازہ صدر اور وزیر کے لیے کھلتا ہے ہر بندے کے لیے نہیں کھلتا، اللہ نے اس جگہ کے بجائے اس مقام سے معراج کرایا ہے جو غریبوں کی جگہ ہے، نہ آنے پر پابندی ہے نہ جانے پر پابندی ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

اللہ رب العزت نے مساکین کا کتنا خیال فرمایا ہے!

زمزم کے پانی سے قلبِ اطہر دھونے میں حکمت:

پھر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا شقِ صدر ہوا۔ زم زم کے پانی سے اللہ کے رسول کے قلبِ اطہر کو دھویا گیا۔ یہاں محدثین نے مستقل بحث چھیڑی ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر کو دھونے کے لیے وہاں سے آب کوثر کا پانی آ سکتا تھا، آب کوثر کے بجائے زم زم کے پانی کا استعمال کیوں ہوا؟ حکیم الامت

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ زم زم کا پانی آبِ کوثر سے بھی افضل ہے اس لیے آب کوثر کے بجائے زم زم کے پانی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر کو دھویا۔

براق کی رفتار:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری براق کے بارے میں آیا ہے کہ اتنی تیز رفتار تھی کہ جہاں نگاہ پڑتی وہیں اس کا قدم پڑتا تھا۔ کوئی شخص کہے کہ اتنی تیز رفتار تھی؟ ہم نے کہا کہ نام دیکھ کے تو سمجھ آ جانی چاہیے کہ اتنی تیز رفتار کیوں ہے؟ "براق" "بَرْقٌ" سے ہے، برق کا معنی بجلی ہے، دنیا کی بجلی میں رفتار کتنی ہے! آپ بتائیں کہ پشاور میں آپ بٹن آن کریں تو کراچی میں لائٹ جل جاتی ہے، یہ تو دنیا کی بجلی ہے جو ایک سیکنڈ میں ہزاروں کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتی ہے اور یہ تو جنت کی تھی۔ اگر وہ ایک سیکنڈ میں کروڑوں کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لے تو یہ عقل کے خلاف نہیں ہے۔

ایمان و حکمت سے قلب کو بھرنا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سونے کا طشت لایا گیا تھا جس میں ایمان اور حکمت تھی۔ اس کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر میں ڈال دیا گیا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اپنی کتاب "نشر الطیب بذکر النبی الحبیب صلی اللہ علیہ وسلم" میں لکھتے ہیں کہ کسی بندے کے ذہن میں سوال آتا ہے کہ سونے کے برتن کو استعمال کرنا تو جائز ہی نہیں ہے تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس کا استعمال کیسے ہوا؟

حضرت فرماتے ہیں کہ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ مکہ میں استعمال ہوا اور سونے کے برتن کے استعمال پر پابندی مدینہ منورہ میں ہوئی۔

اور دوسرا جواب یہ دیا کہ سونے کا برتن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال نہیں فرمایا بلکہ ملائکہ نے استعمال کیا ہے۔ یہ حکم انسانوں کے لیے ہے ملائکہ کے لیے نہیں ہے۔

اور تیسرا جواب یہ دیا ہے کہ یہ سارے معاملات معراج کے لیے تھے جو امورِ آخرت سے تعلق رکھتے تھے اگرچہ اس عالم میں تھے لیکن تھے اگلے عالم کے، اور جب ہم اگلے عالم میں جائیں گے تو وہاں سونے کا استعمال مرد بھی کریں گے اور عورتیں بھی کریں گی، نبوت نے کرلیا تو خلافِ عادت اور خلافِ شرع نہیں ہے۔

زمینی سفر کے پانچ مقامات پر ٹھہراؤ!

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے چلے تو راستے میں جبرائیل امین علیہ السلام نے کہا کہ یہاں اتریں دو رکعات پڑھیں، یہ "یثرب" ہے آپ کی ہجرت کی جگہ۔ پھر سوار ہوئے آگے چلے۔ جبرائیل امین نے پھر کہا: یہاں بھی دو رکعات نماز پڑھیں، یہ "مدین" ہے حضرت شعیب علیہ السلام کا علاقہ۔ پھر وہاں سے چلے۔ جبرئیل امین نے پھر کہا کہ یہاں بھی دو رکعات نفل پڑھیں۔ یہ "طورِ سیناء" ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خدا سے ہم کلام ہونے کی جگہ۔ پھر وہاں سے آگے چلے، دو رکعات نفل پڑھیے یہ "بیت اللحم" حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش ہے۔ وہاں سے آگے چلے تو "بیت المقدس" آگیا۔ اس میں بھی دو رکعات نماز پڑھی۔ یہ بہت سارے انبیاء علیہم السلام کی مسجد اور قبلہ ہے۔ چونکہ آپ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اس لیے آپ کو باقی انبیاء علیہم السلام کے خاص خاص مقامات دکھائے جارہے ہیں۔

ابھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجدِ اقصیٰ ہی میں تھے کہ ایک مؤذن نے اذان دی اور اقامت کہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہم صف باندھ کر کھڑے ہوئے، انتظار کر رہے تھے کہ امامت کون کرائے گا؟ تو جبرئیل امین نے

میرا ہاتھ پکڑا اور مصلے پر کھڑا کر دیا تو میں نے سب کو نماز پڑھائی۔ نماز پڑھانے سے جب میں فارغ ہوا تو جبرئیل امین نے مجھ سے کہا: کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ نے کن لوگوں کو نماز پڑھائی ہے؟ میں نے کہا: مجھے معلوم نہیں۔ عرض کیا کہ آپ نے انبیائے کرام علیہم السلام کو نماز پڑھائی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم امام بنے ہیں اور باقی انبیاء علیہم السلام مقتدی بنے ہیں۔

دو رکعت سے کم کوئی نماز نہیں:

اب یہاں پر دو مسئلے سمجھنا!

[۱]: دنیا میں اتنا لمبا سفر اور اتنے تھوڑے وقت میں کبھی کسی نے طے نہیں کیا۔ اس کی دنیا میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ آپ بتائیں! جب سفر بہت لمبا ہو اور وقت بہت تھوڑا ہو تو نماز چھوٹی سے چھوٹی پڑھتے ہیں یا بڑی سے بڑی پڑھتے ہیں؟ (چھوٹی پڑھتے ہیں۔ سامعین) اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یثرب یعنی مدینہ میں دو رکعات پڑھیں، مدین میں دو رکعات پڑھیں، طورِ سینا میں دو رکعات پڑھیں، بیت اللحم میں دو رکعات پڑھیں اور بیت المقدس میں دو رکعات پڑھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ مقامات پر نماز پڑھی ہے اور اس لمبے سفر میں تھوڑے وقت میں چھوٹی سے چھوٹی نماز دو رکعات پڑھی ہے۔ اس سے پتا چلا کہ دو رکعات سے کم نماز کا شریعت میں کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اگر ایک رکعت کا جواز ہوتا تو کسی جگہ پر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک رکعت تو پڑھ لیتے نا! اس لیے کم از کم دو رکعات ہیں، ایک رکعت وتر کی کوئی ہم سے بات نہ کرے۔

ایک رکعت وتر پڑھنے والوں سے سوال:

اور میں آپ سے کہا کرتا ہوں کہ جو بندہ آپ سے ایک رکعت وتر کا کہے تو اگر آپ زیادہ دلائل نہ دے سکتے ہوں تو ایک دلیل ذہن میں رکھ لیں۔ آپ اسے کہنا

کہ ہم وتر کی تین رکعتیں پڑھتے ہیں۔ پہلی رکعت میں ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى﴾ اور دوسری میں ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ اور تیسری میں ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پڑھتے ہیں۔ یہ ہم نے حدیث کی روشنی میں تین رکعتیں اور تین سورتیں بتائی ہیں۔

اگر آپ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وتر ایک رکعت پڑھتے تھے تو ایک حدیث آپ بھی بتادیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک رکعت پڑھتے تھے اور یہ سورت پڑھتے تھے۔ اگر نہیں ملتی تو مان لیں کہ وتر ایک نہیں بلکہ تین رکعات ہیں۔

امام کے پیچھے قرأت نہ کی جائے:

[۲]: دوسرا مسئلہ یہ سمجھیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم امام بنے اور باقی انبیاء علیہم السلام مقتدی بنے ہیں۔ نمازیوں کی تین قسمیں ہیں:

1: امام بھی امتی اور مقتدی بھی امتی۔

2: امام نبی اور مقتدی صحابہ۔

3: امام بھی نبی اور مقتدی بھی نبی۔

توجہ رکھنا! ہمارے ہاں جامع مسجد عثمانیہ سرگودھا میں جو جماعت ہو رہی ہے امام مولانا محمد عمر صاحب بھی امتی ہیں اور ہم بھی امتی ہیں، مدینہ منورہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم امام تھے اور نبی تھے، صحابہ مقتدی تھے اور امتی تھے اور بیت المقدس میں امام بھی نبی ہے اور مقتدی بھی نبی ہیں۔

آپ بتائیں کہ کون سی نماز سب سے افضل ہو سکتی ہے؟ (جس میں امام بھی نبی ہو اور مقتدی بھی نبی ہوں۔ سامعین) اب آپ سب سے افضل نماز دیکھ لیں اس میں امام نے سورۃ الفاتحہ پڑھی ہے اور کسی آیت یا کسی حدیث یا کسی تاریخ کی کتاب میں نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے امام کے پیچھے فاتحہ پڑھی ہے۔ معلوم ہوا کہ بہترین نماز وہ ہے کہ جب امام فاتحہ پڑھے تو مقتدی فاتحہ نہ پڑھیں۔ قیامت کے دن اللہ

فرمائیں کہ جن لوگوں نے امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھی تھی وہ کھڑے ہو جاؤ ہم نے اِن کو اُن کے پیچھے لے کر جانا ہے جنہوں نے فاتحہ نہیں پڑھی تھی، ہم کھڑے ہوں گے اور انبیاء علیہم السلام کے پیچھے چل پڑیں گے۔

انبیاء علیہم السلام کی نماز قابل قبول ہے اور ہماری نماز قابل قبول نہیں ہے؟

اس فتویٰ لگانے والے کو کچھ شرم اور عقل کرنی چاہیے کہ میں فتویٰ کیا لگا رہا ہوں کہ جس نے امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں ہوگی! اس کا معنیٰ کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام کی نماز نہیں ہوئی ہے، یہ فتویٰ ہم پر نہیں ہے یہ براہِ راست اللہ کے انبیاء علیہم السلام پر فتویٰ لگ رہا ہے۔ اس لیے یہ فتوے اتنے جلدی نہ لگایا کرو۔ اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)

نماز انبیاء علیہ السلام کے اجسام نے پڑھی ہے:

ایک مسئلہ اور سمجھیں۔ انبیاء علیہم السلام نے بھی نماز پڑھی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پڑھی ہے۔ باقی انبیاء علیہم السلام مقتدی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے امام بنے ہیں۔ اب یہاں بحث چلی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے اجسام مثالی تھے یا اجساد مثالی نہیں تھے بلکہ جسد عنصری کے ساتھ تھے؟ ہمارا موقف یہ ہے کہ جس طرح نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم دنیا والے جسم کے ساتھ تھے باقی انبیاء علیہم السلام بھی دنیا والے جسم کے ساتھ تھے۔ اعزاز تو تب ہی بنے گا نا کہ آگے دنیا والا جسم ہو اور پیچھے بھی دنیا والے جسم ہوں اور اگر آگے دنیا والا جسم ہو اور پیچھے روحیں ہوں تو اعزاز کیسے ہوگا؟

انبیاء جب قبروں میں ہیں تو بیت المقدس میں کیسے؟

ایک شخص نے مجھے اٹک سے فون کیا اور کہنے لگے کہ مولانا صاحب! اگر یہ بات مان لی جائے جو آپ لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں

زندہ ہیں، اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہیں جب انبیاء علیہم السلام قبروں میں نماز پڑھتے ہیں تو بیت المقدس میں نماز پڑھنے والے کون تھے؟ اور اگر بیت المقدس میں نماز پڑھنے والے انبیاء ہیں تو بتائیں پھر قبروں میں کون تھے؟ وہ ثابت یہ کرنا چاہتا تھا کہ قبروں میں تو انبیاء علیہم السلام ہیں دنیا والے جسم کے ساتھ اور یہاں معراج کے موقع پر بیت المقدس میں انبیاء علیہم السلام کی روحیں آئی ہیں تاکہ اعتراض نہ ہو۔

میں نے کہا کہ ہم دیوبند والے ہیں، ہم اپنے عقیدے کا تحفظ کرنا جانتے ہیں اور ہم بڑے شرحِ صدر سے عقیدہ بیان کرتے ہیں، ہم اس طرح نہیں کرتے کہ ہمارے پاس دلیل نہ ہو۔ میں اکثر حضرات سے کہتا ہوں کہ ہمارے اکابر نے یہ فرمایا ہے... میں صرف یوں نہیں کہتا کہ ''ہمارے اکابر نے یہ فرمایا ہے'' بلکہ میں کہتا ہوں کہ ''ہمارے اکابر نے فرمایا اور ہمارے اکابر کے فرمانے کی یہ وجہ ہے...'' ہم اپنے اکابر کے مسئلے کو دلیل سے بیان کرتے ہیں، بغیر دلیل کے بیان نہیں کرتے۔

آمدم بر سرِ مطلب:

جو بندہ آپ سے کہے کہ ''امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھیں تو نماز نہیں ہوتی'' آپ اس سے پوچھنا کہ یہ فتویٰ جامع مسجد عثمانیہ والوں پر ہے یا بیت المقدس کے انبیاء علیہم السلام پر ہے؟ یہ فتویٰ کس پر لگا رہے ہو؟ حنفیوں پر لگا رہے ہو یا بیت المقدس کے انبیاء علیہم السلام پر لگا رہے ہو؟ اگر ان کی ہو جاتی ہے تو پھر ہماری کیوں نہیں ہوتی؟

مذکورہ اشکال کا جواب:

میں نے اس سے کہا: آپ کہاں سے ہیں؟ مجھے کہتا ہے کہ جی میں اٹک کا ہوں۔ کہاں پڑھتے ہو؟ کہتا ہے: راولپنڈی میں۔ میں نے کہا کہ کیوں جھوٹ بولتے ہو؟ اس نے کہا کہ جھوٹ نہیں ہے، میں سچ کہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ تم جھوٹ کہتے ہو! اس نے کہا: کیسے؟ میں نے کہا کہ اٹک میں رہتے ہو تو راولپنڈی کیسے پڑھتے ہو؟ مجھے تمہاری

بات سمجھ نہیں آ رہی! کہتا ہے کہ مولانا صاحب! میں رہتا اٹک میں ہوں لیکن پڑھنے کے لیے پنڈی آتا ہوں۔ میں نے کہا کہ انبیاء علیہم السلام رہتے قبروں میں ہیں لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے بیت المقدس آئے ہیں، جس طرح تو رہتا اٹک میں ہے اور پڑھنے کے لیے پنڈی آیا ہے، وہ رہتے قبروں میں ہیں لیکن حضور کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے بیت المقدس آئے ہیں۔ ان کا بیت المقدس میں آنا قبروں میں رہنے کے خلاف نہیں ہے۔

توضیح بالمثال:

مجھ سے آپ پوچھیں کہ مولانا صاحب! آپ کہاں رہتے ہیں؟ میں کہوں کہ 87 جنوبی میں۔ آپ کہیں کہ آپ تو عثمانیہ مسجد سرگودھا میں ہیں! میں کہوں گا کہ یار میں رہتا 87 میں ہوں لیکن یہاں درس دینے کے لیے آیا ہوں۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام رہتے قبروں میں ہیں اور بیت المقدس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے آئے تھے۔

بیت المقدس سے عرش معلیٰ کا سفر:

بیت المقدس تک کا سفر براق پر ہوا ہے۔ اب اگلا سفر معراج کا شروع ہونے والا ہے۔ "معراج" سیڑھی کو کہتے ہیں۔ سیڑھی کیسی ہے؟ اس کی شان اللہ ہی جانتا ہے۔ نبی بھی بے مثال ہے، اللہ بھی بے مثال ہے، معراج کی پوری رات بھی بے مثال ہے، وہاں کی سیڑھیاں بھی بے مثال ہیں۔ ہم بتا تو سکتے ہیں شاید سمجھا نہ سکیں۔

اور دنیا میں آج بھی مختلف قسم کی سیڑھیاں ہیں۔ پہلے سیڑھیاں لکڑی کی ہوتی تھیں، اب فولڈنگ والی سیڑھیاں اور لوہے والی سیڑھیاں ہیں۔ اب لفٹ کی صورت میں سیڑھیاں آئی ہیں۔ ہمارے دور کی سیڑھیاں بدل رہی ہے تو اللہ نے کون سی سیڑھی دی یہ تو خدا ہی جانتا ہے۔

تین پیالے ان سے مراد:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں جانے لگے۔ حدیث پاک میں ہے کہ فرشتے نے آپ کے سامنے تین پیالے پیش کیے؛ ایک پیالہ پانی کا، ایک دودھ کا اور ایک شراب کا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کا پیالہ استعمال فرمایا۔ جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا کہ یارسول اللہ! اگر آپ پانی کا پیالہ پی لیتے تو آپ کی امت سیلاب میں غرق ہو جاتی، اگر آپ شراب کا پیالہ پی لیتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی، آپ نے فطرت کا خیال کیا ہے اور آپ نے دودھ کا استعمال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہدایت بھی رہے گی اور اس امت میں علم بھی رہے گا ان شاء اللہ۔ گمراہ کرنے والے آئیں گے لیکن نہیں کرسکیں گے، خدا تعالیٰ قیامت تک ایسے علم والے حضرات رکھیں گے جو امت کی صحیح رہنمائی کرتے رہیں گے۔ اللہ ہمیں ان کے ساتھ رکھیں جو صحیح رہنمائی کرنے والے ہیں۔

آسمانوں پر انبیاء علیہ السلام سے ملاقاتیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس سے چلے۔ پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، دوسرے آسمان پر حضرت عیسیٰ اور یحییٰ علیہما السلام سے ملاقات ہوئی، تیسرے آسمان پر حضرت یوسف سے، چوتھے آسمان پر حضرت ادریس علیہ السلام سے، پانچویں آسمان پر حضرت ہارون علیہ السلام سے، چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اور ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔

اس ملاقات میں حکمتیں:

علماء نے نکتہ لکھا ہے کہ....

☼ پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات کیوں ہوئی؟ کیونکہ وہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے باپ ہیں، پوری انسانیت کے والد ہیں، ان کا حق یہ تھا کہ پہلے ان سے ملاقات ہو۔

☼ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کیوں ہوئی؟ اس لیے کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر گئے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی زندہ آسمان پر گئے ہیں، دونوں زندہ جانے والوں کو خدا نے ملا دیا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام ان کے کزن تھے اس لیے ساتھ ان کی ملاقات بھی کرائی ہے۔

☼ اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات کیوں ہوئی؟ کیونکہ یوسف علیہ السلام کو بھائیوں نے دکھ دیا تھا، تو ان سے ملاقات میں حضور علیہ السلام کو بتانا مقصود ہے کہ جس طرح یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے ستایا تھا اسی طرح آپ کو بھی رشتہ داروں نے ستایا ہے، ایک وقت آیا کہ حضرت یوسف علیہ السلام جب فاتح بنے تو ﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾[49] کہا تھا۔ میرے محمد! ایک دور آئے گا کہ آپ بھی یوسف علیہ السلام کی طرح مخالفین کی خطائیں معاف کریں گے، جن مراحل سے وہ گزرے ہیں آپ بھی ان مراحل سے گزریں گے۔

☼ اس کے بعد حضرت ادریس علیہ السلام سے ملاقات کیوں ہوئی؟ اس لیے کہ ادریس علیہ السلام انبیاء علیہم السلام میں سے وہ نبی ہیں جنہوں نے ملوک یعنی بادشاہوں کو خط لکھے ہیں۔ تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بادشاہوں کو خطوط لکھے ہیں اس لیے خدا نے دونوں کی ملاقات کرائی ہے۔

☼ حضرت ہارون سے ملاقات کیوں ہوئی؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہِ طور پر گئے تو پیچھے قوم نے شرک کیا تھا تو مشرکین کو قتل کیا ہے۔ اللہ نے ملاقات کروا

49۔ یوسف 92:12

کر بتایا کہ آپ کی قوم کے مشرکین کو بھی قتل کیا جائے گا، تو بدر میں بھی قتل ہوئے، احد میں بھی قتل ہوئے، فتحِ مکہ کے موقع پر بھی عنادی افراد قتل ہوئے۔

☼ موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات کیوں ہوئی؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی شام میں جہاد کیا ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی شام کے جہاد کے لیے تبوک تک تشریف لائے ہیں، شام، موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے جانشین حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے ہاتھوں فتح ہوا ہے تو اشارہ فرمایا کہ شام آپ کے ہاتھوں نہیں لیکن آپ کے جانشین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں فتح ہو گا۔

☼ سب سے اوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات کیوں ہوئی؟ کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اس کعبہ کے محافظ ہیں اور ابراہیم علیہ السلام اس کعبہ کے بانی ہیں۔ فرمایا کہ محافظ؛ بانی کو بھی دیکھ لے۔

بیت المعمور جو بالکل کعبہ کے وسط پر ہے وہاں ابراہیم علیہ السلام ٹیک لگا کر بیٹھے ہیں، ستر ہزار فرشتے روزانہ اس بیت کا طواف کرتے ہیں، جو فرشتہ ایک بار آیا دوبارہ اس کی باری قیامت تک نہیں آئے گی۔

سدرۃ المنتہیٰ پر آمد:

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے اوپر چلے گئے اور سدرۃ المنتہی پر پہنچے۔ "سدرۃ" بیری کا نام ہے۔ بیری یوں نہ سمجھیں جیسے ہمارے ہاں کی بیری ہوتی ہے۔ وہ بیری کیسی ہے یہ خدا ہی جانتا ہے!

متکلمِ اسلام کا خواب اور امامِ اھل السنۃ کی تعبیر:

سدرۃ پر مجھے ایک بات یاد آئی۔ میں ایسی باتوں کا عموماً تذکرہ کرتا نہیں ہوں لیکن میرے پاس یہ تحریریں لکھی ہوئی موجود ہیں۔ ہمارے اساتذہ کو پتا ہے کہ ایسی تحریروں کا پورا ایک رجسٹر ہے۔ میں اساتذہ سے کہتا ہوں کہ اس کو میرے مرنے کے

بعد چھاپیں، اس کو میری زندگی میں شائع نہ کریں، بعض وہ خواب ہیں جو لوگوں نے ہمارے بارے میں دیکھے ہیں اور بعض وہ ہیں جو میرے اپنے خواب ہیں۔

مجھے اڈیالہ جیل میں 302 کے جھوٹے کیس میں 25 سال کی قید تھی۔ تو میں نے اس وقت ایک خواب دیکھا۔ وہ خواب میں نے لکھ کر امام اھل السنۃ والجماعۃ شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ کو بھیجا۔ وہ خواب یہ تھی کہ میں نے بیری کا ایک درخت دیکھا جس پر موٹے موٹے بیر لگے ہیں۔ میں اور مجھ سے جو دو چھوٹے بھائی ہیں وہ اس سے بیر توڑ رہے ہیں اور اپنی جھولیوں میں ڈال رہے ہیں۔ اچانک میری آنکھ کھلی اور میری زبان پر یہ آیت جاری تھی:

﴿فِیۡ سِدۡرٍ مَّخۡضُوۡدٍ ﴿۲۸﴾ وَّ طَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ ﴿۲۹﴾﴾

"سدر" بیری کو کہتے ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ حضرت شیخ مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ عجیب معبر تھے۔ انہوں نے مجھے جواب لکھا کہ تم اور تمہارے بھائیوں کے مال اور اولاد میں اللہ بہت برکت دے گا۔ میں نے جب وہ تعبیر دیکھی تو جو میرے ساتھ جیل میں ساتھی تھے شام کو میں نے ان سے کہا کہ میری رہائی آ گئی ہے۔ انہوں نے مذاق میں کہا کہ تم نے بہت چالاکی کی ہے! ان کا خیال یہ تھا کہ اندر اندر سے اس نے ہائی کورٹ میں رٹ کی اور ہمیں بتایا ہی نہیں ہے اور آج کسی سپاہی نے بتایا ہو گا کہ تمہاری رہائی ہو گئی ہے اور تم جانے والے ہو۔ انہوں نے تعجب سے کہا کہ ہمیں کیوں نہیں بتایا؟ میں نے کہا کہ میرے وکیل نے کیس نہیں لڑا، وہ تو لڑے گا ان شاء اللہ لیکن میں نے امام اھل السنۃ کو خواب لکھ بھیجا تھا تو انہوں نے مجھے تعبیر دی ہے۔ پھر میں نے مذاق کے طور پر کہا کہ جیل میں رہ کر مال میں برکت ہوتی ہے لیکن اولاد کی برکت کے لیے تو مجھے باہر جانا پڑے گا نا! یعنی جیل میں رہ کر مال تو بڑھ سکتا ہے اولاد کیسے بڑھے گی؟

آج ہماری ایک بیوی نہیں بلکہ تین بیویاں ہیں تو برکت ہوئی ہے یا نہیں؟ (ہوئی ہے۔ سامعین) ایک وقت وہ تھا کہ میرے پاس سائیکل تک نہیں تھی اور اب میری ستر لاکھ کی گاڑی ہے۔ اب بتاؤ! یہ برکت ہے یا نہیں؟ میں پیسے کماتا تھوڑی ہوں۔ آپ تو میرے شہر کے ہیں، اس لیے آپ کو اس کی قیمت محسوس نہیں ہوتی اور باہر کے لوگ جب کبھی کبھی دیکھتے ہیں نا کبھی ٹیلی فون پر بات ہو جائے، کبھی مصافحہ ہو جائے تو اس کی قیمت ان کو سمجھ آتی ہے، آپ کو تو پتا ہے کہ درس ہونا ہی ہونا ہے... خیر یہ تو میں ویسے مذاق کر رہا تھا۔ اللہ میرے اور آپ کے سارے اعمال کا بدلہ آخرت میں عطا فرمائے۔ یہ تو ویسے بات چلی ہے تو میں نے کہہ دیا ہے۔

آج کی زبان میں "سدرۃ المنتہٰی" کو اس طرح سمجھیں کہ یہ اوپر سے نیچے آنے والے احکامات اور نیچے سے اوپر جانے والے اعمال کا جنکشن ہے۔ نیچے سے جو اعمال جاتے ہیں وہاں رک جاتے ہیں پھر اوپر جاتے ہیں، اوپر والے احکام وہاں رکتے ہیں پھر نیچے آتے ہیں۔ تو "سدرۃ المنتہٰی" جنکشن ہے۔ یہاں جبرائیل امین رک گئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے بھی اوپر گئے ہیں۔ جبرائیل امین نے کہا کہ حضور! ہماری پرواز یہاں تک ہے، اس سے آگے جانے کی ہمیں اجازت نہیں ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پھر وہاں سے اوپر گئے ہیں، پھر آگے "صریف الاقلام" تک گئے ہیں۔ "صریف الاقلام" کا معنی کہ تقدیر کے قلم کے چلنے کی آواز آ رہی ہے۔ یہ تقدیر کے قلم خدا کے حکم سے چلتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے اوپر گئے۔ اب اللہ کے نبی مکان سے لا مکان تک پہنچے ہیں۔ اللہ کے نبی نے اللہ رب العزت کی بات کو براہِ راست سنا ہے اور اللہ کی ذات کو براہِ راست دیکھا ہے۔

معراج کی رات دیدارِ باری تعالیٰ:

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا:

"رَأَيْتُ رَبِّيْ عَزَّ وَجَلَّ." [50]

میں نے اللہ رب العزت کو دیکھا ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"رَأَيْتُ النُّوْرَ الْأَعْظَمَ." [51]

میں نے نور اعظم کو دیکھا ہے۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے بلاواسطہ گفتگو بھی کی ہے اور خدا کا دیدار بھی بلاواسطہ کیا ہے۔

دیدارِ باری تعالیٰ پر اعتراض کے جوابات:

میں اس پر بیانات کرتا رہتا ہوں، آپ سنتے رہتے ہیں، میں نے بتایا تھا کہ ایک مولوی صاحب نے ہمارے دیوبند کے اس عقیدے پر اعتراض کیا۔ کہنے لگا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خدا کو نہیں دیکھ سکتے۔ کیوں کہ یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ ۖ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ ۖ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ﴿١٠٣﴾﴾ [52]

کہ کوئی آنکھ بھی خدا کو نہیں دیکھ سکتی اور جس حدیث میں ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے۔ لہذا ہم اس حدیث کو

50۔ الخصائص الکبریٰ للسیوطی: ج1 ص268

51۔ الخصائص الکبریٰ للسیوطی: ج1 ص262

52۔ الانعام 103:6

نہیں مانتے جو قرآن کے خلاف ہو۔

میں نے کہا کہ دیوبند والے حدیث بھی مانتے ہیں اور قرآن بھی مانتے ہیں۔ میں نے کہا: قبلہ! اللہ آپ کو ہدایت عطا فرمائے۔ ہم تو تبلیغی، خانقاہی، دیوبندی لوگ ہیں، ہم بد دعائیں نہیں دیتے ہم تو دعائیں دیتے ہیں کہ اللہ تمہیں ہدایت عطا فرمائے اور ہدایت کے بعد جنت میں جگہ عطا فرمائے۔ تو بتاؤ کہ آپ جنت میں اللہ کا دیدار کرو گے؟ اس نے کہا کہ جی ہاں۔ میں نے کہا کہ کہاں لکھا ہے؟ کہا کہ حدیث میں لکھا ہے کہ اہلِ جنت؛ جنت میں خدا کا دیدار کریں گے۔ میں نے کہا کہ میں اس حدیث کو نہیں مانتا؟ مجھے کہتا ہے: کیوں؟ میں نے کہا کہ یہ حدیث قرآن کی اس آیت کے خلاف ہے:

﴿لَا تُدۡرِكُهُ الۡاَبۡصَارُ﴾

کہ کوئی آنکھ بھی خدا کو نہیں دیکھ سکتی۔

تو آپ کیسے دیکھیں گے؟ کہتا ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں رہ کر کوئی بندہ خدا کو نہیں دیکھ سکتا، میں تو جنت میں خدا کو دیکھوں گا۔ میں نے کہا کہ ہم کب کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو فرش پر دیکھا ہے، ہم بھی تو کہتے ہیں کہ عرش پر جا کر دیکھا ہے، تم جنت میں جا کر دیکھ لو تو قرآن کے خلاف نہیں ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم عرش پر جا کر دیکھیں تو یہ قرآن کے خلاف کیسے ہے؟

حضرت عائشہ کا موقف ہمارے خلاف نہیں:

یہاں ایک بات اچھی طرح سمجھیں تاکہ آپ کو کوئی بندہ دھوکہ نہ دے سکے۔ اگر کوئی کہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت صحیح بخاری میں موجود ہے کہ امی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کا دیدار نہیں کیا! جو کہتا ہے کہ دیدار کیا ہے وہ جھوٹ بولتا ہے۔

اگر کوئی آپ سے یہ بات کہے تو پھر آپ نے کہنا ہے کہ بخاری کی حدیث

ہمارے بالکل خلاف نہیں ہے۔ اچھی طرح سے یہ بات سمجھیں کہ یہ ہمارے خلاف کیوں نہیں ہے؟

اصل میں امی عائشہ رضی اللہ عنہا سمجھا رہی ہیں کہ انہی آنکھوں سے زمینی ماحول میں کوئی شخص خدا کا دیدار نہیں کر سکتا۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمین پر دیدار نہیں کیا بلکہ عرش پہ جا کے کیا ہے، جب عالم بدل گیا ہے تو پھر خدا کا دیدار کیا ہے۔ اب امی عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت ہمارے خلاف نہیں ہے۔

توضیح بالمثال:

اور دوسرا جواب یہ ذہن میں رکھیں! میں اسے سمجھانے کے لیے ایک مثال دیا کرتا ہوں۔ میں آپ حضرات کی عثمانیہ مسجد میں درسِ قرآن دینے کے لیے آیا ہوں۔ اب میرے جانے کے بعد ایک نوجوان کہتا ہے کہ مولانا الیاس گھمن صاحب نے اقبال کالونی کو نہیں دیکھا۔ دوسرا کہتا ہے کہ دیکھا ہے۔ اب دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔ قاری صاحب نے دونوں کو بلا لیا کہ بیٹا کیوں لڑ رہے ہو؟

ایک نے کہا کہ میں کہتا ہوں کہ مولانا الیاس گھمن صاحب نے اقبال کالونی نہیں دیکھی اور یہ کہتا ہے کہ دیکھی ہے۔ تو قاری صاحب نے پوچھا: تو کہتا ہے کہ دیکھی ہے تو تیری دلیل کیا ہے؟ اس نے کہا کہ جی عثمانیہ مسجد اقبال کالونی میں ہی ہے، مولانا صاحب کی آنکھیں ہیں، جب یہاں آئے ہیں تو بھائی اشرف کے گھر بیٹھے ہیں، وضو کیا ہے، وہاں سے مسجد آئے ہیں تو اقبال کالونی دیکھی ہے نا۔

اب دوسرے سے پوچھا کہ تو کہتا ہے کہ اقبال کالونی کو نہیں دیکھا تو تمہاری دلیل کیا ہے؟ وہ کہتا ہے: جی میرا مطلب یہ ہے کہ اقبال کالونی کے سارے گھروں کو نہیں دیکھا، چیدہ چیدہ دیکھا ہے۔ قاری صاحب نے کہا کہ بات تو دونوں کی ٹھیک ہے اس کے لیے لڑنے کی کیا ضرورت ہے؟

اب یہاں بھی یہی بات سمجھیں کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کو دیکھا ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ اجمال کے درجے میں دیکھا ہے اور امی عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نہیں دیکھا تو مراد یہ ہے کہ تفصیل کے درجے میں نہیں دیکھا۔ تو اجمالاً دیکھا ہے تفصیلاً نہیں دیکھا۔ امی عائشہ رضی اللہ عنہا کی بات بھی ٹھیک ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بات بھی ٹھیک ہے۔

ہم دیوبند والے تمہیں آپس میں نہیں لڑاتے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو آپس میں لڑائیں گے؟ ہم لڑانے والی بات نہیں کرتے ہم تو جوڑنے والی بات کرتے ہیں۔

تین عبادات کے بدلے تین انعامات:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا دیدار کیا ہے۔ وہاں اللہ رب العزت نے پوچھا: میرے محبوب! میرے پاس آئے ہو، کیا لائے ہو؟ جناب حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کیا:

"التَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ"

☼ "التَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ" اے اللہ! میری زبانی عبادتیں آپ کے لیے ہیں۔

☼ "وَالصَّلَوَاتُ" اے اللہ! میری بدنی عبادتیں آپ کے لیے ہیں۔

☼ "وَالطَّيِّبَاتُ" اے اللہ! میری مالی عبادتیں آپ کے لیے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تینوں عبادتیں اللہ کی خدمت میں پیش کی ہیں؛ زبان بھی آپ کے لیے، بدن بھی آپ کے لیے اور مال بھی اللہ کے لیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان تینوں کے بدلے میں تین انعامات عطا فرمائے ہیں:

1: "التَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ" کے بدلے: "السَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ"

2: "وَالصَّلَوَاتُ" اس کے بدلے: "وَرَحْمَةُ اللّٰهِ"

3: "وَالطَّيِّبَاتُ" اس کے بدلے: "وَبَرَكَاتُهُ"

کیا معنی کہ میرے محبوب! تیری زبانی عبادت میرے لیے تو میرا زبانی سلام تیرے لیے، تیری بدنی عبادت میرے لیے تو میری رحمت تیرے لیے، تیرا مال میرے لیے تو اس مال کی برکتیں تیرے لیے۔ تین چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کی ہیں، اللہ رب العزت نے تین چیزیں بطور انعام کے دی ہیں۔

تشہد کے جملوں کا باہمی ربط:

ہم تشہد پڑھتے تو ہیں لیکن سمجھتے نہیں کہ ہم کیا پڑھ رہے ہیں اور ان دونوں کا آپس میں جوڑ کیا ہے؟ جب ہم مسجد میں آئیں تو دعا مانگتے ہیں:

"اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ."

اے اللہ! میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کیا تھا: "اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ" کہ اللہ میں نماز تیرے لیے پڑھتا ہوں۔ تو اللہ نے جواب میں فرمایا تھا: "وَرَحْمَةُ اللّٰهِ" کہ میرے نبی! میری رحمتیں تیرے لیے ہیں۔ جب ہم مسجد میں آئیں تو کہتے ہیں کہ یا اللہ! عرش پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا نماز میں پڑھتا ہوں اور آپ نے فرمایا تھا کہ رحمتیں میں بھیجتا ہوں۔ یا اللہ! نماز ہم پڑھتے ہیں، اب رحمت کے دروازے آپ کھول دیں۔

اور جب ہم مسجد نے جانے لگتے ہیں تو یہ دعا پڑھتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ." [53]

اے اللہ! میں آپ سے آپ کا فضل مانگتا ہوں۔

53۔ صحیح مسلم، رقم: 713

قرآن کریم میں ہے:

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾[54]

کہ جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو زمین میں پھیل جاؤ اور رزق تلاش کرو!

تو ہم مسجد سے باہر نکلتے ہوئے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! آپ نے قرآن میں اعلان فرمایا ہے کہ ﴿وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ کہ مسجد میں جا کر نماز پڑھو اور باہر جا کر اللہ کا فضل تلاش کرو۔ تو ہم اب مسجد سے باہر جانے لگے ہیں اور آپ سے مانگ کر جا رہے ہیں۔ مانگنا ہمارے ذمے ہے اور عطا کرنا آپ کے ذمے ہے۔

تو یہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سوال ہے اور یہ اللہ کا جواب ہے۔

ایک واؤ کے ساتھ یا دو واؤ کے ساتھ؟

اس پر ایک علمی لطیفہ یاد آیا۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ تشریف فرما ہیں۔ ایک بدو آدمی دیہات سے آیا اور اس نے امام اعظم ابو حنیفہ سے سوال کیا:

أَبِوَاوٍ أَوْ بِوَاوَيْنِ؟ کہ ایک واؤ کے ساتھ یا دو واؤ کے ساتھ؟

امام صاحب نے فرمایا:

بِوَاوَيْنِ. کہ دو واؤ کے ساتھ۔

اس نے دعا دی:

"بَارَكَ اللّٰهُ فِيْكَ كَمَا بَارَكَ فِيْ لَا وَلَا!"

اللہ آپ میں ایسی برکتیں دے جیسے "لا" اور "لا" میں ہیں۔

امام صاحب نے فرمایا: آمین۔

54۔ الجمعۃ 10:62

وہ شخص دعا دے کر چلا گیا۔ شاگروں نے پوچھا: استاذ جی نہ ہمیں سوال سمجھ میں آیا نہ جواب سمجھ میں آیا، نہ ہمیں دعا سمجھ میں آئی اور نہ آمین سمجھ میں آئی۔

امام صاحب نے فرمایا کہ اس نے مجھ سے پوچھا کہ حدیث میں التحیات دو قسم کی منقول ہیں، ایک التحیات وہ ہے جس میں "واوَ" دو ہیں: "اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ" اور دوسری التحیات وہ ہے جس میں واوَ ایک ہے: "التَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ الطَّيِّبَاتُ وَالصَّلَوَاتُ لِلّٰهِ" تو اس بدو نے مجھ سے پوچھا ہے کہ ہم التحیات کون سا پڑھا کریں؟ ایک واوَ والا یا دو واوَ والا؟ میں نے اسے کہا کہ دو واوَ والا پڑھا کرو۔ پھر اس نے مجھے بہت پیاری دعا دی۔ اللہ نے جب اپنے نور کی مثال بیان فرمائی تو ارشاد فرمایا:

﴿مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّ لَا غَرْبِيَّةٍ ۙ﴾[55]

اللہ نے زیتون کے درخت کی بات کی ہے۔ فرمایا کہ زیتون کا درخت ایسا ہے کہ اس جیسا درخت نہ مشرق میں ہے نہ مغرب میں ہے۔ خدا نے دو بار "لا" استعمال کیا ہے زیتون کے درخت کے لیے۔ تو مجھے اس دیہاتی نے کہا:

"بَارَكَ اللهُ فِيْكَ كَمَا بَارَكَ فِيْ لَا وَلَا!"

اللہ آپ کی علم میں اس طرح برکتیں دے جس طرح زیتون کے درخت میں برکت دی ہے، اس جیسا مشرق اور مغرب میں درخت نہیں ہے آپ جیسا امام مشرق اور مغرب میں کوئی نہ ہو!

اس بدو نے کیسی پیاری بات کی اور حضرت امام صاحب کے دماغ کا اندازہ

55۔ النور 35:24

فرمائیں! بندہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا دشمن وہ شخص ہے جو علم کا دشمن ہے، جس کو علم سے پیار ہے وہ امام صاحب کا کبھی مخالف نہیں ہو سکتا۔

معراج کے تحفے:

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے ملاقات کی اور واپس تشریف لے آئے۔ اللہ پاک نے تین چیزیں بطورِ خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی ہیں:

1: سورۃ البقرۃ کی آخری آیتیں دی ہیں۔

2: یہ تحفہ دیا کہ جو شخص شرک نہ کرے اگرچہ کبیرہ گناہ بھی کرے تو ایک وقت آئے گا کہ اللہ اس کو معاف فرما دیں گے۔

3: پچاس نمازیں عطا کی ہیں۔

نمازیں؛ پچاس سے پانچ رہ گئیں:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے۔ راستے میں موسیٰ علیہ السلام ملے تو انہوں نے پوچھا کہ کیا ملا ہے؟ فرمایا: پچاس نمازیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ یہ نہیں پڑھیں گے، میں نے آزمایا ہے، اللہ سے کم کروالیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے گئے۔ اللہ نے پانچ کم کر دیں، باقی پینتالیس رہ گئیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ یہ پینتالیس بھی نہیں پڑھیں گے، کم کروالیں۔ پھر واپس گئے تو چالیس رہ گئیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ یہ چالیس بھی نہیں پڑھیں گے۔ یوں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نو مرتبہ گئے، پینتالیس معاف ہو گئیں، اب پانچ باقی رہ گئیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ یہ پانچ بھی نہیں پڑھیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اے موسیٰ! اب تو مجھے اللہ سے یہ کم کراتے ہوئے حیا آتی ہے۔

ادھر سے وحی آگئی کہ اے میرے محبوب! ہم اپنے قانون کو نہیں بدلتے،

یہ پڑھیں گے پانچ لیکن ہم اجر پچاس کا دیں گے۔ جاؤ! انہیں بشارت دے دو، ہم نے پینتالیس پڑھنے میں کم کی ہیں لیکن ثواب ہم نے پورا دینا ہے۔ خدا کا کتنا کرم ہے!

مقامِ ناز اور مقامِ نیاز:

حضرات مفسرین نے ایک عجیب جملہ کہا ہے کہ پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے تو بات شروع کر دی لیکن ابراہیم علیہ السلام نے کوئی بات نہ کی۔ علماء نے اس کی بڑی پیاری وجہ لکھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مقامِ ناز پر تھے اور ابراہیم علیہ السلام مقامِ نیاز پر تھے۔ مقامِ نیاز والا نہیں بولتا بلکہ مانتا ہی جاتا ہے اور موسیٰ علیہ السلام مقامِ ناز پر تھے اور جس کو ناز ہو وہ بول بھی پڑتا ہے۔ ابراہیم؛ خلیل اللہ ہیں اور حضرت موسیٰ؛ کلیم اللہ ہیں، حضرت ابراہیم مقامِ خُلَّت پر تھے اور حضرت موسیٰ مقامِ کلام میں تھے۔ انہوں نے تکلم کیا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خاموشی اختیار کی ہے۔

یہ تین انعام جو بطور خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اللہ ہمیں ان کو ماننے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)

تعارف و وجہ تسمیہ سورت:

سورت بنی اسرائیل مکی سورت ہے۔ اس میں 12 رکوع اور 111 آیات ہیں۔ اس سورت کا نام سورت بنی اسرائیل کیوں ہے؟ اس لیے کہ اس سورت کی ابتدا ہی میں اللہ رب العزت نے بنی اسرائیل کا تذکرہ کیا ہے۔

میں اس سے قبل یہ بات عرض کر چکا ہوں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو "اسرائیل" کہتے ہیں۔ "اسرا" کا معنی عبد ہے اور "ئیل" کا معنی اللہ ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام یعقوب تھا اور ان کا لقب تھا اسرائیل یعنی عبد اللہ، اللہ کا بندہ۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے اور ہر بیٹے سے آگے مستقل ایک قبیلہ بنا۔

اس نسبت سے ان کے بارہ قبائل بنے اور ان بارہ قبائل کو ”بنی اسرائیل“ یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کہا جاتا ہے۔ انہی بنی اسرائیل ہی میں سے یہودی ہیں اور انہی میں سے عیسائی ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی اولاد اور یہودا کی اولاد آگے چلی۔ یہودا کی جو اولاد ہے انہی کا نام ”یہودی“ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی انہی کی اولاد میں سے ہیں۔ قیامت کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے اور یہودیت کو قتل کریں گے۔

عیسیٰ علیہ السلام کے نزول پر بھی میں ان شاء اللہ کبھی آئندہ بحث کروں گا کہ نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کی حکمتیں کیا ہیں؟ عیسیٰ علیہ السلام کیوں تشریف لائیں گے؟ بہر حال جب عیسیٰ علیہ السلام آئیں گے تو یہودیت اور عیسائیت ختم ہو جائے گی۔ تو اس سورت کا نام ”سورت بنی اسرائیل“ ہے۔

قبولیت اعمال کی شرائط:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾﴾

ان تین آیات میں اللہ رب العزت نے قبولیتِ اعمال کی تین شرطیں بیان فرمائی ہیں۔ شیطان کی ایک محنت یہ ہے کہ کوئی آدمی نیک عمل نہ کرے اور اس کی دوسری محنت یہ ہے کہ اگر کوئی نیک عمل کرے تو اس طرح کرے کہ اس کا نیک عمل قبول نہ ہو۔ مثلاً مسجد میں اگر آ جائے تو نماز ٹھیک طرح ادا نہ ہو اور قبول نہ ہو۔ اس کی پہلی محنت کہ کوئی شخص رمضان کا روزہ نہ رکھے اور دوسری محنت کہ اگر روزہ رکھ لے تو

اس سے روزے میں اعمال ایسے کروائے کہ اس کا روزہ قبول نہ ہو۔ اس کی پہلی محنت کہ انسان حج نہ کرے اور دوسری محنت کہ اگر حج کرے تو دورانِ حج اس سے ایسے اعمال سرزد کروائے کہ اس کا حج قبول نہ ہو۔ شیطان کی دونوں محنتیں ہیں۔

شیطان کی پہلی محنت اور اس کا توڑ:

شیطان کی جو پہلی محنت تھی انسان نیک عمل ہی نہ کرے یہاں اس محنت کا توڑ بیان کیا گیا ہے۔ توڑ یہ ہے کہ آدمی نیک عمل کرے۔ اس کے لیے دو چیزیں ہیں:

[1]: بوقتِ عمل انسان مستحکم ارادہ اور عزم کرے، ہمت سے کام لے۔

[2]: اپنی زبان سے کہے: ”لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ“

اللہ ایسے بندے کو نیک اعمال کی توفیق عطا فرما دیتے ہیں۔ آپ اس کی ایک مثال سمجھ لیں۔ جب مؤذن اذان دیتا ہے تو ہم مؤذن کی اذان کے ساتھ ساتھ جواب دیتے ہیں: ”اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ“ کے جواب میں ”اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ“، ”اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ“ کے جواب میں ”اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ“، ”اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ“ کے جواب میں ”اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ“، اور ”حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ“ کے جواب میں ”حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ“ نہیں اور ”حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ“ کے جواب میں ”حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ“ نہیں، پھر ”اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ“ کے جواب میں ”اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ“ اور ”لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ“ کے جواب میں ”لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ“۔

تو سوال یہ ہے کہ پوری اذان میں جو کلمات مؤذن کہتا ہے ہم بھی وہی کلمات کہتے ہیں لیکن جب مؤذن ”حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ“ کہتا ہے تو نہ تو ہم جواب میں یہ کہتے ہیں کہ ”حَيَّ عَلَى الصَّلٰوةِ“ اور نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جی ہاں! ہم نماز کے لیے آرہے ہیں بلکہ ہم کہتے ہیں کہ ”لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ“ یہ تبدیلی کیوں؟ اس لیے کہ زبان سے کہنا

کہ اللہ بہت بڑا ہے یہ آسان ہے اور عمل سے ثابت کرنا یہ مشکل ہے۔

زبان سے کہنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں یہ آسان ہے اور جب برادری ایک طرف ہو اور نبی کا حکم دوسری طرف، تو عمل سے ثابت کرنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں یہ بڑا مشکل ہے۔ اس لیے اللہ پاک نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے یہ حکم دیا کہ جب "حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ" کی باری آئے تو کہنا کہ "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ" کہ اے اللہ! ہم نے زبان سے آپ کو بڑا مان لیا ہے اب عمل کی باری ہے تو یہ ہے مشکل کام لیکن اگر آپ طاقت دے دیں تو پھر مشکل نہیں ہے۔ اس لیے آدمی ہمت کرے، دکاندار ہے تو دکان چھوڑ دے، اذان شروع ہو تو گاہک کو روک دے اور ساتھ "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ" کہے۔ اللہ اس بندے کو نماز کی توفیق ضرور عطا فرمائیں گے، آپ تجربہ کرکے دیکھ لیں۔

شیطان کی دوسری محنت اور اس کا توڑ:

اور جہاں تک دوسری محنت ہے کہ انسان عمل کرے اور قبول نہ ہو تو اس پر شیطان تین محنتیں کرتا ہے:

[1]: پہلے محنت کرے گا کہ آدمی کا عقیدہ ٹھیک نہ ہو، جب عقیدہ ٹھیک نہیں ہو گا تو عمل قبول نہیں ہو گا۔

اللہ رب العزت نے قرآن میں ارشاد فرمایا:

﴿لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝٦٥﴾[56]

اللہ نے امت کو سمجھانے کے لیے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا ہے۔ لیکن اس کو سمجھانے سے پہلے میں یہاں ایک مثال دوں گا تاکہ آپ کے لیے اس

56۔ الزمر 65:39

آیت کو سمجھنا ذرا آسان ہو جائے۔ مدینہ منورہ میں ایک عورت نے چوری کی۔ اس عورت کا نام فاطمہ ہے اور قبیلہ بنی مخزوم ہے۔ جب اس فاطمہ مخزومیہ کی چوری ثابت ہو گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دو، یہی سزا ہے چور کی۔ اب ان کی سفارشیں آنا شروع ہو گئیں کہ حضور! یہ بڑے خاندان کی عورت ہے، اس کا ہاتھ نہیں کاٹنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا "[57]

اگر فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم چوری کرے گی تو محمد تب بھی اس کا ہاتھ کاٹ دے گا۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا چوری کریں، ایسا بالکل نہیں ہو سکتا لیکن اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات کیوں فرمائی ہے؟ یہ امت کو سمجھانے کے لیے فرمایا ہے کہ میں نبی حدود میں امیر غیر، چھوٹے بڑے کا فرق نہیں کر سکتا۔

اب سمجھیں کہ یہ جو اللہ نے فرمایا:

﴿لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٦٥﴾﴾

اے پیغمبر! اگر آپ نے بھی شرک کیا تو آپ کے سارے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔

نبی کے بارے میں شرک کا تصور کرنا بھی جرم ہے لیکن خطاب اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے اور یہ امت کو سمجھانے کے لیے ہے۔

شیطان کی پہلی محنت یہ ہے کہ بندے کے عقائد خراب کروں اور ہماری [مولانا محمد الیاس گھمن صاحب کی] پہلی محنت یہ ہے کہ بندے کے عقائد کو درست

57۔ صحیح البخاری، رقم:3475

کریں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ میری محنت پوری دنیا میں یہ ہے کہ بندے کے عقائد ٹھیک کروں... عقائد ٹھیک کروں... کیونکہ اعمال کے قبول ہونے کی بنیاد عقیدہ ہے۔

[2]: شیطان کی محنت ہوتی ہے کہ اگر اس کا عقیدہ ٹھیک ہے تو نیت خراب کروں تاکہ یہ اللہ کے لیے کام نہ کرے، لوگوں کے لیے کام کرے، جب لوگوں کے لیے کام کرے گا تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ عمل قبول نہیں ہو گا۔

اخلاصِ نیت ضروری ہے:

ایک حدیث مبارک میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ پہلے شہید کو اٹھائیں گے اور پوچھیں گے کہ تو نے میرے لیے کیا کیا ہے؟ وہ کہے گا:

قَاتَلْتُ فِيْ سَبِيْلِكَ حَتَّى اسْتُشْهِدْتُ.

اے اللہ! میں نے تیرے نام پر جان دی اور شہید ہو گیا۔

اللہ فرمائیں گے: تو جھوٹ بولتا ہے۔

إِنَّمَا أَرَدْتَ أَنْ يُقَالَ: فُلَانٌ جَرِيءٌ.

یہ تو نے اس لیے کیا تھا کہ لوگ کہیں کہ بڑا دلیر آدمی ہے، وہ لوگوں نے کہہ دیا ہے، اب اس کو جہنم میں ڈال دو!

اللہ پھر عالم کو کھڑا کر کے پوچھیں گے کہ تو نے میرے لیے کیا کیا؟

وہ کہے گا:

"تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ وَقَرَأْتُ الْقُرْآنَ وَعَلَّمْتُهُ فِيْكَ.

اے اللہ! میں نے علم سیکھا اور قرآن پڑھا اور آپ کی رضا کے لیے پڑھایا۔

اللہ فرمائیں گے کہ تو جھوٹ بولتا ہے۔

"إِنَّمَا أَرَدْتَ أَنْ يُقَالَ: فُلَانٌ عَالِمٌ وَفُلَانٌ قَارِئٌ.

تو قرآن اس لیے پڑھاتا تھا تاکہ لوگ کہیں کہ یہ بہت بڑا مولوی ہے، بہت

بڑا قاری ہے، زبردست خطیب ہے، وہ تو لوگوں نے کہہ دیا ہے، اب اس کو الٹے منہ جہنم میں ڈال دو!

پھر اللہ سخی سے پوچھیں گے تو نے کیا کیا؟

وہ کہے گا:

"مَا تَرَكْتُ مِنْ شَيْءٍ تُحِبُّ أَنْ أُنْفِقَ فِيْهِ إِلَّا أَنْفَقْتُ فِيْهِ لَكَ."

اے اللہ! جتنا تو نے مجھے مال دیا میں نے سارا تیرے نام پر لگا دیا۔

اللہ فرمائیں گے کہ تو بھی جھوٹ بولتا ہے۔

"إِنَّمَا أَرَدْتَ أَنْ يُقَالَ: فُلَانٌ جَوَادٌ."

یہ تو نے اس لیے کیا تھا کہ لوگ کہیں کہ یہ تو بڑا سخی ہے، وہ لوگوں نے کہہ دیا ہے، اب اسے جہنم میں ڈال دو![58]

اب بتاؤ! عالم ہونا کتنا بڑا اعزاز ہے! شہید ہونا کتنا بڑا اعزاز ہے اور سخی ہونا کتنا بڑا اعزاز ہے! لیکن یہ تینوں جہنم میں کب جائیں گے جب ان کی نیت ٹھیک نہیں ہو گی اور اگر نیت ٹھیک ہو گئی تو کیا ہی کہنے۔

تصحیحِ نیت کا اجر:

ایک واقعہ عرض کرتا ہوں، اس کو ذہن نشین فرما لیں! بنی اسرائیل کے لوگوں میں سے ایک شخص قیامت کے دن اللہ کے دربار میں آئے گا، اللہ رب العزت اس کے نامہ اعمال میں ایک ریت کے ٹیلے کے برابر گندم اور آٹے کا صدقہ لکھ دیں گے۔ وہ کہے گا: اللہ! میں تو غریب تھا، اتنی گندم تو میں نے زندگی میں دیکھی بھی نہیں ہے یہ میرے نامہ اعمال میں کہاں سے آ گئی؟

58۔ شعب الایمان للبیہقی: ج 5 ص 325 رقم الحدیث 6805

اللہ رب العزت فرمائیں گے کہ فلاں بستی سے تو گزرا اور اس بستی میں فقر اور قحط تھا۔ تو نے وہاں کہا تھا: اگر اس ٹیلے کے برابر آج میرے پاس آٹا ہوتا میں غریبوں پر صدقہ کرتا، نیت تو نے کی ہے اور لکھ ہم نے لیا ہے۔

اب نیت خراب ہو تو مولوی صاحب بھی پھنسے پڑے ہیں اور نیت ٹھیک ہو تو تاجر بھی نکل گیا ہے۔ اس لیے شیطان کی محنت ہوتی ہے کہ نیت خراب ہو۔

[3]: اگر عقیدہ بھی ٹھیک ہو اور نیت بھی ٹھیک ہو تو شیطان کی محنت ہوتی ہے کہ عمل سنت کے مطابق نہ کرے۔ شیطان یہ محنت کرے گا اور عمل سنت کے مطابق نہیں کرنے دے گا۔

آج دنیا میں جتنی بدعات ہو رہی ہیں یہ کس بنیاد پر ہیں؟ لوگ بڑے اخلاص کے ساتھ اپنے باپ کو بخشوانے کے لیے ایسے اعمال کرتے ہیں جن سے باپ کی بخشش تو کجا خود اولاد گناہ گار ہو جاتی ہے۔

عمل کی قبولیت کی شرائط:

اللہ نے ان آیات میں تین شرطیں بیان فرمائیں جن کی وجہ سے انسان کا عمل قبول ہوتا ہے۔ فرمایا:

﴿وَمَنۡ اَرَادَ الۡاٰخِرَۃَ وَسَعٰی لَهَا سَعۡیَهَا وَهُوَ مُؤۡمِنٌ﴾

عقیدہ بھی ٹھیک ہو، نیت بھی ٹھیک ہو اور عمل بھی سنت کے مطابق ہو۔

﴿فَاُولٰٓئِکَ کَانَ سَعۡیُهُمۡ مَّشۡکُوۡرًا ﴿۱۹﴾﴾

پھر یہ نہیں کہ ہم اجر دیتے ہیں بلکہ ہم اس کے عمل کی قدر بھی کرتے ہیں۔

اجر اور قدر میں فرق:

اجر اور ہوتا ہے اور قدر اور ہوتی ہے۔ ہم اجر کے پیچھے دوڑتے ہیں اور اللہ

نے اجر کی بات نہیں فرمائی، اللہ نے قدر کی بات فرمائی ہے۔ اجر اور چیز ہے قدر اور چیز ہے۔ اجر کا معنی ہے "مزدوری" اور قدر کا معنی ہے "پروٹوکول"۔ مزدوری الگ چیز ہے اور پروٹوکول الگ چیز ہے۔

اگر آپ وزیر اعلیٰ پنجاب کی تنخواہ جاکر پوچھیں تو کسی فیکٹری کے جی ایم کی تنخواہ بھی اس سے زیادہ ہو گی۔ جب وزیر اعلیٰ کے اجر کو دیکھیں گے تو اجر اس کا کم ہے اور جی ایم کا زیادہ ہے اور جب پروٹوکول کو دیکھیں گے تو وزیر اعلیٰ نے جب لاہور سے چلنا ہے تو یہ حکم جاری ہو جاتا ہے کہ سرگودھا تک راستے میں کوئی جی ایم کھڑے نہیں ہونے دینا! روڈ خالی کرادو! کیوں کہ وزیر اعلیٰ صاحب آرہے ہیں۔ اجر اور ہوتا ہے اور قدر اور چیز ہوتی ہے۔

اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں اجر دوں گا، فرمایا: عقیدہ ٹھیک ہوا، نیت ٹھیک ہوئی اور عمل سنت کے مطابق ہوا تو پھر میں تمہارے عمل کی قدر کروں گا۔ جب شاہ قدر کرتا ہے تو اپنی حیثیت کے مطابق دیتا ہے اور جب شہنشاہ قدر کرتا ہے تو اپنی شان کے مطابق نوازتا ہے۔

شاہ کی قدر دانی یہ ہے تو شہنشاہ کا عالم کیا ہو گا؟

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ بغداد میں قحط پڑ گیا۔ ایک آدمی نے جوہڑ سے پانی کا ایک مٹکا بھرا اور بادشاہ کے پاس پہنچا۔ بادشاہ نے پوچھا: کیسے آئے ہو؟ اس نے کہا کہ بغداد میں قحط تھا تو میں نے سوچا کہ بادشاہ سلامت پیاسے ہوں گے، ان کی خدمت میں پانی پیش کردوں۔ بادشاہ نے سمجھا کہ یہ شخص سادہ ہے لیکن ہے مخلص، یہ سمجھتا نہیں ہے کہ بادشاہ کے پاس مال کون سا ہوتا ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے کہا کہ یہ مٹکا لے لو اور اس کے مٹکے کو ہیرے، جواہرات اور سونے سے بھر کر دے دو!

وہ بڑا خوش ہوا کہ میں نے مشکل وقت میں بادشاہ کو پانی دیا ہے تو بادشاہ نے خوش ہو کر مجھے بدلے میں سونا دیا ہے۔ بادشاہ نے اپنے وزیر سے کہا کہ یہ جس راہ سے آیا ہے اس راہ سے واپس نہ جائے، اس کو واپسی پر ہمارے باغات اور چشموں سے گزارنا تاکہ اس کو پتا چلے کہ ہمیں تیرے پانی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب اس نے سر پر مٹکا اٹھایا ہوا ہے اور بادشاہ کے باغات سے گزر رہا ہے۔ یہ بیچارہ پسینہ پسینہ ہو گیا کہ یہ بادشاہ اگر ان پھلوں کے جوس پیتا رہے تو اس کے پاس جوس ختم نہ ہو، میں نے پانی دے کر کون سا کمال کیا ہے!

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں: جب شاہ قدر کرتا ہے تو جوہڑ کے پانی کے بدلے میں جواہرات دیتا ہے اور جب شہنشاہ قدر کرتا ہے تو ایسی نعمتیں دیتا ہے جن کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا! تو شاہ کی قدر اور ہوتی ہے اور شہنشاہ کی قدر اور ہوتی ہے۔

اللہ کی شانِ بے نیازی و شانِ سرفرازی:

ہم جو نیک اعمال کرتے ہیں تو اللہ کو ہمارے نیک عمل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے سبحان اللہ کہا تو اللہ ہمیں جنت دے دیں گے۔ یہ اللہ کو ضرورت نہیں ہے کہ اللہ ہمارے سبحان اللہ کا محتاج ہے، وہ تو ہے ہی سبحان اس کو ہمارے سبحان کی ضرورت کیا ہے؟ یہ سبحان کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کو ہمارے سبحان کی ضرورت نہیں ہے۔

تو جب آدمی عمل کرے بشرطیکہ اس کا عقیدہ بھی ٹھیک ہو اور اس کی نیت بھی ٹھیک ہو اور عمل بھی سنت کے مطابق ہو تو اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

﴿فَأُولَٰٓئِكَ كَانَ سَعۡيُهُم مَّشۡكُورٗا ١٩﴾

ہم اسے صرف اجر نہیں دیتے بلکہ اس کی قدر کرتے ہیں۔

عبادت خدا کی اور ادب والدین کا:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾ ۭ﴾

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے توحید کے بعد والدین کا ادب بیان کیا ہے۔ فرمایا کہ تم نے سجدہ خدا کو کرنا ہے اور ادب تم نے والدین کا کرنا ہے۔ آگے اللہ نے والدین کے لیے پانچ چیزیں فرمائی ہیں:

[1]: ﴿فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ﴾ ان کو ”اف“ بھی نہیں کہنا۔ ماں باپ سے بڑے سے بڑا نقصان ہو جائے تو اس زندگی والے اس نقصان پر آپ نے یہ نہیں کہنا: ابا جی! یہ کیا کیا ہے؟

[2]: ﴿وَّلَا تَنْهَرْهُمَا﴾ اور ماں باپ کو ڈانٹنا بھی نہیں ہے۔

[3]: ﴿وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا﴾ ان کے ساتھ شرافت سے بات کرنی ہے

[4]: ﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾ والدین کے لیے ہمیشہ اپنے بازوؤں کو بچھا کر رکھنا ہے، جی جی کرتے رہنا ہے!

[5]: ﴿وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴾ اور ساتھ اللہ سے دعائیں بھی مانگنی ہیں کہ اے اللہ! میرے ابا جی اور امی جی پر رحم فرما! میں تو خدمت کرتا ہوں، آپ بھی رحم فرمادیں!

تو اللہ نے والدین کے بارے میں یہ بات فرمائی ہے۔

آیت میں ذکر خدا ہے تو ذکر مصطفیٰ کہاں ہے؟

اب یہاں ایک بات سمجھیں! ایک معاملہ والدین کا ہے اور ایک معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ عموماً آپ نے سنا کہ جب بھی اللہ کا نام ہو اس کے بعد اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہوتا ہے۔ جب خدا کا ذکر ہو تو بعد میں مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ یہاں ذکرِ خدا تو ہے لیکن ذکرِ مصطفیٰ نہیں ہے بلکہ اللہ کے ذکر کے بعد والدین کا ذکر ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ذکرِ خدا کے بعد ذکرِ مصطفیٰ کیوں نہیں ہے؟ یہ مضمون تو بہت لمبا ہے لیکن میں ساری باتیں اختصار سے کہہ رہا ہوں۔ یہاں ذکرِ مصطفیٰ موجود ہے لیکن اسے دیکھنے والی آنکھ ہر بندے کے پاس نہیں ہے۔ اگر آنکھ موجود ہو تو نظر آئے گا کہ یہاں ذکرِ مصطفیٰ کیسے ہے۔

یہ بات سمجھیں! عبادت ہر حال میں خدا کی ہے اور ادب ہر حال میں والدین کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آدمی کے پاس صحت ہو تب بھی سجدہ خدا کو، اگر بیماری ہو تب بھی سجدہ خدا کو، دولت ہو تب بھی سجدہ خدا کو، فقر ہو تب بھی سجدہ خدا کو، اللہ اولاد دیں تب بھی سجدہ خدا کو، اولاد دے کر واپس بلالیں تب بھی سجدہ خدا کو! پتا چلا کہ جس طرح سجدہ ہر حال میں خدا کو ہے اسی طرح ادب ہر حال میں والدین کا ہے، والدین مسلمان ہوں یا والدین کافر ہوں، والدہ رات مصلی پر گزارے یا والدہ رات سینما میں گزارے ہر حال میں ماں کا ادب اولاد کے ذمہ ہے۔

کوئی بیٹا یہ نہیں کہہ سکتا کہ تو تہجد نہیں پڑھتی، رات بازار میں گزارتی ہے، میں تیری خدمت نہیں کروں گا، ماں گندی سے گندی ہو لیکن بیٹے کی جنت اسی ماں کے قدموں میں ہے۔ یہ ماں اور خدا کا معاملہ ہے۔ باپ سود کھائے یا باپ تجارت کرے یہ باپ اور خدا کا معاملہ ہے، بیٹا اس بنیاد پر باپ کو رد نہیں کر سکتا کہ تو سود خور

ہے۔ بیٹے کے لیے جنت کا دروازہ یہی باپ ہے۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین فرمالیں! کبھی جو تھوڑا سا تقویٰ آجائے، آدمی ڈاڑھی رکھ لے، نماز پڑھ لے اور نیک بن جائے تو اپنے سود خور باپ کے خلاف بکنا شروع ہو جاتا ہے، بے نماز باپ کی بے ادبی کرتا ہے اور باپ غلط ہو تو باپ کے خلاف زبان درازی کرتا ہے۔ یاد رکھو! باپ جیسا بھی ہو وہ باپ ہے۔ کبھی بھی انسان باپ کے خلاف نہ بد زبانی کرے، نہ باپ کے خلاف بد گمانی کرے۔ ہاں اگر باپ کی باتیں شریعت کے خلاف ہوں تو اپنے باپ کے لیے دعائیں ضرور کرتا رہے۔

مولانا صاحب! میرے والد کے لیے دعا کریں:

مجھ سے کراچی کے ایک ساتھی بیعت ہیں اور ان کے گھر والے بھی مجھ سے بیعت ہیں۔ ان کے والد صاحب کا بڑا مسئلہ ہے کہ انہوں نے سود کے لیے بینک میں پیسہ جمع کرا دیا ہے اور گھر میں ٹی وی رکھا ہوا ہے، ہر وقت وہی دیکھتے رہتے ہیں۔ میں بڑا حیران ہوتا ہوں۔ وہ بیعت والا ساتھی جب بھی آتا ہے تو کہتا ہے کہ مولانا صاحب! دعا فرمائیں اللہ ہمارے والد صاحب کو ہدایت عطا فرمائے اور میں کوشش کر رہا ہوں کہ امی اور ابو دونوں کو عمرے پر لے جاؤں اور حرم میں لے جا کر کہہ دوں کہ اللہ! جو میرے بس میں تھا میں نے کر دیا، میں نے سود کی جگہ زم زم پلا دیا ہے، اب اندر تو صاف فرما دے! تو والدین کے ساتھ معاملہ ایسا ہونا چاہیے۔

خیر میں مختصرا کہہ رہا ہوں تاکہ بات لمبی نہ ہو۔ یہاں یہ بات سمجھیں کہ سجدہ خدا کو کیوں اور ادب والدین کا کیوں؟ اللہ کو سجدہ اس لیے ہے کہ اللہ پاک کے کلمہ ”کُنْ“ سے ہم پیدا ہوئے ہیں اور ماں باپ کا ادب اس لیے ہے کہ ماں باپ ہماری پیدائش کا سبب ہیں۔ سببِ حقیقی اللہ کی ذات ہے اور سببِ ظاہری ماں باپ کی ذات ہے۔

اب حقیقت پر غور کریں گے تو نظر آئے گا کہ میری پیدائش کا سبب میرے ماں باپ ہیں، ان کی پیدائش کا سبب ان کے ماں باپ ہیں، ان کی پیدائش کا سبب ان کے ماں باپ، اسی طرح اگر اوپر چلتے جائیں تو ہم سب کی پیدائش کا سبب ہمارے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ حدیث مبارک میں ہے کہ اللہ رب العزت نے حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا تھا:

"وَلَوۡلَا مُحَمَّدٌ مَا خَلَقۡتُكَ"[59]

اے آدم! اگر ہم نے محمد مصطفی کو پیدا نہ کرنا ہوتا تو میں تجھے وجود ہی نہ دیتا!

اب پتا چلا کہ ہم سب کی پیدائش کا سبب آدم علیہ السلام ہیں اور حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا سبب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اب بتاؤ کہ جن کی وجہ سے تنہا مجھے وجود ملا ہے اگر ان کا ادب کرنا ضروری ہے تو جن کی وجہ سے پوری کائنات کے سارے انسانوں کو وجود ملا ہے تو ان کا ادب والدین سے بڑھ کر ضروری ہے!

اس لیے میں کہہ رہا تھا کہ والدین کے ساتھ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر موجود ہے لیکن اس کو دیکھنے کے لیے آنکھ ہونی چاہیے، آنکھ ہو تو پھر نظر آتا ہے۔ اور اس بات کو سمجھانے کے لیے میں آپ کو کئی ایک مثالیں دے چکا ہوں اگر آپ کو یاد ہو، میں ایک دو مثالیں ابھی بھی دے دیتا ہوں:

مقتدی کا اجر بتایا امام کا اجر سمجھ میں آیا:

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب آدمی باجماعت نماز پڑھے تو

59۔ المستدرک علی الصحیحین للحاکم: ج3 ص517 رقم الحدیث 4286

ایک نماز پر ستائیس نمازوں کا ثواب ملتا ہے۔[60]

اب یہ اجر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتدی کے لیے بتایا ہے یا امام کے لیے بتایا ہے؟ (مقتدی کے لیے۔ سامعین) اور اگر مصلی پر امام نہ ہو تو مقتدی کو یہ اجر ملے گا؟ (نہیں۔ سامعین) مقتدی کا اجر بتایا ہے تو امام کا اجر سمجھ میں آیا ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم امام کا اجر بتا دیتے تو مقتدی کا اجر سمجھ میں نہیں آنا تھا، اس لیے مقتدی کا اجر بتایا تو امام کا اجر سمجھ میں آگیا۔

سینگ، بال، کھر کا اجر بتایا تو گوشت کا خود بخود سمجھ میں آیا:

حدیث پاک میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بِكُلِّ شَعْرَةٍ حَسَنَةٌ."[61] جب آدمی قربانی کرتا ہے تو ایک ایک بال کے بدلے میں اللہ اسے نیکی عطا فرماتے ہیں۔

اب بتاؤ! بال کھاتے ہیں یا گوشت کھاتے ہیں؟ (گوشت کھاتے ہیں۔ سامعین) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ ایک ایک بوٹی کے بدلے میں نیکی ملتی ہے بلکہ فرمایا کہ "بِكُلِّ شَعْرَةٍ حَسَنَةٌ" کہ ایک ایک بال کے بدلے میں نیکی ملتی ہے۔ اگر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بوٹیوں کا اجر بتا دیتے تو بال کا اجر سمجھ میں نہیں آنا تھا۔ لوگ کہتے کہ بال تو ہم پھینک دیتے ہیں۔ تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بال کا اجر بتایا ہے تو بوٹی کا اجر خود بخود سمجھ میں آیا ہے۔

شہید کی حیات بتائی تو نبی کی حیات میں آئی:

یہ بات سمجھتے جانا! ہمارا عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ

60۔ صحیح البخاری، رقم: 645

61۔ سنن ابن ماجۃ، رقم: 3127

ہیں لیکن قرآن کریم میں ہے:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾﴾[62]

کہ شہید زندہ ہے۔ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ نبی زندہ ہے۔ یہاں شہید کی زندگی بتائی ہے۔ علماء نے لکھا کہ جب شہید؛ نبی کا امتی ہو کر زندہ ہے تو نبی پھر بڑھ کر زندہ ہے، اب اللہ نے شہید کی زندگی بتائی ہے نبی کی نہیں بتائی، کیوں کہ اگر اللہ قرآن میں بتا دیتے کہ نبی زندہ ہے تو شہید کو زندہ کون مانتا؟ لوگوں نے کہنا تھا کہ ہم اس لڑکے کو جانتے ہیں، یہ ہماری مسجد کے قریب رہتا تھا، ہم نے کبھی اس کو نماز پڑھتے نہیں دیکھا، اس کے تو چہرے پہ ڈاڑھی بھی نہیں تھی، یہ شہید ہو گیا ہے تو ہم اسے زندہ کیسے مان لیں؟ اب اگر اللہ؛ نبی کی حیات بتا دیتے تو شہید کی حیات سمجھ میں نہیں آنی تھی، شہید کی حیات بتائی ہے تو نبی کی حیات سمجھ میں آئی ہے۔

پیغمبر علیہ السلام کے ادب کے تقاضے:

اس طرح اگر اللہ یہاں فرما دیتے کہ "وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِمُحَمَّدٍ اِحْسَانًا" سجدہ تم خدا کو کرو اور ادب مصطفیٰ کا کرو تو والدین کا ادب سمجھ میں نہیں آنا تھا۔ اللہ نے ﴿وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ فرمایا ہے "وَبِمُحَمَّدٍ اِحْسَانًا" سمجھ میں آیا ہے۔

اب ذرا بات سمجھیں! کہ جب سجدہ خدا کو کرنا ہے اور ادب کائنات میں سب سے بڑھ کر مصطفیٰ کا کرنا ہے تو پھر اگلے جو پانچ احکام ہیں ان کا مطلب کیا ہو گا؟ اس کا مطلب ذوق سے سمجھ میں آتا ہے، بغیر ذوق کے سمجھ میں نہیں آتا۔

62۔ البقرۃ 154:2

[1]: ﴿فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ﴾ والدین کا ادب کرنا فرض ہے، ان کو "اف" کہنا گناہ ہے تو نبی کا ادب کرنا ایمان ہے اور "اف" کہنا کفر ہے۔

[2]: ﴿وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا﴾ والدین کا ادب کرنا فرض ہے اور ان کو ڈانٹنا جرم ہے، نبی کا ادب کرنا ایمان ہے اور نبی کے سامنے اونچا بولنا بھی کفر ہے۔

[3]: ﴿وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا﴾ والدین کا ادب کرنا فرض ہے اور والدین کے سامنے بے ہودہ بات کرنا جرم ہے۔ نبی کا ادب کرنا ایمان ہے اور نبی کے سامنے ایسا جملہ کہنا جس سے توہین کا پہلو نکلتا ہو ایسا جملہ کہنا بھی کفر ہے۔

[4]: ﴿وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾ والدین کا ادب کرنا فرض ہے تو والدین کے سامنے نظروں کو جھکانا اور بازو بچھانا فرض ہے۔ نبی کا ادب کرنا ایمان ہے اور نبی کے نام پر گردن کٹانا بھی ایمان ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

میں بار بار کہہ رہا ہوں کہ کسی آدمی میں علمی ذوق نہ ہو تو اس کو میری تقریر کا مزا نہیں آئے گا، ہماری گفتگو کے لیے علمی ذوق ہونا بہت ضروری ہے۔ میں ایک جملہ کہنے لگا ہوں۔

[5]: ﴿وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴾ یہ والدین کے لیے دعا ہے کہ اے اللہ! ان پر رحم فرما اور ان پر ایسا کرم فرما جیسے میں بچہ تھا تو مجھ پر یہ شفقت کرتے تھے، آج یہ بوڑھے ہیں تو ان پر آپ شفقت فرمائیں۔

میانہ روی کی تعلیم:

﴿وَ لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَ لَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿۲۹﴾﴾

اللہ پاک نے کیسا پیارا اصول بیان فرما دیا کہ جب پیسہ خرچ کرنے پر آؤ تو اتنا

بھی خرچ نہیں کرنا کہ خود فقیر ہو جاؤ اور اتنا بھی نہ روکنا کہ خود بخیل ہو جاؤ! نہ تم نے بخیل ہونا ہے اور نہ تم نے فقیر ہونا ہے، درمیانہ راستہ اختیار کرو، اللہ کے راستے میں خرچ بھی کرتے رہو اور اپنی ضرورت کے لیے پیسے رکھتے بھی رہو!

اولاد کو قتل نہ کرو!

﴿وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ اِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝۳۱﴾

اس وقت کے مشرک اور آج کے دور کے نام نہاد مسلمانوں کے دماغ ایک جیسے ہیں۔ وہ بھی کہتے تھے کہ اولاد کو قتل کرو، اگر یہ زندہ رہے تو انہیں کہاں سے کھلائیں گے؟ اور آج بھی لوگ یہی کہتے ہیں کہ بچے دو ہی اچھے! اگر زیادہ ہوں گے تو ہم انہیں کہاں سے کھلائیں گے۔

پہلے دور اور آج کے دور کے کافر میں فرق:

میں بار بار عرض کرتا ہوں کہ وقت کم ہوتا ہے، ایک ایک جملے پر بولنے کو جی چاہتا ہے۔ حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں۔ مولانا علی میاں فرماتے تھے کہ پہلے کے کافر کو سمجھنا بہت آسان تھا اور آج کے کافر کو سمجھنا بڑا مشکل ہے، کیوں کہ پہلے جب آدمی نظریہ بدلتا تھا تو اپنا نام بھی بدلتا تھا۔ کہتا تھا کہ میں مسلمان نہیں ہوں میں عیسائی ہوں، مسلمان نہیں ہوں میں فلاں فرقے کا ہوں اور آج کا مسلمان نظریہ بدلتا ہے اور نام نہیں بدلتا، نام مسلمانوں والا ہوتا ہے اور اندر عقیدہ مسلمانوں والا نہیں ہوتا، اس لیے آج کا کفر سمجھنا بہت مشکل ہے اور آج کے کفر کی اطلاع بھی بڑی مشکل ہے۔

مشرکین کا نظریہ یہ تھا کہ اگر یہ اولاد باقی رہی تو ہم کھلائیں گے کہاں سے؟

لہذا ان کو مار دو اور آج کے مسلمان کا عقیدہ ہے کہ اگر اولاد زیادہ ہو گئی تو سنبھالیں گے کیسے ؟لہذا گولیاں استعمال کرنی شروع کر دو! دونوں کے نظریہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ میں بات تمہیں ہنسانے کے لیے نہیں کہہ رہا، آپ کو پتا ہے کہ لطیفے سنانا میرا مزاج نہیں ہے، میں کوئی لطیفہ بھی سناؤں تو خالص عقیدے کی اصلاح کے لیے سناتا ہوں۔

ہاں البتہ ضرورت کی وجہ سے وقفہ کرنا پڑے تو اس کی شریعت میں گنجائش ہے۔ مثلاً کسی کی اہلیہ کے ہاں بڑا آپریشن ہوا، بچہ پیدا ہو گیا، اب آئندہ اگر بچہ نو ماہ میں ہو گیا تو پھر اس کو بڑے آپریشن کی ضرورت ہو گی تو اس کے لیے سنبھالنا بڑا مشکل ہو گا، اگر اس طرح کا کوئی عذر ہو اور وقفہ کریں تو یہ مسئلہ الگ ہے۔ لہذا اس دماغ کی اصلاح کرنا بہت ضروری ہے۔ اللہ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

انسان اشرف المخلوقات ہے:

﴿وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝﴾

اس آیت میں اللہ رب العزت نے بنی آدم کی فضیلت کا تذکرہ فرمایا ہے کہ ہم نے بنی آدم کو فضیلت بھی دی ہے، ان کو دریا اور خشکی میں سواریاں بھی دی ہیں، ہم نے ان کو پاکیزہ رزق بھی دیا ہے اور اپنی مخلوقات میں سے بہت بڑی مخلوق پر فضیلت اور ترجیح بھی دی ہے۔

فضیلت والی مخلوقات دو ہیں:

1: انسان 2: فرشتے

فرشتے اس لیے فضیلت والے ہیں کہ وہ خالص نورانی مخلوق ہیں۔

﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾[63]

فرشتوں میں اللہ نے گناہ کا مادہ ہی نہیں رکھا۔

اور انسان میں گناہ کا مادہ رکھا ہے اور پھر بھی انسان نیک کام کرتا ہے تو ملائکہ سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔

انسان اور فرشتوں میں افضل کون ہے؟

اللہ نے انسان کو تمام مخلوقات پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ اس ضمن میں ایک بات ذہن نشین فرمالیں! انبیاء علیہم السلام کی جماعتِ مقدسہ تمام فرشتوں حتی کہ بڑے بڑے چار فرشتوں؛ جبرائیل، میکائیل، اسرافیل اور ملک الموت علیہم السلام سے بھی افضل ہے۔ پھر یہ چار فرشتے انبیاء علیہم السلام کے علاوہ عام انسانوں سے افضل ہیں اور عام انسانوں میں سے جو اولیاء، اتقیا اور صالحین ہیں یہ عام ملائکہ سے افضل ہیں اور عام ملائکہ عام انسانوں سے افضل ہیں۔

یہی ترتیب مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے معارف القرآن میں بیان فرمائی ہے اور یہی تفصیل مفتی شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر عثمانی میں ارشاد فرمائی ہے۔

انسان کی فضیلت کی وجوہات:

انسان فرشتوں سے بھی اعلیٰ کیوں ہے؟ مفسرین نے اس کی کئی وجوہات لکھی ہیں۔ میں اتنی بات کہتا ہوں کہ انسان صورتاً بھی اعلیٰ ہے اور انسان سیرۃً بھی اعلیٰ ہے۔ اللہ نے انسان کی جو ظاہری صورت قرآن کریم میں بیان کی ہے:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ﴾

63۔ التحریم 6:66

کہ جتنی بھی مخلوقات موجود ہیں سب سے خوب صورت شکل اللہ نے انسان کو عطا فرمائی ہے۔

تو چاند سے زیادہ خوبصورت نہ ہوئی تو تجھے تین طلاق!

مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے سورۃ التین میں اسی آیت کے تحت ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ عیسیٰ بن موسیٰ ہاشمی جو خلیفہ ابو جعفر منصور کے دربار کے مخصوص لوگوں میں سے تھے اور اپنی بیوی سے بہت محبت رکھتے تھے ایک روز چاندنی رات میں بیوی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تو بول اٹھے:

أَنْتِ طَالِقٌ ثَلَاثًا إِنْ لَّمْ تَكُوْنِيْ أَحْسَنُ مِنَ الْقَمَرِ!

کہ اگر تو چاند سے زیادہ خوبصورت نہیں تو تجھے تین طلاق۔

میں نے کہا کہ چلو یہاں ایک بات تو سمجھ آگئی کہ یہ جو ذاکر نائیک بیچارہ بار بار کہتا ہے کہ تین طلاق ایک ہوتی ہے کیوں کہ وہ غصے میں طلاق دے دیتے ہیں تو میں نے کہا کہ اس نے تو غصے میں نہیں دی، اس نے تو گود میں رکھ کر طلاق دی ہے، اس نے تو پیار کے ساتھ طلاق دی ہے۔

تو عیسیٰ بن موسیٰ ہاشمی کا یہ جملہ کہنا تھا کہ عورت اٹھ کر پردے میں چلی گئی کیوں کہ ایک طلاق ہو تو رجوع ہو سکتا ہے اور جب تین طلاق دیں تو رجوع بھی نہیں سکتا تھا۔

اس سے پتا چلا کہ اس زمانے میں مرد حضرات کو تو چھوڑیں عورتیں بھی سمجھتی تھیں کہ تین طلاق دیں تو تین ہی ہوتی ہیں۔ اب وہ پریشانی کے عالم میں خلیفہ ابو جعفر منصور کے دربار میں گیا تو بادشاہ نے علماء کو بلا کر مسئلہ دریافت کیا کہ بتائیں! طلاق ہوئی یا نہیں ہوئی؟ سب علماء نے کہا کہ جی تین طلاقیں ہو گئی ہیں۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کے ایک شاگرد وہاں موجود تھے جو بالکل خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ فقیہہ کی

عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے علم کو جلدی ظاہر نہیں کرتا، اس سے کوئی پوچھے گا تو پھر بولے گا، عالم کو بولنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے بلکہ طلب کو دیکھ کر فتویٰ دینا چاہیے۔

خلیفہ نے ان سے پوچھا کہ آپ بتائیں! انہوں نے فرمایا کہ میں تو یہی عرض کروں گا کہ ایک طلاق بھی نہیں ہوئی۔ ان سے پوچھا گیا کہ کیوں؟ انہوں نے کہا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝۴﴾

اللہ نے انسان کو ساری مخلوقات سے خوب صورت بنایا ہے۔ تو چاند بھی ایک مخلوق ہے، جب اللہ فرمائیں کہ سب سے خوب صورت انسان ہے تو قرآن سے ان کی بیوی کا چاند سے زیادہ خوب صورت ہونا ثابت ہو گیا، لہذا ایک طلاق بھی نہیں ہوئی۔ [64]

یہ امام صاحب کے شاگرد کا علم تھا، بتائیں کہ امام صاحب کا علم کتنا وسیع ہو گا؟

چور پکڑا گیا اور طلاق بھی نہیں ہوئی:

اس پر بات چل پڑی ہے تو میں ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے دور میں کچھ چور آئے اور ایک محلہ میں انہوں نے چوری کی اور گھر کا سارا سامان چوری کر کے لے گئے۔

مالک مکان نے انہیں دیکھ لیا اور پہچان لیا کہ یہ کون ہیں۔ چوروں نے سوچا کہ یہ صبح تھانیدار کو بتا دے گا تو ہم پکڑیں جائیں گے، اب کیا کریں؟ ایک نے کہا کہ اس کو قتل کر دو۔ دوسرے نے کہا کہ قتل نہیں چھپتا، یہ معاملہ بڑا مشکل ہے کچھ اور کرو!

64۔ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ج2 ص3344

ان چوروں نے کہا کہ اس سے طلاق کی قسم لے لو! چنانچہ مالک مکان سے کہا کہ ہم تجھے مار دیں گے، اگر جان بچانا چاہتے ہو تو یہ قسم کھالو کہ اگر تم نے کسی کو ہمارے بارے میں بتایا کہ یہ چور ہیں تو تیری بیوی کو تین طلاق۔ اس نے جان کے خوف سے قسم کھالی۔ چور تسلی سے چلے گئے۔ اس سے پتا چلا کہ اس وقت کے چور بھی سمجھتے تھے کہ تین طلاق دیں تو تین ہوتی ہیں۔ بادشاہ، وزیر اور عورتوں کا کیا کہنا چوروں کو بھی علم تھا کہ تین طلاق دو تو تین ہوتی ہیں۔

خیر صبح ہوئی تو اس نے دیکھا کہ وہی چور اس کا سامان بازار میں فروخت کر رہے ہیں۔ اب یہ بیچارہ بتا بھی نہیں سکتا کیونکہ اگر بتاتا ہے تو اس کی بیوی کو تین طلاق پڑتی ہے۔ یہ شخص حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گیا اور کہا کہ امام صاحب! میرے گھر میں رات کو چوری ہو گئی ہے اور چور محلے کے ہیں، میری کچھ مدد فرمائیں! امام صاحب نے کہا کہ تم مجھے بتاؤ میں گرفتار کرا دیتا ہوں۔ اس نے کہا کہ بتاؤں گا تو بیوی نہیں رہے گی، اگر نہیں بتاتا تو مال نہیں رہے گا، اب میں تو پھنس گیا ہوں۔ امام صاحب نے پوچھا کہ مسئلہ کیا ہے؟ اس نے ساری بات بتائی۔ امام صاحب نے فرمایا کہ تو فکر نہ کر!

امام صاحب نے تھانیدار سے کہا کہ محلے کے سارے لڑکوں کو جمع کر دو اور اس مالک مکان سے کہا کہ تو مسجد کے دروازے پر کھڑا ہو جا! تھانیدار سے کہا کہ ایک ایک لڑکے کو بلاؤ اور اس سے پوچھو کہ کیا اس لڑکے نے چوری کی ہے؟ مالک مکان سے کہا کہ اگر وہ چور نہ ہو تو کہہ دینا کہ اس نے چوری نہیں کی، اور جب چور آئے تو تو نے چپ کر جانا ہے، تو نے بولنا نہیں ہے۔ اب تھانیدار نے ایک لڑکے کو بلایا اور اس مالک مکان سے پوچھا: اس نے چوری کی ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ پھر پوچھا: یہ چور ہے؟ کہا: نہیں۔ یہ چور ہے؟ کہا: نہیں۔ جب چور آیا اور اس سے پوچھا کہ یہ چور ہے؟ تو اب وہ

خاموش ہو گیا۔ تو امام صاحب نے فرمایا کہ اس کو پکڑ لو، یہی چور ہے۔

اب دیکھو چور بھی پکڑا گیا اور بیوی کو طلاق بھی نہیں ہوئی، طلاق تو تب ہوتی جب وہ یہ بتاتا کہ یہ چور ہے۔ اسی لیے آج لوگ امام صاحب کے مخالف ہیں کہ امام صاحب چوروں کو پکڑ لیتے تھے۔ تو لوگ امام صاحب سے ناراض ہوتے ہیں کہ امام صاحب چوروں کو پکڑتے کیوں تھے؟ اس لیے آپ حضرات پریشان نہ ہوا کریں۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے آدمی تھے۔

امام اعظم نے امام اعمش کی مشکل حل کر دی:

تین طلاق پر ایک واقعہ میں اور پیش کر دوں۔ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ایک استاذ امام اعمش تھے جن کی آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں جنہیں عربی زبان میں "اعمش" کہتے ہیں۔ وہ خوب صورت نہیں تھے لیکن ان کی بیوی خوب صورت تھی۔ اس لیے ان کے گھر میں اَن بَن رہتی تھی۔ کبھی کوئی بات، کبھی کوئی بات.... ایک مرتبہ رات گھر میں کوئی بات بڑھ گئی تو امام اعمش نے غصے میں آکر اپنی بیوی کو کچھ کہہ دیا تو بیوی چپ ہو گئی، ناراض ہو گئی اور خاموش ہو کر بیٹھ گئی اور ان سے بات کرنا بند کر دی۔ امام اعمش رحمہ اللہ نے غصے میں آکر کہا: اگر تو نے صبح کی اذان تک مجھ سے بات نہ کی تو تجھے تین طلاق! امام اعمش نے غصے میں آکر کہہ تو دیا لیکن وہ تو اور پکی ہو گئی اور نہ بولی۔ وہ تو جان پہلے سے چھڑانا چاہتی تھی، وہ بہانے تلاش کر رہی تھی۔

اب امام اعمش رحمہ اللہ پریشان ہوئے کہ اس نے تو بولنا نہیں ہے۔ وہ اسی وقت رات کو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے دروازے پر گئے اور دستک دی۔ کہا: ابو حنیفہ! میں پریشان ہوں، اس مسئلہ کا حل تو بتائیں۔ مسئلہ بتایا تو امام صاحب فرمانے لگے کہ اپنی مسجد کے مؤذن سے کہیں کہ آج فجر کی اذان آپ کے کہنے پر نہیں بلکہ آج میرے کہنے پر دے! جس وقت میں اسے کہہ دوں تو وہ اس وقت اذان دے۔ انہوں

نے کہا کہ پھر؟ امام صاحب نے کہا کہ آپ سکون کے ساتھ آرام فرمائیں، اگلا کام میرا ہے۔ امام اعمش جا کر سوئے لیکن اب نیند نہ آئے۔ ان کو پتا تھا کہ بیوی نے بولنا نہیں ہے اور اذان ہو جانی ہے۔ اب پریشانی ہے۔

امام صاحب فجر کی اذان شروع ہونے سے مثلاً ایک گھنٹہ پہلے ان کی مسجد میں گئے اور مؤذن سے کہا کہ اذان دو! اس نے کہا کہ ابھی تو وقت شروع نہیں ہوا۔ فرمایا کہ تمہیں امام اعمش نے کچھ کہا تھا؟ جی کہا تھا کہ آج صبح کی اذان ابو حنیفہ کے کہنے پر دینا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ پھر اذان دے دیں۔ مؤذن اٹھا اور اس نے اذان دے دی۔ جب اذان کی آواز امام اعمش کے گھر پہنچی تو امام اعمش کی بیوی بول پڑی کہ اب خوش ہے؟ یعنی میں نہیں بولی اور طلاق ہو گئی ہے۔

حضرت امام اعمش پھر امام صاحب کے دروازے پر گئے کہ ابو حنیفہ! آپ کہتے تھے کہ طلاق نہیں ہو گی وہ تو ہو گئی۔ امام صاحب نے فرمایا! آپ آرام فرمائیں، یہ میرا کام ہے۔ انہوں نے کہا کہ ابو حنیفہ! میں اپنی بیوی کا مزاج سمجھتا ہوں۔ امام صاحب نے فرمایا کہ میں شریعت کا مزاج میں سمجھتا ہوں، آپ آرام فرمائیں۔ امام اعمش گھر گئے لیکن نیند کیسے آئے۔ ایک گھنٹے کے بعد مؤذن نے اعلان کیا کہ آج اذان وقت سے پہلے دی تھی، اب میں وقت پر اذان دینے لگا ہوں۔ امام اعمش نے بیوی سے کہا کہ اب خوش ہے؟ بیوی نے کہا: لگتا ہے کہ تو ابو حنیفہ سے مل کر آیا ہے۔

انسان؛ سیرت اور صورت میں اعلیٰ مخلوق:

تو خیر میں عرض کر رہا تھا کہ اللہ نے انسان کو تمام مخلوقات پر فوقیت دی ہے صورت میں بھی اور سیرت میں بھی۔

انسان کی صورت بھی تمام مخلوقات سے بہتر ہے اور صورت کا بہتر ہونا تو ہر بندہ مشاہدہ کر رہا ہے کہ جس قدر حسنِ صورت اللہ نے انسان کو دیا ہے اس کی دنیا میں

کوئی مثال نہیں ملتی۔ دنیا میں سوائے انسان کے کوئی ایک جاندار بھی ایسا نہیں جو انسان کی طرح ہاتھ سے کھاتا ہو، جو بھی کھائیں گے یا تو اپنے منہ سے کھائیں گے یا پاؤں اور منہ کا اکٹھا استعمال کریں گے، صرف ہاتھ کے ذریعے منہ میں لقمہ ڈالتا ہو یہ انسان کا خاصہ ہے، دوسری کوئی مخلوق نقل کر کے چند لقمے تو انسان کی طرح کھائے گی لیکن مستقل ہاتھ سے کھانا یہ انسان کا خاصہ ہے۔

پھر دنیا میں جس قدر مخلوقات غذائیں کھا رہی ہیں تو ان غذاؤں کی بھی دو قسمیں ہیں:

1: مفرد غذا 2: مرکب غذا

کوئی آدمی صرف گڑ کھالے تو یہ مفرد غذا ہے، صرف چینی کھالے تو یہ بھی مفرد ہے، صرف پھل کھالے یہ بھی مفرد ہے، صرف گنا چوس لے یہ بھی مفرد ہے، اب کئی کو جمع کر کے نئی غذا تیار کرنا یہ انسان کا خاصہ ہے، انسان کے علاوہ جتنی مخلوقات ہیں ان کی غذا مفرد ہے اور انسان کی غذا مفرد بھی ہے اور مرکب بھی ہے۔ آپ دیکھ لیں! گوشت اور سبزی ملا کر کھا رہا ہے جبکہ کسی مخلوق کو دیکھیں تو وہ صرف سیب کھا رہا ہے، کسی کو دیکھیں تو وہ صرف کیلا کھا رہا ہے، ایک ایک چیز ہی کھانی ہے اور انسان کو دیکھ لیں کہ سیب بھی ہے، کیلا بھی ہے، اور فروٹ بھی ہیں اور سب کو ملا کر فروٹ چاٹ بنا کر کھا رہا ہے۔

تو دنیا میں جتنے بھی حیوانات کی قسمیں ہیں ان سب کی غذا مفرد ہے اور مرکب غذا صرف انسان کا خاصہ ہے۔

اس کی وجہ انسان کی حسنِ صورت بھی ہے اور حسنِ عقل بھی ہے۔ جس قدر دنیا میں مخلوقات موجود ہیں اس قدر عقل کسی کے پاس نہیں جس قدر اللہ رب العزت نے انسان کو عطا فرمائی ہے۔ انسان کی صورت، انسان کی عقل، انسان کا کردار، انسان

کی سیرت یہ ایسی ہیں جن کی بنیاد پر اللہ نے انسان کو تمام مخلوقات پر فوقیت عطا فرمائی ہے۔

فضیلتِ انسان کی وجوہات:

میں یہاں دو باتیں بڑی اہمیت سے پیش کرنا چاہتا ہوں، آپ اُن پر توجہ دیں:

[1]: جو علم انسان کے پاس موجود ہے وہ علم انسان کے علاوہ کسی کے پاس موجود نہیں۔ آپ کہیں گے کہ وہ کیسے؟ انسان کے پاس وہ علم ہے جسے "علم الٰہی" کہتے ہیں، علم الٰہی پہلے نبی کو ملتا ہے پھر نبی کی وساطت سے آگے امت کو ملتا ہے۔ تورات، زبور، انجیل اور قرآن کو اللہ نے فرشتوں کو نہیں دیا، اللہ نے اپنا یہ کلام جنوں کو نہیں دیا، اللہ نے یہ کلام انسانوں کو دیا ہے، تو انسان کے پاس وہ علم ہے جسے "علم الٰہی" کہتے ہیں۔

[2]: جو بات میں سمجھانے لگا تھا وہ یہ کہ انسان اور باقی مخلوقات میں کیا فرق ہے؟ بعض مخلوقات میں عقل ہے لیکن خواہشات نہیں اور بعض مخلوقات میں شہوات ہیں لیکن عقل نہیں ہے، انسان ایسی مخلوق ہے کہ جس میں عقل بھی ہے اور شہوت بھی ہے۔ تو جن میں صرف شہوات ہیں وہ حیوان ہیں اور جن میں محض عقل ہے شہوات نہیں وہ ملائکہ ہیں۔ انسان میں شہوات بھی ہیں اور عقل بھی ہے۔ اگر انسان عقل کو چھوڑ کر شہوات اختیار کرے تو ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾[65] یہ جانوروں سے بھی بدتر ہے اور اگر یہ شہوات کو چھوڑ کر عقل اختیار کرے تو یہ فرشتوں سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ تو یہ انسان کے وہ کمالات ہیں جو کسی اور مخلوق میں نہیں ہیں۔ اسی لیے اللہ رب العزت نے اپنا نائب انسان کو بنایا ہے۔ جبرئیل علیہ السلام جیسے مقدس فرشتے کو بھی نہیں بنایا۔ فرمایا:

65۔ الاعراف 179:7

﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ﴾[66]

کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں تمہاری کیا رائے ہے؟ فرشتوں کی رائے معلوم کرنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ اللہ مشورہ کر رہے تھے۔ اللہ رب العزت امت کو درس دینا چاہتے تھے کہ جب تم کوئی کام کرو تو مشورہ کر لیا کرو۔ یہ ہمیں راستہ دکھایا ہے ورنہ اللہ کو مشورہ کی ضرورت نہیں۔ اس کے جواب میں فرشتوں نے کہا:

﴿اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾

اے اللہ! آپ ایسے انسان کو پیدا کریں گے جو زمین میں فساد کرے گا، خون بہائے گا؟

اللہ تعالی نے فرمایا:

﴿اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾﴾

جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔

میں صرف ایک بات عرض کرتا ہوں کیونکہ مجھے پوری سورت کو بیان کرنا ہوتا ہے، میں مختصر مختصر باتیں کرتا جاتا ہوں۔ آپ حضرات نے ابھی رمضان المبارک میں بھی احادیث مبارکہ سنی ہوں گی کہ عید کے دن اللہ رب العزت ملائکہ سے پوچھتے ہیں کہ اے ملائکہ تم مجھے بتاؤ!

"مَا جَزَاءُ الْأَجِيرِ إِذَا عَمِلَ عَمَلَهُ؟ فَتَقُولُ الْمَلَائِكَةُ: إِلٰهَنَا وَسَيِّدَنَا! جَزَاؤُهُ أَنْ تُوَفِّيَهُ أَجْرَهُ"[67]

جو مزدور اپنی مزدوری پوری کرے اس کی اجرت اور جزا کیا ہے؟ فرشتے

66۔ البقرۃ 30:2

67۔ شعب الایمان للبیہقی: ج 3 ص 336 رقم الحدیث 3695

کہتے ہیں: اللہ! اس کی جزا یہ ہے کہ اس کی مزدوری پوری دے دی جائے۔ پھر جب انسان عید گاہ سے واپس لوٹتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اے فرشتو! گواہ بن جاؤ، میں نے اپنے بندوں کو معاف کر دیا ہے۔

آپ نے کئی ایسی احادیث سنی ہوں گی کہ جن میں ہوتا ہے کہ اللہ فرماتے ہیں کہ فرشتو! گواہ بن جاؤ، فرشتو! گواہ بن جاؤ۔ ان پر سوال یہ ہوتا ہے کہ اللہ ملائکہ کو گواہ کیوں بناتے ہیں؟

محدثین نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ جب اللہ نے انسان کو پیدا کیا تو اللہ نے پوچھا تھا: ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ کہ میں زمین میں انسان کو اپنا خلیفہ بنانے لگا ہوں، تمہاری رائے کیا ہے؟ انہوں نے کہا تھا کہ یہ فساد کرے گا اور خون بہائے گا تو اب اللہ تعالیٰ ان فرشتوں کو وہ ماضی یاد دلاتے ہیں کہ تم نے کہا تھا کہ انسان فساد کریں گے، اب تمہی گواہ بنو کہ میں نے انہیں معاف کر دیا ہے۔ اب تم گواہ رہو کہ یہ جولائی کی گرمی کے روزے رکھتا ہے، تم گواہ رہو کہ یہ رات کو تراویح پڑھتا ہے، تم بھی گواہ رہو کہ یہ رات کو تہجد پڑھتا ہے، تم گواہ رہو کہ حق پر ہونے کے باوجود حق کو معاف کر دیتا ہے۔ تو تمہی نے کہا تھا کہ یہ خون بہاتا ہے۔ اب یہ دیکھو کہ میں کیسے معاف کرتا ہوں! اس لیے فرشتوں کو گواہ بنا کر ایسی باتیں ارشاد فرماتے ہیں۔

اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

جو یہاں اندھا وہ وہاں بھی اندھا (ایک واقعہ):

﴿وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۷۲﴾﴾

جو شخص دنیا میں دین سے آنکھیں بند کر کے اندھا ہو جائے تو قیامت کے دن اس کی آنکھیں بند ہوں گی، وہ جنت میں نہیں جا سکتا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک

غیر مقلد آ گیا۔ آنکھ کا بھی اندھا ہے اور دل کا بھی اندھا ہے۔ اس نے کہا کہ حضرت! میں نے آپ سے امام ابو حنیفہ کے چند مسائل پر بات کرنی ہے کیوں کہ امام ابو حنیفہ تاویلیں بہت کرتے ہیں۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ تونے بات کرنی ہے پر میں نے تم سے نہیں کرنی۔ اس نے کہا: کیوں؟ حضرت تھانوی فرمانے لگے کہ اگر میں نے تجھے قائل کر بھی لیا تو فائدہ کوئی نہیں۔ اس نے کہا: فائدہ کیوں نہیں؟ اگر آپ نے مجھے قائل کر لیا تو میں مان لوں گا۔ حضرت نے فرمایا: اگر تونے مان لیا تو پھر؟ اس نے کہا کہ آپ کے مذہب کے مطابق ہدایت پر آؤں گا۔ فرمایا: پھر؟ اس نے کہا کہ ہدایت پر آؤں گا تو جنت میں جاؤں گا۔ فرمایا: اگر تم ہدایت پر آؤگے تو جنت میں پھر بھی نہیں جا سکتے۔ اس نے کہا: جی وجہ؟ فرمایا: قرآن کریم میں ہے:

﴿وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا﴾

کہ جو دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہو گا۔ تو اندھا بندہ جنت میں نہیں جا سکتا تو تجھ سے بحث کرنے کا فائدہ کیا ہوا؟ وہ کہنے لگا کہ نہیں نہیں اس آیت کا مطلب یہ ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ تاویل نہیں کرنی، تاویل نہیں کرنی، اس نے کہا کہ آیت کا مطلب یہ ہے۔ فرمایا: نہیں، مطلب کیا ہوتا ہے؟ جب امام اعظم ابو حنیفہ فرمائیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے تو تم کہتے ہو کہ تاویل کی ہے اور اب تو خود تاویل کیوں کرتا ہے؟ اس نے کہا کہ تاویل نہ کریں تو قرآن حل نہیں ہوتا۔ حضرت تھانوی نے فرمایا کہ یہی بات امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ تم تاویل کرو تو ٹھیک ہے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تاویل کریں تو غلط ہے۔ بڑی عجیب بات ہے۔

”اللہ کہاں ہے؟“ کے عنوان پر مکالمہ:

میں ایک مرتبہ بحرین میں تھا، رمضان المبارک میں ایک غیر مقلد مجھے ملا تو کہا کہ اللہ کہاں پر ہے؟ میں نے کہا کہ ہر جگہ پر ہے۔ اس نے کہا کہ ہر جگہ پر ہے تو

دلیل پیش کریں۔ میں نے کہا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾[68]

مشرق بھی اللہ کا مغرب بھی اللہ کا، جدھر رخ کروگے ادھر اللہ موجود ہے۔

مجھے کہتا ہے کہ یہاں اللہ کی ذات نہیں بلکہ اس سے مراد ہے کہ اللہ کی صفت علم موجود ہے۔ اس کے دفتر میں غیر مقلد عالم محمد جوناگڑھی کا ترجمہ قرآن موجود تھا۔ میں نے کہا کہ یہ ترجمہ تمہارے عالم کا ہے؟ کہتا ہے: جی ہاں۔ میں نے کہا کہ اس آیت کا ترجمہ پڑھ کیا لکھا ہے؟ اب محمد جوناگڑھی صاحب نے ترجمہ لکھا ہے:

"اور مشرق اور مغرب کا مالک اللہ ہی ہے۔ تم جدھر بھی منہ کرو ادھر ہی اللہ کا منہ ہے۔"[69]

میں نے کہا کہ منہ علم کا ہوتا ہے یا ذات کا ہوتا ہے؟ منہ قدرت کا ہوتا ہے یا ذات کا ہوتا ہے؟ میں نے کہا کہ اس سے پتا چلا کہ اللہ کی ذات ادھر ہے جدھر تم منہ کروگے۔ جب پھنس گیا تو مجھے کہتا ہے کہ میں اس کا جواب اپنے شیخ صاحب سے لا کر دوں گا۔ میں نے کہا کہ شیخ صاحب سے نہیں تُو اس کا جواب اللہ پاک سے لے! مجھے کہتا ہے کہ اللہ سے کیوں لیں؟ میں نے کہا کہ جب ہم آیت امام ابو حنیفہ سے سمجھیں تو تم کہتے ہو کہ مشرک ہو اور جب تو آیت اپنے شیخ سے سمجھے گا تو تُو مؤمن ہو گا؟ کہتا ہے کہ جی اللہ سے تو نہیں سمجھ سکتے۔ تو میں نے کہا کہ پھر اپنے شیخ کے بجائے امام اعظم ابو حنیفہ سے سمجھ جو صحابہ رضی اللہ عنہم کا شاگرد ہے۔ آج کے دور کے بندے کو تو تم مانتے ہو اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور کے بندے کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہو! اللہ ہمیں یہ

68۔ البقرۃ 115:2

69۔ تفسیر احسن البیان: ص 95

بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

عصمتِ انبیاء علیہم السلام:

مضمون تو لمبا ہے میں اختصار سے بات کرنے لگا ہوں، ہم اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ ہے کہ نبی معصوم ہیں اللہ رب العزت نبی کو گناہوں سے محفوظ رکھتے ہیں نبی سے گناہ نہیں ہونے دیتے، اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿٧٣﴾ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ﴿٧٤﴾ۙ﴾

اب جس کو عربی گرائمر آتی ہو تو مزہ اس کو آتا ہے۔ اللہ فرماتے ہیں: میرے پیغمبر! آپ جو ان کی بات نہیں مانتے اور ہدایت پر رہتے ہیں ہم آپ کی حفاظت کرتے ہیں اور اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو نتیجہ یہ نکلتا کہ آپ تھوڑا سا مائل ہونے کے ہلکا سا قریب ہو جاتے۔

یہاں لفظ دیکھیں: ﴿وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ﴾ اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے، تو ﴿لَقَدْ﴾ عربی میں قریب کے معنی کے لیے آتا ہے، پھر فرمایا: ﴿كِدْتَّ﴾ اس کا معنی ہے قریب، پھر ﴿تَرْكَنُ﴾ فرمایا، اس کا معنی ہے مائل ہونا، ﴿شَيْـًٔا﴾ کا معنی ہے تھوڑا سا اور ﴿قَلِيْلًا﴾ کا معنی ہے بہت تھوڑا۔

اب آپ آیت سمجھیں! اس آیت میں اللہ نے اپنے نبی کی فطرت بیان فرمائی ہے کہ نبی کی فطرت اتنا عمدہ ہوتی ہے کہ اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو قریب تھا کہ آپ مائل ہو جاتے تھوڑا سا بہت تھوڑا سا۔ اب یہ ”بہت تھوڑا“ میرے اور آپ کے اعتبار سے نہیں ہے یہ اللہ کے اعتبار سے ہے۔ جب اللہ کسی چیز کو ”بہت

تھوڑا" فرمادیں تو بتاؤ وہ کتنا تھوڑا ہو گا؟ اس سے اندازہ کریں کہ نبی کی طبیعت کتنی صاف ہوتی ہے! اللہ فرماتے ہیں: میرے پیغمبر! ہم نے ثابت قدم رکھا اور آپ ان کی بات نہیں مانتے، اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو بالکل معمولی سا آپ کسی درجے میں ان کی طرف مائل ہونے کے ہلکا سا قریب ہو جاتے یعنی اللہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت بیان فرماتے ہیں کہ جو باطل کو قبول کرتی ہی نہیں ہے چہ جائیکہ اللہ کی حفاظت کا پردہ اس پر موجود ہو تو پھر پیغمبر باطل کی طرف کیسے جاسکتے ہیں؟ نبی کا مزاج ایسا ہے کہ نبی باطل کے قریب ہی نہیں جاتا۔

صدیق عکسِ جمالِ پیغمبر:

اگر کسی شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عکس دیکھنا ہو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج کو سمجھنا ہو تو اس کی دنیا میں سب سے بہترین مثال پیغمبر کا صدیق ہوتا ہے، وہ صدیق کو دیکھ لے تو پیغمبر کا مزاج سمجھ آجائے گا۔ اس لیے کہ صدیق وہ ہوتا ہے جو پیغمبر کا عکس ہو، پیغمبر کے مزاج کو سمجھتا ہو اسے صدیق کہتے ہیں اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس حیثیت سے صدیق اور صدیق اکبر ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

بانی دار العلوم دیوبند قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صدیق وہ ہوتا ہے جو باطل کو اس طرح پھینک دیتا ہے جس طرح معدہ مکھی کو پھینک دیتا ہے، جس طرح معدہ مکھی کو قبول نہیں کرتا اسی طرح صدیق وہ ہے جو کذب کو قبول ہی نہیں کرتا۔ کبھی آپ نے سنا ہے کہ کسی کے معدہ میں مکھی چلی گئی ہو؟ مکھی اگر معدہ کی طرف جائے بھی تو انسان خود بخود ڈکار لینا شروع کر دیتا ہے اور اس کو باہر پھینکتا ہے، اور حضرت نانوتوی رحمہ اللہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ معدہ جس طرح مٹھاس قبول کرتا ہے اس طرح صدیق وہ ہے جو صداقت کو قبول کرتا ہے۔

دنیا میں معدہ کا نظامِ ہضم بہترین بنانے کی سب سے مضبوط چیز میٹھا ہے۔ عموماً لوگ کھانے کے بعد میٹھا کھاتے ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ معدہ کی خاصیت یہ ہے کہ اس کو معدہ بہت جلد قبول کرتا ہے۔ اگر کسی کے معدہ میں مرچیں بھی موجود ہوں تو اس کو ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس میں مٹھاس ڈال دیں، جس طرح معدہ مٹھاس قبول کرتا ہے، صدیق اسی طرح حق کو قبول کرتا ہے۔

مجھے ایک بات پر بہت تعجب تھا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بہت ساری باتیں ایسی ہیں جو انسان کو بہت دیر کے بعد سمجھ میں آتی ہیں۔ یہ سن 1994 کی بات ہے، میں اس وقت کینیا گیا اور کینیا سے آگے زمبیا کے ایک شہر دساکا اور چپاٹا میں گیا، یہ میری زندگی کا پہلا سفر تھا، اس وقت میری عمر 24 سال ہو گی۔ تو مجھے کہا گیا کہ وہاں راستے میں فلاں شہر میں ایک پاکستانی مولانا صاحب ہیں وہ آپ کے میزبان ہیں اور آپ کو وہ کھانا کھلا کر چپاٹا چھوڑ کر آئیں گے۔ پہلی بار ہم وہاں گئے ہیں تو ہندوستان کے گجراتی لوگ کھانا پکانے میں بہت مشہور ہیں، ان کے ہاں ہماری دعوت تھی۔ تو میں نے دیکھا کہ کھانا بعد میں آیا اور میٹھا پہلے آ گیا۔ مجھے بڑا تعجب ہو گیا کہ ہم تو میٹھا بعد میں کھاتے ہیں یہ پہلے کیوں لائے؟ تو جو پہلے مولانا صاحب بیٹھے تھے انہوں نے کہا کہ گجراتیوں کا مزاج ہے کہ یہ میٹھا پہلے کھاتے ہیں، تو میں نے بھی کھالیا اور کھانا بھی کھالیا۔

اب جو بات میرے لیے ناقابلِ فہم تھی وہ یہ تھی کہ عموماً کھانے کے بعد میٹھا کھایا جاتا ہے اور یہ کھانے سے پہلے میٹھا لے آیا۔ چلتے چلتے یہ بات مجھے سال 2013 میں یعنی انیس سال بعد سمجھ آئی، تو حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کا یہ جملہ پڑھا کہ صدیق صداقت کو ایسے قبول کرتا ہے کہ جیسے معدہ مٹھاس کو قبول کرتا ہے۔ مجھے اب سمجھ میں بات آئی کہ وہ لوگ پہلے کیوں کھاتے ہیں! جس نے کھانا تھوڑا کھانا ہو اور بعد میں کھانا ہضم کرنا ہو تو وہ کھانے کے بعد میٹھا کھائے تاکہ جو کچھ کھایا وہ ہضم ہو

جائے اور جس نے کھانا خوب کھانا ہو وہ کھانے سے پہلے میٹھا کھاتا ہے تاکہ پہلی خوراک کو معدہ ہضم کر دے اور اوپر کھانا خوب کھائیں! مجھے اس وقت سمجھ میں آئی کہ وہ لوگ میٹھا پہلے کیوں کھاتے ہیں!

میں نے کہا: اگر اللہ مجھے اب وہاں لے گئے تو میں ان کو بتاؤں گا کہ آپ لوگ میٹھا پہلے کیوں کھاتے ہیں۔ مجھے انیس سال بعد یہ بات سمجھ میں آئی۔ میں نے اللہ کا کتنا شکر ادا کیا میں بتا نہیں سکتا۔ آدمی کا دلی ذوق ہو تو پھر کتنی خوشی ہوتی ہے کہ یار کتنے عرصے سے میرے ذہن میں ایک نکتہ تھا، تو اللہ کا شکر ہے کہ آج وہ حل تو ہو گیا۔ اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

نماز پنجگانہ کا تذکرہ:

﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ وَ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ؕ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ کَانَ مَشۡہُوۡدًا ﴿۷۸﴾﴾

اس آیت میں اللہ رب العزت نے پانچوں نمازوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اس میں فرمایا: اے پیغمبر! آپ نماز قائم کریں ﴿لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ﴾ سورج کے مائل ہونے کے بعد سورج کے چھپ جانے تک، رات کے چھا جانے تک۔

سورج مائل اس وقت ہوتا ہے جسے حدیث میں "زوال" کہتے ہیں۔ تو اب زوالِ شمس کے بعد ہے "ظہر" اس کے بعد ہے "عصر"، اس کے بعد ہے "مغرب" اور اس کے بعد ہے "عشاء"۔ کب تک؟ ﴿اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ﴾ رات کے چھا جانے تک۔ تو سورج کے زائل ہونے کے بعد سے رات کے چھا جانے تک چار نمازوں کا بیان ہے۔

آگے فرمایا: ﴿وَ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ﴾ یہاں "قرآن" سے مراد صلوٰۃ ہے یعنی نمازِ فجر مراد ہے۔ اللہ نے یہاں صلوۃ کے بجائے قرآن فرمایا، کیوں کہ فجر کی نماز میں عام

نمازوں کی بنسبت قرآن اتنا زیادہ پڑھا جاتا ہے کہ خدا نے نماز کا نام ہی قرآن رکھ دیا ہے۔ تو اس آیت میں پانچوں نمازیں آ گئی ہیں۔

فقاہتِ امام اعظم ابو حنیفہ:

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ دیکھیں! عربی زبان میں دو لفظ ہیں؛ ایک ہے "شفق احمر" اور ایک ہے "شفق ابیض"۔ شفق کہتے ہیں کہ جب سورج غروب ہوتا ہے تو اس کے بعد ایک سرخی ہوتی ہے اور ایک سفیدی۔ اب جب سورج غروب ہوگا تو پہلے مشرق کی جانب سرخی ہوگی، پھر سرخی ختم ہوتی جائے گی اس کے بعد سفیدی آئے گی۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سورج غروب ہونے کے بعد تھوڑی سی سرخی رہ جاتی ہے اسے کہتے ہیں "شفق احمر"۔ اس سرخی کے ختم ہونے کے بعد ایک سفیدی آتی ہے اسے کہتے ہیں "شفق ابیض"۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عشاء کا وقت اس وقت شروع ہوتا ہے جب شفق احمر اور شفق ابیض ختم ہو جائیں، کیوں کہ قرآن کہتا ہے: ﴿إِلَىٰ غَسَقِ اللَّيْلِ﴾ پانچوں نمازیں کب ہیں؟ سورج کے مائل ہونے کے بعد رات کے چھا جانے تک، اور رات کا چھا جانا تب شمار ہوتا ہے جب سفیدی اور سرخی دونوں ختم ہو جائیں۔ آپ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی فقاہت دیکھیں! اللہ ہمیں اتنے عظیم فقیہ کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)

نماز تہجد کا اہتمام کیجیے!

﴿وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسَىٰ أَن يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا ﴿٧٩﴾﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے میرے پیغمبر! آپ تہجد کی نماز پڑھیں۔

"تہجد" عربی زبان کا لفظ ہے اور عجیب بات ہے کہ اس لفظ کے متضاد معنی ہیں۔ عربی زبان میں جاگنے کو بھی "هَجُدٌ" کہتے ہیں اور عربی زبان میں سونے کو بھی "هَجُدٌ" کہتے ہیں۔ اب تہجد کا معنی بعض لوگ کہتے ہیں کہ آدمی عشاء کی نماز پڑھے پھر سو جائے اور پھر اٹھ کر تہجد پڑھے، یہ سونا ضروری نہیں ہے اس لیے کہ ﴿وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ﴾ کا معنی یہ ہے کہ آپ نیند کم کریں، رات کا کچھ حصہ جاگیں! اگر آدمی سویا اور سو کر پھر اٹھا تو اس نے نیند کچھ کم کی ہے اور اگر عشاء کی نماز پڑھی اور سویا نہیں اور پھر تہجد پڑھی، پھر تہجد پڑھنے کے بعد سویا تو اس نے بھی نیند کچھ کم کی ہے۔ تو اگر پہلے پڑھ لے تو اس نے بھی نیند کم کی ہے اور صبح اٹھ کر پڑھ لے تو اس نے بھی نیند کم کی ہے۔ دونوں صورتوں میں نیند کا کم کرنا یہ لفظ دونوں کو شامل ہے۔

اس لیے تہجد کے نوافل کا افضل وقت یہ ہے کہ آدمی سو جائے اور صبح اٹھ کر آٹھ رکعات پڑھے اور اگر کسی کو اندیشہ ہو کہ صبح نہیں اٹھ سکتا تو وہ عشاء کی نماز کے بعد تہجد کی نیت سے آٹھ رکعات پڑھ کر سو جائے۔ اللہ رب العزت اس کو آٹھ رکعات تہجد کا مکمل اجر وثواب عطا فرمائیں گے۔

پہلے امت پر تہجد فرض تھی جس کا ذکر سورۃ مزمل میں موجود ہے، بعد میں تہجد کا حکم ختم ہو گیا، اس کے بجائے پانچ نمازیں آ گئیں اور اب تہجد سنت غیر مؤکدہ ہے۔ اگر کوئی پڑھے گا تو اجر ملے گا اور اگر نہیں پڑھے گا تو کوئی گناہ نہیں۔

ترکِ تہجد پر وعید کیوں؟

آپ کے ذہن میں اس پر ایک سوال ضرور آئے گا کہ جب یہ سنت مؤکدہ نہیں ہے تو بعض احادیث میں تہجد کے ترک کرنے پر وعید کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ وعید اس وقت ہے جب آدمی تہجد کی عادت بنالے پھر تہجد چھوڑ دے، تو یہ مناسب نہیں ہے۔ نفل نماز ضروری تو نہیں ہے لیکن اگر نفل نماز کی عادت بنالے اور

پھر چھوڑ دے تو اللہ تعالیٰ ناراضگی کا اظہار فرماتے ہیں۔

تہجد امت کے لیے بھی سنت ہے اور پیغمبر کے لیے بھی سنت ہے۔ یہ جو بعض حالات میں مشہور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تہجد فرض تھی، یہ بعض حضرات کی رائے ہے، ترجیح اس بات کو ہے کہ تہجد آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض نہیں تھی، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ اگر کسی وجہ سے تہجد نہیں پڑھ سکے تو سورج نکلنے کے بعد آٹھ رکعات پڑھ لیا کرتے تھے تاکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی معمول ختم نہ ہو۔

"روح کیا چیز ہے؟" کا جواب:

﴿وَ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الرُّوۡحِ ؕ قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ وَ مَاۤ اُوۡتِیۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا ﴿۸۵﴾﴾

اہلِ مکہ کو الجھن یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نیک ہیں، صادق ہیں، امین ہیں لیکن نبوت کا دعویٰ کر لیا، شاید یہ حکومت کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے مدینہ کے یہودی علماء سے رابطہ کیا کہ تم کوئی سوال بتاؤ کہ ہم وہ سوال کریں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کا جواب نہ دے سکیں۔

یہ اہلِ باطل کا طریقہ ہے کہ اہل حق کو خاموش کرانے کے لیے اہل باطل سے رابطہ کریں گے کہ کوئی ایسا سوال بتاؤ جس کا جواب مولوی نہ دے سکیں۔

تو مکہ والوں نے یہودیوں کے پاس وفد بھیجا۔ یہود نے تین سوال بتائے کہ اگر تینوں کا جواب دیں تو پھر بھی نبی نہیں اور اگر تینوں کا جواب نہ دیں تو پھر بھی نبی نہیں اور اگر دو کا جواب دیں اور ایک کا جواب نہ دیں تو پھر نبی ہیں۔ انہوں نے تین سوال یہ بتائے:

(1): ان سے پوچھنا کہ وہ نوجوان کون تھے جو غار میں چھپ گئے تھے؟ آگے

اصحابِ کہف کا واقعہ آ رہا ہے۔

(2): وہ کون سے بادشاہ ہیں جنہوں نے پوری دنیا پر حکومت کی؟

(3): روح کے بارے میں ان سے پوچھیں کہ روح کیا ہے؟

چنانچہ یہ لوگ یہود سے سوال پوچھ کر مدینہ منورہ سے مکہ واپس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان لوگوں نے یہ تین سوالات کیے۔ آگے سورۃ کہف میں اس کی تفصیل آئے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس کا جواب کل دوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان شاء اللہ کہنا بھول گئے۔ وہ لوگ کل پھر آئے۔ فرمایا: کل جواب دوں گا۔ کل پھر آئے۔ فرمایا: کل دوں گا۔ یوں سترہ یا انیس دن تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نہیں آئی۔ اس کے بعد جب انہوں نے شور وغل مچا دیا تو پھر اللہ پاک نے وحی نازل فرمائی:

﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿٢٣﴾﴾ [70]

اے میرے پیغمبر! یہ بات کبھی نہ کہنا کہ میں یہ کام کل کروں گا بلکہ ان شاء اللہ کہہ کر بات کرنا!

ان شاء اللہ نہ کہنے کی وجہ سے سترہ دن وحی بند رہی پھر یہ آیت اتری۔ آگے اصحاب کہف کا اور سکندر ذو القرنین کا واقعہ ان شاء اللہ تفصیل سے آئے گا۔ فرمایا انہیں بتاؤ کہ جو لوگ ایک عرصہ غار میں رہے وہ اصحابِ کہف تھے اور جس آدمی نے پوری دنیا میں حکومت کرنے کے لیے پوری دنیا کا چکر کاٹا اس کا نام ذوالقرنین ہے۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سوالوں کے جواب دے دیے اور تیسرے کے جواب میں اللہ نے یہ آیت نازل کی:

70۔ الکہف 23:18

﴿وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾

اے پیغمبر! ان کو یہ نہیں بتانا کہ روح کیا چیز ہے، انہیں یہ بتانا کہ روح امر ربی ہے، اس کی تفصیل مجھے معلوم نہیں۔

”روح کیا ہے؟“ کا جواب اجمالی دینے کی وجہ:

یہاں پر علماء نے دو باتیں بہت اہم لکھی ہیں:

[1]: روح کی تفصیل انہیں اس لیے نہیں بتائی کہ ان کا دماغ اتنا نہیں تھا کہ وہ روح کو سمجھ سکیں۔ جیسے قرآن کریم میں ہے:

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ﴿۱﴾ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ﴿۲﴾ لَمْ يَلِدْ ۙ وَ لَمْ يُوْلَدْ ۙ﴿۳﴾ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴿۴﴾﴾

لوگوں نے سوال کیا کہ آپ یہ بتائیں کہ اللہ کیا ہے؟ اب جواب میں یہ نہیں بتایا کہ اللہ کیا ہے۔ فرمایا انہیں بتائیں اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، اللہ کسی کا بیٹا نہیں، اللہ کا کوئی باپ نہیں اور اللہ کا ہمسر بھی کوئی نہیں۔

انہوں نے یہ تو نہیں پوچھا کہ اللہ کون ہے؟ انہوں نے پوچھا تھا کہ اللہ کیا ہے؟ لیکن جواب یہ دیا گیا کہ اللہ کون ہیں! اسی طرح قرآن کریم میں ہے:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ﴾[71]

انہوں نے پوچھا کہ چاند کیا ہے؟ جواب دیا: ﴿قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ ؕ﴾ کہ چاند کیوں ہے؟

اب دیکھیں! سوال کیا ہے اور جواب کیا ہے! تو انہوں نے پوچھا تھا کہ روح

71۔ البقرۃ 189:2

کیا ہے؟جواب دیا کہ ﴿قُلِ الرُّوۡحُ مِنۡ اَمۡرِ رَبِّیۡ﴾

[2]: اللہ رب العزت نے تعلیم دی ہے کہ عوام کے سامنے اتنی ہی بات کرو جتنی وہ سمجھ سکیں اور جو نہ سمجھ سکیں وہ مسئلے عوام میں لانے ہی نہیں چاہییں۔

قرآن کے تین چیلنجز:

﴿قُلۡ لَّئِنِ اجۡتَمَعَتِ الۡاِنۡسُ وَ الۡجِنُّ عَلٰۤی اَنۡ یَّاۡتُوۡا بِمِثۡلِ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لَا یَاۡتُوۡنَ بِمِثۡلِهٖ وَ لَوۡ کَانَ بَعۡضُهُمۡ لِبَعۡضٍ ظَهِیۡرًا ﴿۸۸﴾﴾ [72]

یہ بات آپ جانتے ہیں کہ اللہ رب العزت نے منکرین قرآن کو تین مرتبہ چیلنج دیا ہے۔پہلا چیلنج یہاں پر ہے:

[۱]: ﴿قُلۡ لَّئِنِ اجۡتَمَعَتِ الۡاِنۡسُ وَ الۡجِنُّ عَلٰۤی اَنۡ یَّاۡتُوۡا بِمِثۡلِ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لَا یَاۡتُوۡنَ بِمِثۡلِهٖ وَ لَوۡ کَانَ بَعۡضُهُمۡ لِبَعۡضٍ ظَهِیۡرًا ﴿۸۸﴾﴾

تم کہتے ہو کہ قرآن اصلی نہیں ہے تو جن وانس سارے جمع ہو جاؤ اور اس جیسا کوئی قرآن لا سکتے ہو تو لاؤ!

جب سارے عاجز ہو گئے پھر ان کو چیلنج دیا کہ تم کہتے ہو کہ یہ قرآن اصلی نہیں ہے تو....

[۲]: ﴿قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِهٖ مُفۡتَرَیٰتٍ وَّ ادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۳﴾﴾ [73]

کہ تم اس طرح کی دس سورتیں بنا لاؤ!

72۔بنی اسرائیل 88:17

73۔ھود 13:11

جب دس سورتوں سے بھی عاجز آ گئے تو پھر اللہ نے چیلنج دیا:

[۳]: ﴿ وَ اِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ ﴾[74]

کہ ایک سورت تو لاؤ، اب تم ایک سورت بھی قیامت تک نہیں لا سکتے اب تم جہنم کا ایندھن ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ!

تو تدریجاً چیلنج کیا ہے۔ پہلے پورے قرآن کا، پھر دس سورتوں کا اور پھر ایک سورت کا اور آج پندرہ سو سال گزر گئے یہ چیلنج آج تک موجود ہے، دنیا کے سارے کافر مل کر ایک سورت بھی نہیں لا سکے۔ اللہ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

کفار کے بے جا سوالات کے معقول جوابات:

﴿وَ قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفۡجُرَ لَنَا مِنَ الۡاَرۡضِ يَنۡۢبُوۡعًا ۙ﴿۹۰﴾ اَوۡ تَكُوۡنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنۡ نَّخِيۡلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الۡاَنۡهٰرَ خِلٰلَهَا تَفۡجِيۡرًا ۙ﴿۹۱﴾ اَوۡ تُسۡقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمۡتَ عَلَيۡنَا كِسَفًا اَوۡ تَاۡتِىَ بِاللّٰهِ وَ الۡمَلٰٓئِكَةِ قَبِيۡلًا ۙ﴿۹۲﴾﴾

میرے پیغمبر! ان کے بہت سارے بے جا قسم کے مطالبے ہیں۔ مثلاً ان کا ایک مطالبہ یہ تھا ہم آپ پر ایمان لائیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ آپ زمین سے پانی کے چشمے نکالیں اور کھجوروں اور انگوروں کے باغات لائیں۔ ہم آپ پر ایمان لائیں گے لیکن ہماری شرط یہ ہے کہ آپ آسمان پر چڑھیں اور وہاں سے سنہری ٹکڑے لائیں۔ ہم آپ پر ایمان لائیں گے ہماری شرط یہ ہے آپ آسمان سے کتاب لے کر آئیں اور بتائیں

74۔ البقرۃ 2:23

کہ یہ کتاب لایا ہوں۔

اللہ پاک نے فرمایا: اے پیغمبر! آپ ان کو بتائیں ﴿سُبۡحَانَ رَبِّیۡ﴾ میرا اللہ پاک ہے، یہ کام میرے بس میں نہیں ہے، ﴿هَلۡ كُنۡتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوۡلًا﴾ میں انسان بھی ہوں اور رسول بھی ہوں، مجھ سے مطالبہ وہ کرو جو انسان کے بس میں ہو، وہ مطالبات مجھ سے نہ کرو جو انسان کے بس میں نہیں ہیں۔ ہاں! اگر دنیا میں انسان نہ ہوتے بلکہ فرشتے رہتے تو اللہ فرشتے کو نبی بنا کر بھیج دیتا، وہ آسمان سے جا کر کتابیں لے آتا۔

نبی کے بشر ہونے کی حکمت:

اب دیکھو! کتنی وضاحت سے اللہ پاک نے ارشاد فرمایا اور ہمیں تعجب ہوتا ہے اب بھی بعض لوگ پیغمبر کی بشریت کا انکار کرتے ہیں!

اس کے بارے میں اصول ذہن نشین فرما لیں۔ اگر کوئی بندہ آپ سے پوچھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں یا نور ہیں؟ جواب آپ نے یہ دینا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ذات کے اعتبار سے بشر ہیں اور وصف کے اعتبار سے نور ہیں، ہم اللہ کے نبی کو بشر بھی مانتے ہیں ذات کے اعتبار سے اور نور بھی مانتے ہیں وصف کے اعتبار سے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نورِ ہدایت بھی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشر بھی ہیں۔ بشر بنانا اس لیے ضروری تھا کہ اللہ کے نبی بشروں کی طرف جا رہے تھے، اگر اللہ کے نبی بشر نہ ہوتے اور بشری تقاضے نہ سمجھتے تو آپ بتائیں بشریت کی ضرورتوں کا ان کو احساس کیسے ہوتا؟

میں یہ بات سمجھا چکا ہوں کہ اگر اللہ کے نبی کا نابالغ بچہ نہ ہوتا اور نابالغ بچہ فوت نہ ہوتا تو نابالغ بچے کی موت پر دکھ کتنا ہوتا ہے یہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے پتا چلتا؟ بعض باتیں علم سے نہیں بلکہ تجربات کی بنیاد پر سمجھ میں آتی ہیں کہ اس

میں دکھ اور درد کتنا ہوتا ہے! اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیمی نہ دیکھی ہوتی تو یتیم کی کیفیت کیا ہوتی ہے یہ اللہ کے نبی کیسے معلوم کرتے؟ اگر پیغمبر کے ساتھ پیٹ نہ ہوتا، بھوک سے نہ گزرتے تو کیسے پتا چلتا کہ غریب کی ضرورت کیا ہے؟ پیغمبر کی بیٹیوں کو طلاق نہ ہوتی تو پیغمبر کیسے سمجھتے کہ بیٹی کی طلاق کا درد کیا ہوتا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسان تھے۔ ہجرت کے لیے مجبور نہ کیا جاتا تو مکان کے چھوڑنے پر دکھ کتنا ہوتا ہے یہ تو وہی محسوس کر سکتا ہے جس کا مکان ہو اور مکان سے نکالا جائے۔ چونکہ انبیاء علیہم السلام کو بشروں کی طرف بھیجا گیا تھا اس لیے اللہ اپنے نبی کو بشر بنا کر بھیجتے ہیں تاکہ بشری ضرورتیں پیغمبر کے علم میں ہوں اور پیغمبر ان کو محسوس بھی فرمائیں۔

باری تعالیٰ کے دو نام؛ اللہ اور رحمٰن:

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۱۰﴾ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿۱۱۱﴾﴾

ان آیات کا خلاصہ تین باتیں ہیں، ان کو ذہن نشین فرمالیں:

[1]: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دعا مانگ رہے تھے: یا اللہ! یا رحمٰن! تو مشرکین کہنے لگے کہ ہمیں تو آپ کہتے ہیں کہ خدا ایک ہے اور خود دو خداؤں کو پکار رہے ہیں؟ اس کے جواب میں اللہ پاک نے فرمایا: ﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ کہ رحمٰن بھی اللہ کا نام ہے، اللہ بھی اسی کا نام ہے، چاہو تو اللہ کہہ کر پکارو اور چاہو تو رحمٰن کہہ کر پکارو۔ اللہ ان کا ذاتی نام ہے اور رحمٰن ان کا صفاتی نام ہے۔ ذات کے اعتبار سے اللہ ایک ہے اور صفتیں اس کی کئی ہیں۔ تو یا اللہ

کہنا بھی ٹھیک ہے اور یار حمٰن کہنا بھی ٹھیک ہے۔

قرأت میں میانہ روی کا حکم:

[2]: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح تہجد کے لیے اٹھتے اور قرأت اونچی آواز سے فرماتے تو مشرکین آکر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو روکتے۔ مشرکین کو تکلیف ہوتی تھی قرآن کیوں پڑھتے ہیں! عجیب بات یہ کہ انہیں قرآن سننے میں مزا بھی آتا تھا، چھپ چھپ کر سنتے بھی تھے لیکن دوسرں کو منع بھی کرتے تھے کہ تم ان کے قریب نہ جانا۔ تو اللہ رب العزت نے فرمایا:

﴿وَلَا تَجۡهَرۡ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتۡ بِهَا وَابۡتَغِ بَيۡنَ ذٰلِكَ سَبِيۡلًا﴾

میرے پیغمبر! آپ درمیانی راستہ اختیار کریں۔ اگر قرأت اونچی آواز سے کریں گے تو یہ بد کیں گے اور قرآن بہت آہستہ پڑھیں گے اور مغرب یا فجر یا عشاء کی نماز ہے تو مقتدی سن نہیں سکیں گے، اس لیے آپ درمیانہ راستہ اختیار کریں تاکہ مشرکین روکنے پر مجبور بھی نہ ہوں اور مقتدی آرام سے سن بھی سکیں۔

حدیث مبارک میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نماز میں بہت آہستہ تلاوت فرما رہے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ بہت اونچا قرآن پڑھ رہے ہیں۔ جب وہ دونوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا: آپ قرآن آہستہ کیوں پڑھتے ہیں؟ انہوں نے کہا: یارسول اللہ! ”قَدۡ أَسۡمَعۡتُ مَنۡ نَاجَيۡتُ“ آہستہ اس لیے پڑھتا ہوں کہ جس ذات کو سنا رہا ہوں وہ تو سن رہی ہے! اے عمر! آپ اونچا کیوں پڑھتے ہیں؟ انہوں نے کہا: حضور! ”أُوقِظُ الۡوَسۡنَانَ وَأَطۡرُدُ الشَّيۡطَانَ“ اپنے آپ سے نیند اور شیطان کو بھگانے کے لیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدیق! آپ تھوڑا اونچا پڑھ لیا کریں، فاروق! آپ

تھوڑا آہستہ پڑھ لیا کریں۔[75]

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کا خیال فرمایا۔

اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک ذات ہے:

[3]: مشرکین تین قسم کے تھے؛ بعض مشرک وہ تھے جو بتوں کو خدا بناتے ہیں، یہود وہ تھے جو حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بناتے تھے اور عیسائی وہ تھے جو عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بناتے تھے۔ تو کسی نے خدا کا بیٹا بنا دیا اور کسی نے خدا کے مقابلے میں بتوں کو مان لیا۔

اللہ رب العزت نے فرمایا: دنیا میں مددگار تین قسم کے ہیں، یا وہ چھوٹا ہو یا برابر کا ہو یا بڑا ہو۔ اگر چھوٹا ہو تو اسے "اولاد" کہتے ہیں اور برابر ہو تو اسے "شریک" کہتے ہیں اور بڑا ہو اسے "مددگار" کہتے ہیں۔ تو اللہ رب العزت کے نہ کوئی برابر، نہ چھوٹا ہے اور نہ بڑا ہے، اللہ ہر قسم کے شریکوں سے پاک ہیں۔ فرمایا:

﴿وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا﴾

میرے پیغمبر! آپ ان سے کہیں کہ اللہ کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ کوئی اللہ کے برابر بھی نہیں ہے اور کوئی بھی اللہ کا حمایتی اور مددگار نہیں ہے۔ اللہ ہی بڑا ہے، اللہ ہی کی بڑائی بیان کرو۔

دعا کریں کہ اللہ رب العزت ہم سب کو ہر قسم کے شرک سے محفوظ رکھے، اللہ خالص سنت اور اتباع توحید کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

75۔ سنن ابی داؤد، رقم: 1329

سورۃ الکہف

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا ؕ﴿۱﴾﴾

تعارف، وجہ تسمیہ اور فضائلِ سورت:

سورۃ الکہف مکی سورت ہے۔ اس میں دس رکوع اور ایک سو دس آیات ہیں۔

سورۃ الکہف کو سورۃ الکہف اس لیے کہتے ہیں کہ اس سورت میں چونکہ اصحاب کہف کا تذکرہ ہے اس لیے اس کا نام بھی سورۃ الکہف رکھا گیا ہے۔

اس سورت کے فضائل احادیث مبارکہ میں بہت زیادہ منقول ہوئے ہیں۔

ایک حدیث مبارک میں آتا ہے کہ سورت الکہف وہ واحد سورت ہے جو لمبی ہونے کے باوجود اکٹھی نازل ہوئی ہے اور جب سورۃ الکہف نازل ہوئی تو ستر ہزار فرشتے اس کو لے کر آئے۔[76] (سبحان اللہ۔ سامعین)

ایک حدیث مبارک میں ہے جو انسان جمعہ کے دن سورۃ الکہف کی تلاوت

76۔ تفسیر روح المعانی: ج15 ص199

کرے اس کے پاؤں سے لے کر آسمان تک ساری جگہ اللہ نور سے بھر دیتے ہیں۔[77]

اور اس کا اندازہ دنیا میں نہیں بلکہ قیامت کو ہو گا کہ سورۃ الکہف سے مجھے کیا ملا ہے؟ اس روشنی میں انسان قیامت کے دن اپنے سفر کو طے کرے گا۔

ایک حدیث مبارک میں ہے کہ جو انسان جمعہ کے دن سورۃ الکہف کو پڑھتا ہے تو اس جمعہ سے لے کر گزشتہ جمعہ تک کے جتنے گناہ ہیں اللہ سارے معاف فرما دیتے ہیں۔[78]

اور ایک حدیث مبارک میں ہے کہ جو انسان سورۃ الکہف جمعہ کے دن پڑھے اس جمعہ سے لے کر آئندہ جمعہ تک پورا ہفتہ اس آدمی کو اللہ تمام قسم کے فتنوں سے محفوظ رکھتے ہیں حتیٰ کہ اس دوران یعنی اس جمعہ سے لے کر آئندہ جمعہ تک دجال کا فتنہ بھی آگیا تو اللہ اس شخص کو دجال کے فتنے سے بھی بچا لیں گے۔[79]

خود عمل کریں تو دعوت دینا آسان ہوتا ہے:

یہ سورت اس قدر مؤثر ہے! اس لیے اس سورت کو بہت زیادہ پڑھنے کا اہتمام کریں۔ مجھے بھی آج چونکہ مہمانوں کی کثرت کی وجہ سے مطالعہ میں دقت پیش آتی ہے، آج بھی مصروفیت کی وجہ سے الجھن تھی کہ صبح سورۃ الکہف نہیں پڑھ سکا تو پھر میں نے آج عصر کے بعد جو تھوڑا سا وقت ہوتا ہے اس کی قصداً تلاوت کی۔ میں نے کہا باقی جمعوں میں اگر چھوٹ بھی جائے تو شاید فرق نہ پڑے لیکن آج رات تو میں نے سورۃ الکہف کی فضیلت کو بیان کرنا ہے، آدمی بیان کرے اور خود نہ پڑھے تو آدمی کو

77۔ الترغیب والترہیب: ج1ص298

78۔ تفسیر ابن کثیر: ج4ص194

79۔ تفسیر ابن کثیر: ج4ص194

بیان کرتے ہوئے خود شرم محسوس ہوتی ہے۔

اس پر میں ایک چھوٹا سا واقعہ پیش کرتا ہوں۔ ایک صاحبِ نسبت ولی اللہ تھے۔ ان کے پاس ایک خاتون اپنے بچے کو لے کر آئی نصیحت کروانے کے لیے کہ یہ گڑ بہت کھاتا ہے، اس کو سمجھا دیں۔ بزرگ نے فرمایا: اس کو کل لے کر آنا۔ وہ اگلے دن آئی تو انہوں نے بچے کو سمجھا دیا۔ عورت کہنے لگی: حضرت! آپ کل ہی سمجھا دیتے، یہ مجھے ایک دن کا انتظار آپ نے کیوں کروایا ہے؟ وہ فرمانے لگے: اے خاتون! کل میں نے خود گڑ کھایا تھا اس لیے مجھے نصیحت کرتے ہوئے خود شرم آرہی تھی، بے شک تھوڑا کھایا تھا لیکن کھایا تو تھا، جب میں نے خود کھایا تھا تو اب کیسے نصیحت کروں؟ اس لیے چوبیس گھنٹے انتظار کرنے کی آپ کو تکلیف دی تھی۔ اللہ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور اللہ ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آپ میں سے ہر بندہ یہ نیت کرے کہ ان شاء اللہ آئندہ ہر جمعہ کے دن سورۃ الکہف کی تلاوت کرے گا۔ ان شاء اللہ اللہ عمل کی توفیق عطا فرمائیں گے۔

جمعہ کے دن ان معمولات کا اہتمام کیجیے:

جمعہ کے دن کے معمولات میں سے تین معمولات کا بہت زیادہ اہتمام کیا کریں:

[۱]: ایک یہ ہے کہ ہر جمعہ سورۃ الکہف کی تلاوت فرمایا کریں۔

[۲]: دوسرا یہ کہ جہاں آپ نے عصر کی نماز پڑھی ہے اسی جگہ پر بیٹھے بیٹھے 80 مرتبہ یہ درود پاک پڑھیں:

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدِنِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَعَلٰى آلِهٖ وَسَلِّمْ تَسْلِيْمًا.

جو شخص 80 بار جمعہ کے دن عصر کی نماز پڑھنے کے بعد اسی جگہ پر بیٹھ کر یہی درود پاک پڑھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وعدہ ہے اللہ رب العزت اس کے

80 سال کے گناہ معاف فرماتے ہیں اور 80 سال کی عبادات کا اجر بھی عطا فرماتے ہیں۔[80]

یہ کتنا آسان سا نسخہ ہے اور ہم کتنے نالائق ہیں کہ اس کو چھوڑ دیتے ہیں۔

اللہ کا بڑا شکر ہے کہ ہمارے اور آپ کے مدرسے مرکز اھل السنۃ والجماعۃ میں ہر جمعہ کے دن عصر کے بعد اساتذہ اور تمام طلبہ بیٹھ کر یہ درود پاک پڑھتے ہیں۔ یہ ہلکی سی کارگزاریاں میں اس لیے سناتا ہوں کہ ایسے مدرسے پر اگر کسی کا ایک روپیہ بھی لگا ہو تو وہ ذہن میں رکھے کہ 80 مرتبہ درود پاک کا اجر اللہ مجھے ضرور عطا فرما دیتے ہیں۔

[۳]: تیسرا یہ کہ جمعہ کے دن امام ایک خطبہ دے کر بیٹھے تو دوسرے خطبے اور پہلے خطبے کے درمیان میں جو ایک آدھ منٹ کا وقفہ ہے اس میں دعا کا اہتمام کیا کریں۔ یہ قبولیتِ دعا کا وقت ہے لیکن یہ خیال کریں کہ اس وقت دعا زبان سے نہیں کرنی بلکہ اپنے دل میں کرنی ہے۔ اللہ پاک زبان کی بات بھی سنتے ہیں اور اللہ پاک دلوں کی بات بھی جانتے ہیں۔ وہ علیم بذات الصدور ہے۔ چونکہ امام خطبے کے لیے جب منبر پر آ جائے تو سنتوں اور نوافل کی گنجائش بھی نہیں ہے اور اس وقت دعائیں مانگنے اور بات کرنے کی گنجائش بھی نہیں ہے۔

اب بتاؤ! آدھا منٹ کیا وقت ہوتا ہے؟ ایک منٹ کیا وقت ہوتا ہے؟ بس اپنی گردن کو جھکائیں اور دل ہی دل میں کہہ دیں کہ اللہ! میرے والد صاحب بیمار ہیں انہیں شفا عطا فرما دے! میری بیٹی ہے رشتے کا انتظام فرما دے، میرا بیٹا ہے اس کی ملازمت کا انتظام فرما دے، میرا کاروبار ہے اللہ اس کے معاملات کو ٹھیک فرما دے،

80۔ القول البدیع للسخاوی: ص199

میں نے فلاں گناہ کیا ہے اپنے کرم سے اسے معاف فرمادے۔ میں اپنی ضروتوں کو جانتا ہوں اور آپ اپنی ضرورتوں کو جانتے ہیں، اس لیے آپ یہ تین اہتمام ضرور فرمائیں۔

میں نے تو تدریجاً تین باتیں کی ہیں۔ آپ کم از کم ایک بات کا اہتمام فرما لیں۔ کتنا خوش قسمت ہے وہ شخص جس کو یہ تینوں چیزیں نصیب ہوں۔ دعا فرمائیں کہ اللہ پاک ہم کو ان تینوں چیزوں کا اہتمام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

سورت کا شانِ نزول:

حدیث پاک میں ہے کہ مشرکینِ مکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے سامنے ہمیشہ کی طرح جب اس بار بھی لاجواب ہوئے تو مشرکینِ مکہ کے بعض رؤسا اور سرداروں نے مشورہ کیا کہ ہم چونکہ ان پڑھ ہیں، یہودی اور عیسائی صاحبِ علم لوگ ہیں، تورات اور انجیل کے عالم ہیں۔ تو ہم اپنے دو تین بندے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ بھیجیں جو وہاں جاکر ان یہودیوں سے پوچھیں کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ تو مشرکینِ مکہ نے نذر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط ان دو بندوں کو مشورے کے ساتھ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ بھیجا اور یہودیوں سے کہا کہ آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟

یہودیوں نے کہا: ان سے جاکر تین سوال کرو۔

1: وہ نوجوان کون تھے جو غار میں جاکر چھپے اور کئی سو سال تک سوتے رہے؟

2: ان سے پوچھو کہ ذوالقرنین کون تھا جس نے پوری زمین پر فتح حاصل کرنے کے لیے مشرق اور مغرب کا سفر کیا اور اس کا کیا واقعہ ہے؟

3: روح کے متعلق پوچھو کہ روح کیا چیز ہے؟

یہ تین سوال جاکر ان سے پوچھو۔ اگر انہوں نے صحیح جواب دے دیے تو سمجھ لینا کہ وہ سچے نبی ہیں۔ اگر جواب نہ دے سکیں تو سمجھ لینا کہ وہ اپنے دعوائے نبوت

میں خدا نخواستہ سچے نہیں ہیں۔

مشرکین واپس آئے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ تینوں سوال کیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں ان کا جواب تمہیں کل دوں گا۔ مشرکینِ مکہ کل آئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات معمول کے مطابق فرمائی کہ وحی آجائے گی اور میں جواب دے دوں گا لیکن وحی نہیں آئی۔ وہ کل آئے اور پوچھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں کل جواب دوں گا۔ وہ کل پھر آ گئے یعنی پرسوں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب نہیں دیا۔ یوں تقریباً سترہ دن تک وحی منقطع رہی۔ وہ روزانہ آتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل کی بات فرما دیتے۔ اس پر قرآن کریم کی یہ آیت اتری جس پر بات آگے چل کر ہوگی کہ:

﴿وَ لَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿٢٣﴾ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ﴾

اے میرے پیغمبر! آپ ان شاء اللہ کے بغیر کوئی بات نہ فرمایا کریں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھول کر ان شاء اللہ نہیں فرمایا تو سترہ دن تک وحی بند ہو گئی۔ بالآخر وحی آئی تو سورۃ الکہف اس وحی میں نازل ہوئی جس میں ان کے دو سوالات کے جوابات تفصیلاً موجود ہیں اور تیسرا سوال کہ روح کیا ہے اس پر بات سورۃ بنی اسرائیل کی آیت:

﴿وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَ مَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٨٥﴾﴾

کے تحت ہو چکی ہے۔ اصحابِ کہف کون تھے؟ اس پر بھی قرآن نے بات کی ہے اور ذوالقرنین کون تھا؟ اس پر بھی قرآن کریم نے بات کی ہے۔

اصحابِ کہف کا تفصیلی واقعہ:

پہلی بات یہ سمجھیں کہ کہف اور غار کا معنٰی کیا ہے؟ عربی زبان میں "غار" کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے اور "کہف" کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ پہاڑ میں جو مختصر غار ہو اس کو غار کہتے ہیں اور جو لمبی اور وسیع غار ہو اسے عربی زبان میں "کہف" کہتے ہیں۔ لہٰذا اصحاب کہف کا معنٰی یہ ہے کہ یہ نوجوان اس غار میں تھے جو قدرے لمبی تھی۔

اصحابِ کہف کا واقعہ 250ء کا ہے۔ پھر تین سو سال تک یہ لوگ سوتے رہے تو مجموعہ 550ء ہو گیا اور رسول پاک صلی اللہ علیہ سلم کی ولادت 570ء میں ہوئی۔ اس حساب سے اصحابِ کہف کے بیدار ہونے کا یہ واقعہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے 20 سال پہلے پیش آیا تھا۔

مشرک بادشاہ کے احوال؛

بادشاہ ظالم تھا، مشرک تھا اور شرک پر اپنی قوم کو مجبور کیا کرتا تھا۔ ایک دن ان کا ایک خاص میلہ تھا جہاں بتوں کی عبادت ہوتی تھی۔ اس میں چند نوجوان جو کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اللہ رب العزت نے ان میں سے ہر ایک کے دل میں یہ بات ڈالی کہ مجھے بتوں کی عبادت کرنے کے بجائے اللہ کی عبادت کرنی چاہیے۔ چنانچہ ایک نوجوان اس مجمع سے کھسکا اور باہر جا کر درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ ایک اور آیا وہ بھی وہیں بیٹھ گیا۔ تیسرا آیا تو وہ بھی وہیں بیٹھ گیا۔ تو یہ حضرات تقریباً سات کے لگ بھگ تھے وہاں الگ الگ بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کو بتا بھی نہیں رہے تھے۔ ڈر رہے تھے کہ کوئی جاسوس نہ ہو اور بادشاہ کو نہ بتا دے اور ہمیں قتل نہ کروا دے۔

آخر ایک نے پوچھ لیا کہ آپ کیوں آئے ہیں تو باری باری سب نے یہی کہا کہ ہم اس شرک سے تنگ ہیں۔ جب سب کی بات ایک ہو گئی تو سب نے اتفاق کیا اور ایک جگہ جمع ہو کر بیٹھ گئے۔ اب مشورہ کیا کہ نکل تو آئے ہیں، اب کیا کریں؟ یہ بات

آہستہ آہستہ شہر میں پھیلنی شروع ہوئی کہ چند نوجوان بیٹھے ہیں جو کھاتے پیتے ہیں اور اس شہر سے تعلق رکھتے ہیں اور ہمارے بتوں کی عبادت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کی یہ شکایت بادشاہ تک پہنچ گئی۔

بادشاہ نے ان کو بلا لیا اور بلا کر پوچھا تو انہوں نے ببانگ دہل بادشاہ کے سامنے کہا کہ ہم جان تو دے سکتے ہیں لیکن ہم شرک کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بادشاہ نے ان کے شاہی لباس اتروا دیے اور ان سے کہا: میں تمہیں کچھ دن مہلت دیتا ہوں، تم مشورہ کرلو، اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کردوں گا۔ یہ حضرات وہاں سے نکلے اور آپس میں مشورہ کیا کہ اب کیا کریں؟ طے یہ پایا کہ یہاں سے نکل کر دور چلے جائیں اور اپنے ایمان کی حفاظت کریں۔ تو یہ ایک غار تک پہنچے اور وہاں جا کر سو گئے۔

غار میں کتنا عرصہ رہے؟

قرآن میں ہے:

﴿وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوا تِسْعًا ﴿٢٥﴾﴾

یہ تین سو سال تک سوتے رہے اور نو سال اوپر۔

تین سو سال بھی ہیں اور تین سو نو سال بھی ہیں۔ یہ کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ شمسی حساب کریں تو تین سو سال بنتے ہیں اور قمری حساب کریں تو تین سو نو سال بنتے ہیں اور قمری حساب میں ہر سو سال پر تین سال بڑھ جاتے ہیں، اس لیے تین سو سال شمسی پر قمری حساب سے نو سال مزید ہوگئے۔ اس لیے اللہ نے ﴿ثَلٰثَ مِائَةٍ﴾ بھی فرمایا اور ﴿وَازْدَادُوا تِسْعًا﴾ بھی فرمایا۔ تین سو سال کو الگ ذکر کیا اور نو سال کو الگ ذکر کیا تاکہ شمسی حساب بھی آجائے اور قمری حساب بھی آجائے۔ یہ قرآن

کریم کی بلاغت ہے۔

یہ نوجوان تین سو سال کے بعد اٹھے۔ آنکھ کھلی تو بھوک لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا: ایک آدمی کو بھیجو جو کھانا لے کر آئے لیکن محتاط سفر کرے، کسی کو پتانہ چل جائے، اگر پتا چلا تو بادشاہ ہم سب کو سنگسار کر دے گا۔ تو بچتا بچاتا ایک نوجوان دکان پر پہنچا۔ جب اس نے سکے دیے روٹی اور سالن لینے کے لیے تو دکاندار نے کہا: سکے تم نے کہاں سے لیے ہیں؟ اس نے کہا: میرے اپنے ہیں۔ دکاندار نے کہا: چوری کیے ہیں؟ اس نے کہا: نہیں، یہ میرے اپنے ہیں، چوری کہاں سے کیے ہیں۔

دکاندار نے کہا: یہ تین سو سال پرانے ہیں یہ تمہارے کہاں سے آئے؟ دکاندار کو شک پڑا کہ کہیں خزانہ دفن تھا جو اس نے کھولا اور چوری کر کے لایا ہے۔ دکاندار کو شک پڑا اور اس نے پولیس کے حوالے کیا کہ ہم نے ایک بندہ پکڑا ہے اور ہمیں لگتا ہے کہ یہ چور ہے۔ پولیس نے پکڑا اور بادشاہ تک لے گئے اور اب جو بادشاہ تین سو سال کے بعد تھا یہ توحید پرست اور موحد تھا، اور جو پہلا تھا وہ مشرک تھا۔

موحد بادشاہ کی خدائی امداد:

اس بادشاہ کا مسئلہ یہ تھا کہ اس کی قوم حشر کو نہیں مانتی تھی۔ قوم کا کہنا تھا کہ اللہ دوبارہ کیسے زندہ کریں گے؟ اس بادشاہ نے ایک دن رات ریت پر بیٹھ کر ننگے پاؤں اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں کہ اے اللہ! میری قوم آخرت کو نہیں مانتی، میری قوم حشر کو نہیں مانتی، یا اللہ! کوئی ایسی دلیل مجھے عطا فرمادے کہ ان کو میں سمجھا سکوں کہ اللہ دوبارہ کیسے پیدا کریں گے؟ تو بادشاہ نے سمجھا کہ جو میں دعائیں مانگتا تھا شاید اللہ نے وہ قبول کر لی ہیں۔ بادشاہ نے اس نوجوان سے کہا: تم کون ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟ تمہارے باپ کا نام کیا ہے؟ پھر پتا چلا کہ اس نام کا بندہ دنیا میں کوئی نہیں ہے۔

پھر بادشاہ نے تفتیش کرائی تو پتا چلا کہ وہ جو تین سو سال پہلے بادشاہ جس کا نام

دقیانوس تھا وہ جب مرا تو مرتے وقت ایک تختی لکھ کر رکھ گیا تھا کہ فلاں فلاں نام کے اتنے بندے ہیں، یہ میرے باغی ہیں اور جب بھی میرے بعد والے کسی بادشاہ کو ملیں تو ان کو وہ سنگسار کر دے یا سزائے موت دے دے۔ بادشاہ نے دیکھا تو یہ وہی لوگ ہیں۔ پھر جب ساری بات بادشاہ نے سنی تو انہوں نے بتایا کہ ہمارا بادشاہ شرک والا تھا اور شرک پر مجبور کرتا تھا، ہم نے غار میں پناہ لی تھی، ہم سوئے رہے اور آج اٹھے تو میں کھانا لینے کے لیے آیا ہوں، اس وقت ان سکوں کو دیکھا تو پتا چلا کہ یہ تین سو سال پرانے آدمی تھے۔

بادشاہ نے کہا: مجھے غار تک لے جاؤ تاکہ میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھوں، بادشاہ نے غار دیکھی اور ان کی زیارت بھی کی۔ بعض روایات میں ہے کہ بادشاہ ان کی زیارت نہ کر سکا اور وہ وفات پا گئے اور یہ ایک زندہ تھا۔

خیر بادشاہ نے پھر اپنی قوم کو سمجھایا کہ دیکھو! تم کہتے ہو کہ جو مر جائے گا وہ دوبارہ کیسے اٹھے گا؟ یہ دیکھو! تین سو سال سے سوئے ہوئے ہیں، ان کو کچھ بھی نہیں ہوا۔ تو جو اللہ تین سو سال تک سلا کر دوبارہ اٹھا سکتا ہے تو وہ وفات کے بعد حیات بھی دے سکتا ہے۔ یوں اس بادشاہ کی دعا اللہ نے قبول فرمائی اور دلیل کے طور پر ان کے سامنے نمونہ ظاہر ہو گیا۔ یہ تھے اصحاب کہف جو ولی اللہ تھے۔

قرآن کی دعوت راہِ اعتدال:

﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِهِ الۡکِتٰبَ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡ لَّهٗ عِوَجًا ؕ سکتة ۚ (۱)﴾

اللہ فرماتے ہیں: قرآن میں ٹیڑھا پن نہیں ہے بلکہ قرآن درست، معتدل اور درمیانے راستے کی بات کرتا ہے۔

یہ بات سمجھ لیں کہ قرآن حد سے تجاوز بھی نہیں کرتا اور حد سے نیچے بھی نہیں آتا بلکہ حد پر رہتا ہے۔ حد سے تجاوز کریں تو افراط ہے، حد سے اتر جائیں تو تفریط ہے اور حد پر رہیں تو اعتدال اور صراط مستقیم ہے۔ اگر حدود کراس کریں تو الحاد ہے اور حدود سے نیچے اتر آئیں تو بدعات ہیں اور حدود پر رہیں تو پھر اھل السنۃ والجماعۃ ہیں۔ قرآن کریم حدود پر رہنے کی بات کرتا ہے۔ حد سے تجاوز کرنے کی ہرگز بات نہیں کرتا۔

افراط، تفریط اور صراطِ مستقیم:

میں اس کی بہت سی مثالیں دیا کرتا ہوں۔ آپ ایک مثال ذہن نشین فرمالیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر صلوٰۃ وسلام پڑھیں تو بھی نہیں سنتے اور دوسرا کہتا ہے کہ جہاں سے بھی پڑھو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ سے سنتے ہیں۔ تو جو کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبر پر پڑھا ہوا صلوٰۃ وسلام بھی نہیں سنتے یہ الحاد والا ہے اور جو کہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اِدھر سے بھی سنتے ہیں یہ بدعات والا ہے اور جو کہے کہ ادھر سر گودھا میں پڑھیں تو اللہ پہنچا دیتے ہیں اور قبر پر پڑھیں تو اللہ سنا دیتے ہیں یہ اھل السنۃ والجماعۃ والا ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

﴿ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ﴿٦﴾ ﴾

اے میرے پیغمبر! آپ کو ان کے ایمان لانے کی فکر ہے اور کرنی چاہیے لیکن ان کے ایمان کی اتنی فکر نہ کریں کہ اپنی جان گنوا بیٹھیں، کیوں کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے، اس میں مؤمن بھی رہتے ہیں اور کافر بھی رہتے ہیں، نہ سارے مؤمن بنتے ہیں نہ سارے کافر بنتے ہیں، کچھ ماننے والے ہوں گے جو جنت میں جائیں گے اور

کچھ انکار کرنے والے ہوں گے جو جہنم میں جائیں گے، آپ کے ذمے محنت کرنا ہے، آپ کے ذمے ان کو جنت میں لے جانا نہیں ہے۔ اس لیے اتنی محنت نہ کریں کہ اپنی جان گنوا بیٹھیں، اتنی محنت کریں جتنا شریعت نے حکم دیا ہے۔

کسی کو راہِ راست پر لانے کے لیے گناہ کرنا جائز نہیں:

اس سے ایک مسئلہ سمجھ لیں۔ بعض لوگ غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مجھ سے ایک آدمی نے مسئلہ پوچھا، وہ جماعت میں چل رہا تھا اور جماعت میں سارے علماء تھے۔ کہا: جی ہم فلاں طبقے کی مسجد میں ہیں اور ان کے پیچھے نماز پڑھیں تو نماز ہو جاتی ہے یا نہیں ہوتی؟ میں نے کہا: نماز نہیں ہوتی۔ مجھے کہنے لگا: جب ہم ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھیں گے تو وہ ہماری بات نہیں سنیں گے، ہم نماز اس لیے پڑھتے ہیں تاکہ وہ ہماری بات سن لیں۔

میں نے کہا: مولانا صاحب! مجھے آپ بتائیں کہ اگر کوئی لڑکی جو زنا کی عادی ہو، اس کو گناہ سے بچانے کے لیے اس کے ساتھ منہ کالا کر لیں تو کیا اس کی گنجائش ہے؟ مجھے کہتا ہے: نہیں۔ تو میں نے کہا: اس کو بھی تو جنت میں لے کر جانا ہے، تو اگر اس کے ساتھ دوستی نہیں لگاؤ گے تو تمہاری بات نہیں سنے گی تو کیا بات سنانے کے لیے دوستی لگانا جائز ہے؟ مجھے کہتا ہے: نہیں! میں نے کہا: پھر کسی کی نماز کو ٹھیک کرنے کے لیے اپنی نماز خراب کرنا کیسے جائز ہے؟ پھر کہنے لگا: مجھے بات سمجھ میں آگئی ہے۔

دوسرے کا ایمان بچانے کے لیے اپنا ایمان خراب نہ کریں۔ دوسرے کی نماز بچانے کے لیے اپنی نماز خراب نہ کریں۔ چونکہ تبلیغی جماعت میں آپ حضرات بھی جاتے رہتے ہیں اس لیے اچھی طرح مسئلہ سمجھ لیں۔

وہ کہنے لگا: پھر ان کی مسجد میں ہم نہ جائیں؟ میں نے کہا: جایا کرو۔ کیا نماز نہ پڑھیں؟ میں نے کہا: پڑھا کرو۔ اس نے کہا: ادھر آپ کہتے ہیں کہ نہیں ہوتی اور ادھر

آپ کہتے ہیں کہ پڑھا کرو! میں نے کہا: جب مسئلہ ہم بتاتے ہیں تو حل نکالنا بھی ہمارے ذمے ہے۔ مجھے کہتا ہے: جی حل کیا ہے؟ میں نے کہا: دو حل ہیں:

ایک حل یہ ہے کہ پیچھے کھڑے ہو کر پڑھ لیں اور بعد میں قضا کر لیں۔ جب آپ نے قضا کی تو نماز بھی ہو گئی اور دعوت بھی ہو گئی۔

اور دوسرا حل یہ ہے کہ آپ ان کے پیچھے نماز پڑھیں اور اقتداء صوری کریں۔ اقتداء صوری کا معنیٰ یہ ہے امام نے اللہ اکبر کہا تو آپ بھی اللہ اکبر کہیں، امام ثناء پڑھے تو آپ بھی ثناء پڑھیں، امام اعوذ باللہ پڑھے تو آپ بھی پڑھیں، امام بسم اللہ پڑھے تو آپ بھی پڑھیں، وہ فاتحہ پڑھے تو آپ بھی پڑھیں، وہ سورۃ پڑھے تو آپ بھی پڑھیں۔ دیکھنے میں آپ اس کے پیچھے ہوں لیکن درحقیقت نماز آپ کی اپنی ہو! میں نے کہا: نماز بھی ہو گئی ہے اور آپ کی دعوت بھی ہو گئی ہے۔

ہم آپ کو مسئلہ بتا کر ضائع نہیں کرتے۔ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ ہم دعوت کا اہتمام بھی کرتے ہیں اور مسئلہ بھی ٹھیک بتاتے ہیں۔

اصحابِ کہف اور الرقیم:

﴿اَمۡ حَسِبۡتَ اَنَّ اَصۡحٰبَ الۡکَہۡفِ وَ الرَّقِیۡمِ ۙ کَانُوۡا مِنۡ اٰیٰتِنَا عَجَبًا ﴿۹﴾﴾

فرمایا: تمہیں تعجب ہے کہ اصحابِ کہف کا واقعہ عجیب ہے۔ اصحاب کہف کا واقعہ اتنا عجیب نہیں ہے اس سے بھی عجیب تر واقعات قرآن مجید میں موجود ہیں۔ اصحابِ کہف تو سوئے رہے اور جاگ گئے۔ حضرت عزیر علیہ السلام پر تو وفات آ گئی اور وہ زندہ ہو گئے۔ سو کر جاگنا اتنا عجیب نہیں ہے جتنا وفات پا کر زندہ ہو جانا عجیب ہے۔ اس لیے اس کو اتنا عجیب نہ سمجھو بلکہ اس سے بھی عجیب واقعات اللہ نے اور بھی تمہیں دکھائے ہیں۔

ان کو اصحاب کہف بھی کہا اور اصحاب رقیم بھی کہا۔ کہف تو غار کو کہتے ہیں

اور رقیم کیا ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ "الرقیم" اس وادی کا نام ہے جہاں پر وہ پہاڑ ہے جس میں غار تھی۔ بعض کہتے ہیں: "الرقیم" اس پہاڑی کا نام ہے جس میں غار تھی اور بعض کہتے ہیں: "الرقیم" کا معنیٰ مرقوم ہے یعنی لکھی ہوئی، یہ جس غار میں بعد میں وفات پا گئے تھے تو مسلمان بادشاہ نے باہر تختی لکھ کر لگا دی تھی کہ فلاں فلاں ولی وفات پا گئے تھے جو اس غار میں موجود ہیں۔ اس لیے ان کو "اصحاب رقیم" بھی کہتے ہیں۔

غار کا محلِ وقوع:

﴿وَ تَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ اِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ هُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ﴾

اس آیت میں اللہ نے غار کا بڑا عجیب نقشہ کھینچا ہے۔ اس کو ذرا سمجھنا! اللہ فرماتے ہیں کہ وہ غار ایسی ہے کہ جب سورج نکلتا ہے تو دھوپ دائیں جانب ہوتی ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو بائیں جانب ہوتی ہے یعنی غار کا نقشہ اس طرح ہے کہ براہِ راست دھوپ ان پر نہیں پڑتی، غار کھلی ہے، ہوا آتی جاتی ہے لیکن براہِ راست ان کے جسم پر دھوپ نہیں پڑتی۔ اللہ ان کے جسم کو دھوپ سے بچا بھی لیتے ہیں تاکہ اٹھیں نا اور ہوا کا سلسلہ بھی رہتا ہے تاکہ سانس نہ گھٹے۔

اب یہ غار کیسی تھی؟ مفسرین فرماتے ہیں: یہ جو فرمایا کہ سورج جب نکلتا ہے تو دائیں طرف سے گزرتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو بائیں طرف سے، یہ دایاں اور بایاں کس کا ہاتھ ہے؟ یا تو دایاں ہاتھ مراد ہے جب آدمی غار میں داخل ہو یا دایاں ہاتھ مراد ہے جب آدمی غار سے نکلے۔ اگر غار میں داخل ہونا مراد ہو تو اس کا معنیٰ ہے اس غار کا منہ شمال کی جانب تھا اور اگر مراد ہو داخل ہونے والا تو پھر یہ کہیں گے کہ اس کا منہ جنوب کی جانب تھا۔

لیکن بعض مفسرین فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ چونکہ ولی تھے اور

ان کی یہ کرامت تھی کہ باوجود اس کے کہ دھوپ اندر جا سکتی تھی لیکن پھر بھی اللہ رب العزت نہیں جانے دیتے تھے۔ کیونکہ قرآن میں ہے:

﴿ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ﴾

یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اور نشانی تب ہی ہوتی ہے کہ جب عادت کے مطابق نہ ہو بلکہ عادت کے خلاف ہو۔

اصحابِ کہف کے سونے کی کیفیت:

﴿وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۖ﴾

اللہ رب العزت فرماتے ہیں: تم دیکھو گے تو ایسے لگے گا جیسے وہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ جاگ نہیں رہے تھے بلکہ سوئے ہوئے تھے۔

کیا معنٰی؟ کہ جب آدمی جاگتا ہے تو آنکھ کھلی ہوتی ہے وہ ایسے سوئے ہوئے تھے کہ آنکھ بھی کھلی ہوئی ہے اور سوئے ہوئے بھی ہیں اور جاگتے ایسے تھے کہ جسم ڈھیلا نہیں تھا۔ جب آدمی دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ جاگتے ہیں حالانکہ وہ جاگتے نہیں تھے، درحقیقت سوئے ہوئے تھے۔

قرآن کریم فرماتا ہے: ﴿وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ۖ﴾ تمہارا خیال ہے کہ وہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں، تو "رقود" کا معنٰی ہے سونا۔

سورۃ یٰسٓ آپ میں سے تقریباً ہر آدمی کو آتی ہے اور بعض وہ ہیں جو اہتمام سے فجر کے بعد پڑھتے بھی ہوں گے۔ سورۃ یٰسٓ کی تلاوت فجر کے بعد کیا کریں۔

حدیث مبارک میں ہے: جو آدمی یٰسٓ کی تلاوت صبح کے وقت کرتا ہے اللہ اس کے دن بھر کی حاجات پوری فرما دیتے ہیں۔ جب اللہ اپنے ذمے کام لے لیں تو ہم اعتماد نہیں کرتے اور کوئی بندہ جب اپنے ذمے لے لے تو ہم فوراً اعتماد کر لیتے ہیں۔ یہ

انسانی طبیعت ہے۔ تو فجر کے بعد سورۃ یٰس کا اہتمام فرمایا کریں۔

قبر سونے کی جگہ ہے:

اب مسئلہ سمجھیں! سورۃ یٰس میں ہے:

﴿قَالُوْا یٰوَیْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا﴾[81]

قیامت کے دن کافر اٹھ کر کہیں گے کہ ہمیں سونے کی جگہ سے کس نے اٹھا دیا ہے؟ یہ قبر سونے کی جگہ ہے یا مرنے کی جگہ ہے؟ (مرنے کی۔ سامعین) میت پڑی ہے اور قرآن کریم میں ہے کہ وہ کہیں گے کہ ہمیں سونے کی جگہ سے کس نے اٹھا دیا ہے؟

آپ قبرستان میں گئے ہوں گے تو وہاں کتبے لکھے ہوتے ہیں۔ وہاں "مرقد" لکھا ہوتا ہے۔ تو "مرقد" کا معنٰی ہے سونے کی جگہ۔ تو یہ سونے کی جگہ ہے یا مرنے کی جگہ ہے؟ (مرنے کی جگہ ہے۔ سامعین) تو مرقد کیوں لکھتے ہیں؟ قرآن کریم میں ﴿مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا﴾ ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی موت ایسے ہے جیسے سونے والے کی موت ہوتی ہے اور سونے والی کی موت یہ ہے کہ روح اندر نہیں ہوتی لیکن روح کا تعلق موجود ہوتا ہے، اس کی روح بھی اندر موجود نہیں لیکن روح کا تعلق موجود ہے۔

فرق یہ ہے کہ سونے والے کو زندہ مانتے ہیں آنکھ سے نظر آنے کی وجہ سے اور مرنے والے کو زندہ مانتے ہیں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کی وجہ سے۔ حیات اُس میں بھی ہے اور حیات اِس میں بھی ہے، یہ نظر نہیں آ رہی کہ ﴿یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ﴾ ہے اور یہ سونے والے کی نظر آ رہی ہے۔ مشاہدے والی چیز

81۔ یٰس 52:36

کو ایمان نہیں کہتے، بِن دیکھے نبی کے فرمانے کی وجہ سے مانیں تو اس کو ایمان کہتے ہیں۔

اصحابِ کہف کا کتا:

﴿وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ﴾

اصحابِ کہف جب چلے تو اصحاب کہف کے ساتھ ان کا کتا بھی تھا اور وہ بھی غار کے باہر پڑا ہوا تھا۔ اصحاب کہف کا کتا ان کے ساتھ کیوں تھا؟ مفسرین کہتے ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ چونکہ کھاتے پیتے گھرانوں کے لوگ تھے تو رکھوالی والا کتا بھی رکھا تھا اور جب یہ گئے تو کتا بھی پیچھے چلا گیا اور ان کی صحبت میں رہا لیکن اتنی بات طے ہے کہ ان ولیوں کی صحبت میں رہنے والے کتے کا تذکرہ بھی اللہ پاک نے قرآن میں فرما دیا ہے۔

مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ معارف القرآن میں لکھتے ہیں کہ اگر ولی کی صحبت میں کتا آ جائے تو اس کے تذکرے اچھے ہوتے ہیں اور جب ولی کی صحبت میں انسان آ جائے تو بتائیں اس کے تذکرے کتنے اچھے ہوتے ہوں گے!

ان کے ساتھ بیٹھنے والا محروم نہیں ہوتا:

صحیح بخاری میں ایک روایت موجود ہے کہ کچھ فرشتے ایسے بھی ہیں جو ذکر کرنے والوں کو تلاش کرتے رہتے ہیں۔ جب وہ ایسی مجلس کو پا لیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہوں تو یہ فرشتے ایک دوسرے کو آواز دیتے ہیں کہ ادھر آ جاؤ! جو چیز تم تلاش کر رہے تھے وہ یہاں ہے۔ پھر وہ فرشتے ان ذاکرین کو آسمان دنیا تک اپنے پروں سے ڈھانپ لیتے ہیں۔ جب یہ مجلس ختم ہو جاتی ہے اور ذکر کرنے والے واپس چلے جاتے ہیں تو یہ فرشتے بھی آسمان کی طرف چڑھ جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو اس محفل کا علم ہے لیکن اللہ پھر بھی ان فرشتوں سے پوچھتے ہیں کہ میرے بندے کیا کہہ رہے تھے؟ فرشتے کہتے ہیں یا اللہ! وہ لوگ آپ کی تسبیح بیان

کر رہے تھے، آپ کی بڑائی بیان کر رہے تھے۔ اللہ پوچھتے ہیں کہ کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: انہوں نے آپ کو نہیں دیکھا۔ اللہ فرماتے ہیں: اگر وہ مجھے دیکھ لیں تو کیا کریں گے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ یا اللہ! اگر وہ آپ کو دیکھ لیتے تو آپ کی عبادت زیادہ کرتے، آپ کا ذکر اور زیادہ کرتے۔

اللہ فرماتے ہیں کہ وہ لوگ مجھ سے کیا چیز مانگ رہے تھے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ وہ آپ سے جنت مانگ رہے تھے۔ اللہ پوچھتے ہیں: کیا انہوں نے میری جنت کو دیکھا ہے؟ فرشتے کہتے ہیں کہ نہیں دیکھا۔ اللہ فرماتے ہیں: اگر وہ جنت کو دیکھ لیتے تو ان کی کیفیت کیسی ہوتی؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ اگر وہ دیکھ لیتے تو ان کی طلب اور زیادہ بڑھ جاتی۔ اللہ فرماتے ہیں: اچھا! یہ بتاؤ کہ وہ کس چیز سے پناہ مانگ رہے تھے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: وہ جہنم کی آگ سے پناہ مانگ رہے تھے۔ اللہ پوچھتے ہیں: کیا انہوں نے جہنم کو دیکھا ہے؟ یا اللہ! انہوں نے جہنم کو نہیں دیکھا۔ اللہ فرماتے ہیں: اگر وہ جہنم کو دیکھ لیتے تو ان کی کیفیت کیا ہوتی؟ یا اللہ! اگر وہ جہنم کو دیکھ لیتے تو اس سے زیادہ پناہ مانگتے اور اس سے زیادہ خوف کھاتے۔

اللہ تعالی فرماتے ہیں: اے فرشتو! گواہ رہنا، میں نے انہیں بخش دیا ہے۔ ان میں سے ایک فرشتہ عرض کرتا ہے کہ ان میں فلاں بندہ بھی تھا جو ان کے ساتھ ذکر کرنے کے لیے وہاں نہیں بیٹھا تھا بلکہ اپنے کسی کام سے وہاں آگیا تھا۔ تو اللہ فرماتے ہیں:

"هُمُ الْجُلَسَاءُ لَا يَشْقَى جَلِيسُهُمْ." [82]

یہ ذکر کرنے والے اتنے بابرکت ہیں ان میں اپنے کام کے لیے بیٹھنے والا بھی محروم نہیں رہتا۔

82۔ صحیح البخاری، رقم:6408

جب ایک کتا اللہ کے ولی کی صحبت میں آ جائے تو اللہ اس کو محروم نہیں کرتے، انسان ولی کی صحبت میں آجائے تو وہ محروم کیسے ہو سکتا ہے؟

کتا صاحبِ کمال ہو گیا پر اعتراض کا جواب:

یہاں پر ایک بات سمجھیں! خیبر پختونخواہ ضلع ہری پور میں میرا بیان تھا۔ بیان سے جب فارغ ہوا تو چند ایک نوجوان آئے۔ ان کے پاس دو تین کتابیں تھیں۔ مجھ سے انہوں نے کہا: ہم نے بات کرنی ہے۔ میں نے کہا: کیا بات کرنی ہے؟ بندہ مولوی ہو تو بات کرنے کو بھی جی چاہتا ہے، اب ان سے کیا بات کریں؟

میں نے کہا: چلو آپ کا شوق بھی پورا کر لیں۔ کہنے لگے: ہمارے ہاتھ میں "امداد المشتاق" حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ہے، آپ مانتے ہیں؟ میں نے کہا: میں مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی مانتا ہوں اور ان کی ساری کتابوں کو بھی مانتا ہوں۔ آپ بسم اللہ پڑھیں، جو اعتراض ہے آپ شوق پورا کر لیں۔ کہتے ہیں: "امداد المشتاق" میں حضرت تھانوی صاحب نے حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کا ایک ملفوظ لکھا ہے کہ حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت جنید بغدادی بیٹھے تھے۔ ایک کتا سامنے سے گزرا۔ جنید بغدادی کی نگاہ اس کتے پر پڑ گئی تو وہ کتا اتنا صاحبِ کمال ہو گیا کہ شہر کے کتے اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ وہ کتا ایک جگہ بیٹھا تو باقی کتے اس کے ارد گرد حلقہ بنا کر بیٹھے اور مراقبہ کیا۔[83]

تو وہ کہنے لگے کہ دیکھو! کتنی غلط بات لکھی ہے۔

میں نے کہا: کیا غلط بات ہے اس میں؟ کہنے لگے: پہلی بات تو اس میں غلط یہ ہے کہ کتا کامل ہو گیا، کیا کبھی کتا بھی کامل ہو سکتا ہے؟ اور دوسری غلط بات یہ ہے کہ

83۔ امداد المشتاق: ص 107

کتوں نے مراقبہ کیا، کیا کبھی کتے بھی مراقبہ کرتے ہیں؟

میں نے کہا: چلو قرآن سے پوچھ لیتے ہیں دونوں باتیں کہ حضرت تھانوی نے غلط بات کی ہے یا ٹھیک؟ کہنے لگا: قرآن سے پوچھتے ہیں؟ میں نے کہا: ہاں قرآن سے پوچھتے ہیں، جب قرآن پر اعتراض ہو تو دفاع دیوبند والے کرتے ہیں اور جب دیوبند والوں پر اعتراض ہو تو دفاع اللہ کا قرآن خود کرتا ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

میں نے کہا: ہمارے اکابرین جھوٹے نہیں تھے۔ اب سنو قرآن کیا کہتا ہے۔ اصحابِ کہف جو تھے وہ اس امت کے ولی ہیں یا گزشتہ امت کے؟ کہنے لگے کہ گزشتہ امت کے۔ میں نے کہا: ان کے ساتھ جو کتا ملا تھا اللہ نے قرآن میں جس کا ذکر کیا ہے تو یہ اس کا ذکر کیوں کیا ہے، اس کو اچھا سمجھ کر یا برا سمجھ کر؟ کہا: اچھائی تھی تبھی تو ذکر کیا۔ میں نے کہا: اُس امت کے ولی کی صحبت میں کتا آجائے تو بدل سکتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ولی کی صحبت میں آجائے تو کیوں نہیں بدلتا؟ قرآن کہتا ہے کہ وہ بدل گیا ہے اور تم ماننے کے لیے تیار نہیں ہو۔

پھر وہ مجھے کہنے لگا: جی کامل کیسے ہوا؟ میں نے کہا: تمہیں شک اس لیے پڑا ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ انسان کامل ہے اور کتا ناقص ہے تو ناقص کو کامل کیسے کہہ دیا؟ کتے کو کامل کہنا یہ انسان کے مقابلے میں نہیں ہے، اس کتے کو کامل کہنا دوسرے کتوں کے مقابلے میں ہے، انسان کا مقابلہ انسان سے ہوتا ہے اور کتے کا مقابلہ کتے سے ہوتا ہے۔

جنرل کا مقابلہ جنرل سے کریں!

اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ جامعہ امدادیہ فیصل آباد کے مہتمم اور شیخ الحدیث حضرت مولانا نذیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرے استاذ ہیں۔ صدر ضیاء الحق کا جب حادثہ پیش آیا تو استاذ جی نے طلبہ کو جمع کر لیا اور فرمانے لگے کہ آج بہت بڑا ولی دنیا سے چلا گیا ہے۔ اب استاذ صاحب فرمانے لگے کہ تمہیں تعجب ہو گا کہ میں نے اسے

کیسے ولی کہہ دیا ہے؟ وہ ڈاڑھی منڈاتا تھا تو ڈاڑھی منڈا ولی کیسے بن گیا؟ فرمایا: مجھے پتا ہے کہ تمہارے ذہن میں سوال آنا ہے۔ استاذ جی نے فرمایا کہ یہ شک تمہیں اس لیے پڑ رہا ہے کہ تم نے اس کا مقابلہ کیا ہے علماء سے اور شیخ الحدیث صاحب سے، جب اس کا مقابلہ علماء سے کریں گے تو پھر ولی نہیں ہو گا، آپ صدر کا مقابلہ دیگر صدور سے کریں پھر پتا چلے گا کہ وہ ولی تھا یا نہیں تھا؟

تاجر کا مقابلہ تاجر سے ہوتا ہے، افسر کا مقابلہ افسر سے ہوتا ہے، مولوی کا مقابلہ مولوی سے ہوتا ہے، انسان کا مقابلہ انسان سے ہوتا ہے اور کتے کا مقابلہ کتے سے ہوتا ہے۔ اگر مولوی ہو اور ڈاڑھی منڈاتا ہو کہو نیک آدمی ہے تو کیا کوئی مان لے گا؟ (نہیں۔ سامعین) اور افسر ڈاڑھی منڈاتا ہو لیکن رشوت نہ کھاتا ہو، نماز پڑھتا ہو اور ماتحتوں کا خیال کرتا ہو تو کیا کہتے ہیں؟ جی بڑا نیک آدمی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ اس کو نیک کیوں کہتے ہو؟ بھائی مصلے کے امام کی نیکی اور ہوتی ہے، افسر کی نیکی اور ہوتی ہے۔ بات سمجھ آ رہی ہے؟ (جی۔ سامعین)

کتوں کا کمال اور ہوتا ہے اور انسانوں کا کمال اور ہوتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ کتا بڑا سمجھدار ہے۔ اب اس کا یہ معنٰی تو نہیں کہ مسجد کے امام سے بھی بڑا سمجھدار ہے۔ سمجھداری کا معنٰی یہ ہے کہ دشمن کو بھی سمجھتا ہے اور مالک کو بھی سمجھتا ہے۔

جانوروں کے سجدہ کرنے کا ذکر:

دوسری بات وہ مجھے کہنے لگا: کتا مراقبے میں چلا گیا، یہ قرآن کے خلاف ہے۔ میں نے کہا: کتے سجدے کرتے ہیں اور تو کہتا ہے کہ مراقبہ بھی نہیں کرتے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ

وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ﴾[84]

اللہ فرماتے ہیں کہ چوپائے اللہ کو سجدہ کرتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ جانور سجدے کرتے ہیں اور تو کہتا ہے کہ مراقبہ نہیں کرتے۔ مراقبہ کا معنیٰ گردن جھکا لینا ہے اور سجدے کا معنیٰ گردن کو زمین سے لگا دینا ہے، گردن کو زمین سے لگائے تو سجدہ ہو جاتا ہے اور گردن جھکائے تو مراقبہ کیوں نہیں ہوتا؟

میں نے کہا: حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ کو سمجھنے کے لیے دیوبند کا دماغ چاہیے۔ آپ کا دماغ کام نہیں کرتا، اس کے لیے خوشبو دار دماغ چاہیے، بدبو دار دماغ سے کبھی بھی خوشبو سمجھ میں نہیں آتی۔

منکرینِ حیات کے اعتراض کا جواب:

﴿وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ﴾

اصحاب کہف جب بیدار ہوئے تو ان میں سے ایک نے پوچھا: ﴿كَمْ لَبِثْتُمْ﴾ تم کتنا عرصہ سوئے ہو؟ دوسرے کہنے لگے: ﴿لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ سوئے ہیں۔ کچھ کہنے لگے: ﴿رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ﴾ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ تم کتنا عرصہ سوئے ہو!

مجھے بتاؤ! یہ زندہ تھے یا مردہ تھے؟ (زندہ تھے۔ سامعین) کیا ان کو پتا چلا کہ یہ کتنا عرصہ سوئے ہیں؟ (سامعین۔ نہیں) نہیں پتا چلا نا! اب ذرا ایک دلیل کا جواب

84۔ الحج 18:22

آپ نے خود سمجھنا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ جو لوگ کہتے ہیں: انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ نہیں ہیں۔ وہ ہمارے خلاف اپنی دلیل میں قرآن کی آیت پیش کرتے ہیں:

﴿اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ﴾[85]

حضرت عزیر علیہ السلام گزر رہے تھے، ایک تباہ شدہ بستی کو دیکھا، پوچھا: اللہ اسے کیسے زندہ کرے گا؟ ﴿فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ﴾ اللہ نے سو سال کے لیے ان کو موت دے دی۔ پھر اللہ نے زندہ کیا تو پوچھا: ﴿كَمْ لَبِثْتَ﴾ اے عزیر! کتنا عرصہ وہاں ٹھہرے ہو؟ انہوں نے فرمایا: ﴿لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ﴾ اللہ! دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرا ہوں۔ اللہ نے فرمایا: ﴿بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ﴾ نہیں بلکہ آپ سو سال تک ٹھہرے ہیں۔

اب منکرینِ حیات کہتے ہیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام زندہ نہیں تھے۔ کیوں کہ اگر زندہ ہوتے تو انہیں پتا چل جاتا نا! میں نے پوچھا: بتاؤ اصحابِ کہف زندہ تھے یا نہیں؟ کہا: زندہ تھے۔ میں نے کہا: پھر پتا کیوں نہیں چلا؟ آپ تو کہتے ہیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام کو پتا نہیں چلا لہذا مردہ ہیں تو بتاؤ! اگر کوئی یہ کہے کہ اصحابِ کہف کو پتا نہیں چلا لہذا مردہ تھے تو مان لو گے؟ کہا جی نہیں۔ تو میں نے کہا کہ پتا نہ چلنا یہ مردہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

آپ یہاں بیٹھے ہیں، آپ کو پتا ہے کہ میں نے کتنے منٹ تقریر کی ہے؟

85۔ البقرۃ 259:2

(متکلمِ اسلام نے دو چار سامعین سے مخاطب ہو کر پوچھا تو جواب ملا کہ نہیں) اب آپ مردہ ہو گئے؟ (نہیں۔ سامعین) بھائی کسی چیز کا معلوم نہ ہونا یہ مردہ ہونے کی دلیل تھوڑی ہے۔ اللہ پاک دلوں کو زندہ فرمائے تو پھر یہ باتیں سمجھ میں آجاتی ہیں۔

ایک عجیب نکتہ:

ایک اور عجیب نکتہ سنیں اور اس کو سمجھیں۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾[86]

اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دن وہاں کا یہاں کے ہزار سال بنتے ہیں۔

اُس جہان کا ایک دن یہاں کے؟ (ہزار سال۔ سامعین) اور یہاں کے سو سال ہوں تو پھر وہاں کا کچھ حصہ بنے گا۔ تو عزیر علیہ السلام سے پوچھا:

﴿كَمْ لَبِثْتَ﴾

آپ کتنا ٹھہرے ہیں؟

انہوں نے فرمایا: ﴿لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾

ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرا ہوں۔

عزیر علیہ السلام کہاں سے آئے تھے؟ (وہاں سے۔ سامعین) تو اللہ پاک وہاں کا پوچھ رہے تھے یا یہاں کا؟ (یہاں کا۔ سامعین) اللہ یہاں کا پوچھ رہے ہیں اور حضرت عزیر علیہ السلام وہاں کا بتا رہے ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ ٹھہرے وہاں تھے تو بتایا بھی اسی جگہ کا ہے۔ اللہ نے فرمایا: میں وہاں کا نہیں بلکہ یہاں کا پوچھ رہا ہوں۔ تو وہاں کا "بعض یوم" ہے اور یہاں کا "مائۃ عام" ہے، وہاں کا کچھ ہے اور یہاں کا سو سال ہے۔ کوئی اختلاف ہے اس میں؟ (نہیں۔ سامعین) کتنی آسان سی بات ہے۔ قرآن

86۔ الحج 47:22

سمجھ میں اپنی نہیں آتا اور اعتراض دوسروں پر کرتے ہیں۔ اللہ پاک قرآن سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)

قرآن کریم کا نصف حصہ:

﴿وَلْيَتَلَطَّفْ﴾

یہ لفظ قرآن کریم کا نصف ہے۔ یہاں آدھا قرآن مکمل ہو گیا۔ اس لفظ میں جو "ت" ہے وہ پہلے نصف میں ہے اور "ل" دوسرے نصف میں ہے۔ اور آپ تعجب کریں گے کہ جہاں قرآن کا بالکل درمیان ہے اللہ لفظ کیسے لائے ہیں ﴿وَلْيَتَلَطَّفْ﴾ یہ لطف سے ہے۔ جب شروع ہے تو ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١﴾ اور جب ختم ہے تو ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝١﴾ شان ربوبیت کو بیان کیا اور جب درمیان میں ہے تو لفظ لطف کو لائے ہیں ﴿وَلْيَتَلَطَّفْ﴾۔

نرمی سے پیش آنا ذریعۂ نجات ہے:

اصحابِ کہف نے ایک بندے سے کہا: تم پیسے لے جاؤ اور پاک مال لے کر آنا اور ذرا نرمی سے معاملہ طے کرنا، تھوڑی سی بھی سختی کی تو پکڑے جاؤ گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سختی سے بندہ پکڑا جاتا ہے اور نرمی سے نکل جاتا ہے۔ اللہ کو سختیاں پسند نہیں ہیں اللہ کو نرمیاں پسند ہیں۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ سختی اور ہوتی اور مضبوطی اور ہوتی ہے۔ میں نے سختی کا انکار کیا ہے یہ نہ ہو کہ آپ مضبوطی کا انکار کر دیں۔ ایک لوہے کی زنجیر ہوتی ہے اور ایک ریشم کا رسا ہوتا ہے۔ لوہے کی زنجیر سخت ہوتی ہے اور ریشم کا رسا مضبوط ہوتا ہے۔ مسلمان کو لوہے کی زنجیر نہیں بننا چاہیے، ریشم کا رسا بننا چاہیے، اپنے عقیدے پر مضبوط رہو، سختی نہ کرو۔

تو اللہ رب العزت اس لفظ کو درمیان میں لائے ہیں۔

اصحابِ کہف کی یاد میں مسجد بنانے میں حکمت:

﴿قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿٢١﴾﴾

جب اصحابِ کہف وفات پا گئے غار میں تو اب مشورہ ہوا کہ ان کی یاد گار کے طور پر کوئی عمارت بنائیں۔ بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ یہاں بطورِ یاد گار کے مسجد بنالیں۔

مفسرین نے عجیب نکتہ لکھا ہے کہ ان کی یاد میں مسجد بنانے کا فیصلہ کیوں ہوا؟ کہا اس لیے کہ اس وقت چرچا ہو رہا تھا شرک اور توحید کا اور لڑائی ہو رہی تھی کہ اللہ دوبارہ زندہ کریں گے یا نہیں؟ تو چونکہ یہ زندہ مثال ان لوگوں کے لیے تھی کہ دیکھو! تین سو سال بعد اللہ نے ان کو زندہ کیا، اللہ مردے کو بھی زندہ کر سکتے ہیں۔ اگر یہاں پر مسجد نہ بناتے کوئی اور تعمیر کر لیتے تو ممکن تھا کہ لوگ ان کو سجدے کرنا شروع کر دیتے۔ مسجد بنائی یہ بتانے کے لیے کہ تم نے بھی سجدہ اس کو کرنا ہے جس کو سجدہ انہوں نے کیا تھا۔

حضرت امیر شریعت کا جملہ:

امیرِ شریعت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب میں حضور کے رخسار دیکھتا ہوں تو جی کرتا ہے کہ سجدہ کر لوں، نبی کی زلفیں دیکھوں تو جی چاہتا ہے کہ جھک جاؤں لیکن جنگِ بدر میں انہی زلفوں کو زمین پر ٹیک کر نبی کو خدا سے مانگتے دیکھتا ہوں تو میں کہتا ہوں: عطاء اللہ! سجدہ اسے کر جسے یہ رخسار والا کر رہا ہے۔ مجھے پیغمبر کے سجدے نے اللہ کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اللہ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)

اصحابِ کہف کی تعداد:

﴿سَیَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ؕ﴾

اصحابِ کہف کی تعداد کتنی تھی؟ قرآن کریم نے تین قول نقل کیے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ تین تھے اور چوتھا ان کا کتا تھا، بعض کہتے ہیں: پانچ تھے اور چھٹا کتا تھا اور بعض کہتے ہیں: سات تھے اور آٹھواں کتا تھا۔

اصحابِ کہف سات تھے... دلیل:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ قرآن میں ہے کہ میرے پیغمبر! آپ کہہ دیں: ﴿رَّبِّیْۤ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ﴾ صحیح تعداد ان کی اللہ ہی جانتا ہے، ﴿مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ﴾ دنیا میں بہت کم لوگ ہیں جو ان کی تعداد کو جانتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: "اَنَا مِنَ الْقَلِيْلِ" میں بھی ان چند لوگوں میں سے ہوں اور جانتا ہوں کہ کتنے تھے؟ وہ سات تھے اور آٹھوں ان کا کتا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما دلیل یہ دیتے ہیں کہ جب اللہ نے پہلا اور دوسرا قول نقل کیا یعنی بعض کہتے ہیں: تین تھے اور چوتھا کتا تھا اور بعض کہتے ہیں: پانچ تھے اور چھٹا کتا تھا تو اللہ نے فرمایا: ﴿رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ﴾ یہ اٹکل پچو والی باتیں ہیں اور جب تیسرا قول نقل کیا کہ وہ سات تھے اور آٹھواں کتا تھا تو اس کو اٹکل کی باتیں نہیں فرمایا۔ اس کو اٹکل کے جملے کے بعد فرمایا ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دو قول ٹھیک نہیں ہیں، تیسرا قول ٹھیک ہے۔

اور دوسری دلیل یہ ہے کہ فرمایا: جب یہ سوئے ہوئے تھے اور اٹھے تو ﴿قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ﴾ ان میں سے ایک بندے نے کہا: تم کتنا عرصہ ٹھہرے ہو؟ کتنے بندوں نے کہا؟ (ایک نے۔ سامعین)، پھر ﴿قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ

يَوْمٍ﴾ یہاں ”قَالُوْا“ یہ جمع ہے، انہوں نے کہا: ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے ہیں۔ جمع کے کم از کم تین فرد ہوتے ہیں۔ پھر فرمایا: ﴿قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ﴾ دوسروں نے کہا: اللہ بہتر جانتا ہے کہ تم کتنا عرصہ ٹھہرے ہو! اب یہ تین جملے ہو گئے۔ ایک نے کہا: کتنا عرصہ ٹھہرے ہو؟ بعض نے کہا: ایک دن یا دن کا کچھ حصہ اور بعض نے کہا: اللہ بہتر جانتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: پہلا قائل تو ایک تھا، دوسرا بھی جمع ہے اور تیسرا بھی جمع ہے اور جمع کے کم از کم تین فرد ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ تین جمع تین چھ، جمع ایک؛ کُل سات ہوئے۔

حضرت ابن عباس کو حضور علیہ السلام کی دعا:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ تفسیر کیوں فرماتے ہیں؟ یہ بھی سمجھ لیں! میں نے آپ کو سنایا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خالہ تھیں۔ ان کی والدہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو کبھی بھیج دیتیں کہ جاؤ بیٹا! وہاں سو بھی جانا اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے رات کے اعمال بھی دیکھنا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم رات کو اٹھے، قضائے حاجت کے لیے گئے، واپس تشریف لائے تو ابن عباس بچے تھے، انہوں نے لوٹا پانی کا بھر کر رکھ دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: یہ پانی کس نے بھرا ہے؟

حضرت ابن عباس نے عرض کیا: میں نے بھرا ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دعائیں مانگیں:

"اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّأْوِيْلَ" [87]

87۔ المعجم الکبیر للطبرانی: ج5 ص184 رقم الحدیث 10467

اے اللہ! اس کو دین کا فقیہ بنا اور قرآن کا مفسر بنا!

جس کے لیے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ہو تو اگر اس پر بھی قرآن نہیں کھلنا تو بتاؤ قرآن کس پر کھلنا ہے؟

میں کہتا ہوں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے دعا کرائی نہیں تھی بلکہ دعا لی تھی، ہم دعائیں کراتے ہیں دعائیں لیتے نہیں ہیں، دعائیں کرانے کے بجائے دعائیں لینا سیکھ لو! دعا لینے کا مزہ اپنا ہوتا ہے اور دعا کرانے کا مزہ اپنا ہوتا ہے۔ اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

ہر نیک کام سے پہلے ان شاء اللہ کہنے کی تاکید:

﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝٢٣ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ﴾

اللہ نے فرمایا: اے میرے محمد! جب بھی آپ نے کوئی کام کرنا ہو تو یہ کہا کریں "ان شاء اللہ" اور ان شاء اللہ کہے بغیر کوئی کام نہ کیا کریں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شاء اللہ نہیں کہا تو سترہ دن وحی بند ہو گئی۔ یہ ناراضگی نہیں تھی بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھانا مقصود تھا۔ جتنا کسی کا مقام ہوتا ہے سمجھانا اسی طرز کا ہوتا ہے۔ اللہ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

جب کوئی کام کرنا ہو تو ان شاء اللہ کہا کرو اور جب کوئی کام کر لو تو پھر ماشاء اللہ کہا کرو۔ ہمارے بعض لوگ ماشاء اللہ اور ان شاء اللہ میں فرق نہیں کرتے۔

ایک حکایت:

کہتے ہیں کہ ایک بندے کے پاس پیسے تھے۔ کسی نے پوچھا: کہاں جا رہے ہو؟ کہا: منڈی جا رہا ہوں گھوڑا خریدنے کے لیے۔ تو اس نے کہا: بھائی! ان شاء اللہ کہا کرو! اس نے کہا: پیسے جیب میں ہیں، اب کیا ان شاء اللہ کہنا ہے۔ خیر وہ منڈی چلا گیا تو جیب

کٹ گئی۔ جب شام کو واپس آیا تو لوگوں نے پوچھا: گھوڑا خریدا؟ اس نے کہا: ان شاء اللہ جب میں بازار گیا تو ان شاء اللہ میں جب وہاں پہنچا تو ان شاء اللہ میری جیب کٹ گئی۔ لوگوں نے کہا: جیب کٹ گئی اب ان شاء اللہ کہنے سے کچھ بھی نہیں ہو گا، جب جیب میں مال ہو تو بندہ ان شاء اللہ نہیں کہتا اور جب جیب کٹ جائے تو پھر ان شاء اللہ ان شاء اللہ کہتا ہے۔ (مسکراہٹ از سامعین) اللہ ہم سب کو جب کام اچھا کریں تو ان شاء اللہ کہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

برا کام کرنا نہیں چاہیے اور کبھی کریں تو پھر ان شاء اللہ نہ کہیں، گندے کام پر وعدوں کی ضرورت نہیں ہے، اچھے کاموں پر وعدوں کی ضرورت ہے۔ اللہ پاک ہم سب کو قرآنِ کریم سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

دو آدمیوں کا قصہ:

﴿وَ اضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلًا رَّجُلَيۡنِ جَعَلۡنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيۡنِ مِنۡ اَعۡنَابٍ وَّ حَفَفۡنٰهُمَا بِنَخۡلٍ وَّ جَعَلۡنَا بَيۡنَهُمَا زَرۡعًا ﴿۳۲﴾﴾

اللہ رب العزت نے ان آیات میں دو آدمیوں کا واقعہ بیان فرمایا ہے ہمیں سمجھانے کے لیے۔ ان میں ایک شخص وہ تھا جس کے پاس زمین بھی ہے، باغات بھی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ساری نعمتیں موجود ہیں لیکن وہ ان نعمتوں کی قدر کرنے کے بجائے کفریہ کلمات کہتا اور ان انعامات کو اللہ کی جانب سے سمجھنے کے بجائے اپنی محنت کی بنیاد سمجھتا اور اس کا خیال یہ تھا کہ میرے پاس جو دولت موجود ہے شاید اس پر کبھی زوال نہیں آئے گا۔

مدِ مقابل اہل حق اور نیک آدمی تھا، اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ دیکھ! اللہ نے تجھے ایک نطفہ سے پیدا فرمایا، اللہ نے تجھے مرد بنایا، اللہ نے تجھے دولت عطا فرمائی، اس پر تجھے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور جب تو اللہ کی دی ہوئی نعمت اور

باغات کو دیکھے تو تجھے "ماشاء اللہ لا حول ولا قوۃ الا باللہ" کہنا چاہیے اور اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے دماغ میں یہ تھا کہ میرے پاس دولت موجود ہے اور یہ ہمیشہ رہے گی لیکن اس کا احساس اس کو اس وقت ہوا جب اللہ رب العزت نے ان نعمتوں کو چھین لیا، باغات کو ختم کر دیا اور یہ خالی ہاتھ رہ گیا اور اس وقت یہ کہہ رہا تھا:

﴿يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۝۴۲﴾

اے کاش! میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا، اے کاش! میں اللہ کی نعمت کی قدر کر لیتا، لیکن اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ۝۴۳﴾

جب اللہ کی گرفت آجائے پھر اللہ سے چھڑانے والا کوئی نہیں ہوتا۔

ہر وقت اللہ کا شکر ادا کیا جائے:

جب اللہ نعمتیں عطا فرمائے اس وقت انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ کا شکر ادا کرے، جب نعمتیں چھن گئیں اب رونے سے کیا بنے گا؟ اس میں ہمیں یہ بات سمجھائی ہے کہ اللہ کی عطا کردہ نعمت کو اللہ کی طرف سے سمجھیں، اللہ کی ان نعمتوں میں جو خدا نے ہمارے ذمے حق لگائے ہیں ان حقوق کو ادا کریں، جس طرح ہم مال کے آنے پر خوش ہوتے ہیں اسی طرح اللہ کے حکم پر مال دینے میں بھی خوش ہونا چاہیے۔

دنیا کی بے ثباتی کی مثال:

﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ۝۴۵﴾

اللہ رب العزت نے مثال دے کر دنیا و آخرت کو سمجھایا ہے۔ فرمایا: ان

لوگوں کے سامنے دنیا کی یہ مثال پیش کرو کہ دنیا کی مثال بالکل ایسے ہے جیسے ہم نے آسمان سے بارش برسائی تو اس سے زمین ہری بھری ہو گئی لیکن ایک وقت آتا ہے کہ وہ ہریالی سب ختم ہو جاتی ہے اور وہ سبزہ ایسا ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے کہ ہوائیں چلتی ہیں تو اسے اڑا لے جاتی ہیں۔

اللہ نے آپ کو مال بھی دیا ہے، اللہ نے دولت بھی دی ہے، یہ دنیوی زندگی کی رونق ہے، اس نے ختم ہو جانا ہے اور باقی کیا رہے گا؟ فرمایا:

﴿وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ۝۴۶﴾

اولاد بھی چلی جائے گی اور دولت بھی چلی جائے گی لیکن جو نیک عمل اللہ کے پاس بھیجا ہے وہ عمل باقی رہ جائے گا۔ اس لیے اولاد سے محبت کرنی چاہیے، مال سے محبت کرنا کوئی جرم نہیں ہے لیکن مال کا غلط استعمال کرنا جرم ہے۔

﴿وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ﴾

فرمایا: جب قیامت کے دن اعمال نامے کھولے جائیں گے تو مجرم اپنے اعمال نامہ کو دیکھ کر ڈر جائے گا اور کہے گا:

﴿يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا﴾

ہائے ہماری بربادی! میرے نامہ اعمال میں تو ہر قسم کا عمل لکھ دیا گیا ہے۔

﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۝۴۹﴾

جتنے اعمال انہوں نے کیے ہوں گے وہ سارے اعمال اپنے سامنے رکھے ہوئے پائیں گے اور اللہ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرے گا۔

قیامت کے دن ایک جھگڑالو شخص کا حال:

حدیث پاک میں ہے کہ قیامت کے دن بھی بعض لوگ ایسے جھگڑالو ہوں

گے کہ اللہ رب العزت جب انہیں فرمائیں گے: تم نے کیا کیا؟ تو وہ کہے گا: میں تیری توحید پر ایمان لایا، تیرے نبیوں کو میں نے مانا ہے، میں نے نیک اعمال کیے ہیں۔ اللہ نامۂ اعمال کھول کر رکھیں گے کہ تیرے نامہ اعمال میں توحید بھی نہیں ہے، میرے پیغمبر پر ایمان لانا بھی نہیں ہے، میرے نبی کی اطاعت کرنا بھی نہیں ہے، تیرے نامہ اعمال میں کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ کہے گا کہ نامۂ اعمال کا مجھے نہیں پتا، میں نے کبھی نہیں دیکھا لیکن جو بات میں کہتا ہوں بالکل سچی ہے۔

اللہ رب العزت فرمائیں گے: فرشتو! تم گواہی دو۔ فرشتے کہیں گے کہ یہ شخص جھوٹ بولتا ہے، نہ اس کے پاس توحید تھی نہ نبی پر ایمان تھا اور نہ ہی یہ نیک اعمال کرتا تھا۔ وہ کہے گا: فرشتوں کو میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں، اللہ! یہ کہاں سے آپ گواہ لے کر آئے؟ اللہ لوح محفوظ رکھ دیں گے کہ یہ دیکھ اس میں سارا کچھ لکھا ہوا ہے۔ وہ کہے گا کہ اللہ آپ کا تو وعدہ ہے کہ آپ کبھی بندے پر ظلم نہیں کرتے تو جو چیزیں میں نے دیکھی نہیں وہ میرے خلاف گواہ کیسے بن گئی ہیں؟ تو یہ شخص قیامت کو بھی جھگڑے گا۔

پھر حدیث پاک ہے میں کہ اللہ اس کی زبان پر مہر لگا دیں گے۔ اب اس کے ہاتھ بولیں گے کہ گناہ کیا تھا؟ اللہ فرمائیں گے کہ اب ان کو جھٹلا! انسان کے جسم کے اعضاء بولیں گے کہ اللہ! اس نے ہم سے گناہ کیا تھا۔ اللہ فرمائیں گے: اب اس کو جھٹلا! لیکن یہ شخص ان گواہوں کو جھٹلا نہیں سکے گا۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ بد اعمالیوں اور بد کرداری کی وجہ سے اس کے اپنے اعضاء کی گواہی کے بعد اللہ پاک اس کو جہنم میں ڈال دیں گے اور اس کے مدِ مقابل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" اِذَا تَابَ الْعَبْدُ أَنْسَى اللّٰهُ الْحَفَظَةَ ذُنُوْبَهٗ وَأَنْسٰى ذٰلِكَ جَوَارِحَهٗ

وَمَعَالِمَهٗ مِنَ الْاَرْضِ حَتّٰى يَلْقَى اللّٰهَ وَلَيْسَ عَلَيْهِ شَاهِدٌ مِنَ اللّٰهِ بِذَنْبٍ"[88]

جب بندہ اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہے تو اللہ فرشتوں کو اس کے گناہ بھلا دیتے ہیں، جسم کے گناہ کو بھلا دیتے ہیں، اللہ زمین کو گناہ بھلا دیتے ہیں، قیامت کے دن یہ بندہ اس حال میں خدا کے پاس جائے گا کہ کوئی اس کے خلاف گواہی دینے والا نہیں ہو گا۔ اللہ ساری گواہی ختم کر دیں گے۔ اللہ ہم سب کو گناہوں سے بچنے اور توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)

حضرت موسیٰ و حضرت خضر علیہما السلام کا واقعہ:

اب یہاں آیت نمبر 60 سے آیت نمبر 82 تک حضرت موسیٰ و حضرت خضر علیہما السلام کا واقعہ اللہ رب العزت نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام بھی سنا ہے، حضرت خضر علیہ السلام کا نام بھی سنا ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام کے بارے میں آپ نے بہت ساری بے جا باتیں بھی سنی ہیں۔ میں ان کا بھی تذکرہ کروں گا بلکہ آپ کو حیرانی ہو گی کہ بسا اوقات لوگ مصافحہ کرتے وقت انگوٹھا دباتے ہیں۔ ہم پوچھے ہیں: کیوں دبایا؟ کہتے ہیں: چیک کرتے ہیں کہ خضر تو نہیں ہے۔ میں نے کہا: انگوٹھوں سے خضر تھوڑی بنتے ہیں! پھر تو جن کے انگوٹھے کٹے ہوتے ہیں وہ سارے خضر بن جائیں گے۔ یہ بالکل غلط مشہور کر رکھا ہے کہ خضر علیہ السلام کا انگوٹھا نہیں ہو گا یا انگوٹھے کی ہڈی نہیں ہو گی۔ بھائی! آپ مجھے جانتے ہیں کہ میں کہاں کا ہوں، میرے انگوٹھے پر آپ کیسے فیصلہ کریں گے؟ میں آپ کو جانتا ہوں کہ آپ کون ہیں، انگوٹھے پر فیصلہ کیسے ہو گا؟ ہماری قوم بھی عجیب ہے۔ اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

88۔ کنز العمال: ج4 ص87 رقم 10175

پورے واقعہ کا پہلے خلاصہ سن لیں، پھر میں آپ کی خدمت میں قرآنِ کریم کی آیات پیش کرتا ہوں:

صحیح بخاری میں حدیث موجود ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام بنی اسرائیل کو بیان ووعظ فرما رہے تھے، دین کی دعوت دے رہے تھے، ان میں سے ایک شخص نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ آپ سے بڑا عالم بھی کوئی ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھ سے بڑا عالم کوئی نہیں ہے اور یہ بات موسیٰ علیہ السلام کی بجا تھی کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نبی ورسول ہیں، کلیم اللہ ہیں، تورات ان پر نازل ہوئی ہے، بات بالکل بجا تھی لیکن موسیٰ علیہ السلام کا اس طرح بات کہنا اللہ کو پسند نہیں آیا۔

کیوں؟ اس لیے کہ یہ دعویٰ یوں نہیں کرنا چاہیے تھا بلکہ موسیٰ علیہ السلام یوں فرماتے: میرے علم کے مطابق میرے خیال میں تو مجھ سے بڑا عالم نہیں ہے یا فرما دیتے کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن موسیٰ علیہ السلام نے جس انداز میں فرمایا کہ مجھ سے بڑا کوئی عالم نہیں اللہ رب العزت کو یہ ادا پسند نہیں آئی۔ اس ادا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عملاً تربیت کا فیصلہ فرمایا۔ انسان جتنا بڑا ہوتا ہے اس کی تربیت بھی اتنی ہی سخت ہوتی ہے۔

مقامِ ناز اور مقامِ نیاز:

موسیٰ علیہ السلام اللہ کے محبوب بھی ہیں، اللہ کے لاڈلے بھی ہیں، کلیم اللہ بھی ہیں اور موسیٰ علیہ السلام اللہ کے ناز والے پیغمبر ہیں۔ ایک ہوتے ہیں نیاز والے اور ایک ہوتے ہیں ناز والے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام مقامِ نیاز پر تھے، نیاز والا ہر بات کو قبول کرتا ہے اور بولتا نہیں ہے اور مقامِ ناز والا ہر بات پر بول کے پوچھتا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام مقامِ نیاز پر تھے۔ میں نے ایک بات عرض کی تھی شاید

آپ کو یاد ہو کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج سے واپس تشریف آئے تو ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کو پچاس نمازوں کے بارے میں بتایا۔ ابراہیم علیہ السلام نے کوئی بات نہیں کی لیکن موسیٰ علیہ السلام بول پڑے کہ یہ قوم پچاس نمازیں نہیں پڑھے گی، اللہ سے کم کروالیں۔ یہاں موسیٰ علیہ السلام کیوں بولے؟ اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مقامِ ناز پر تھے تو ناز والے بولا کرتے ہیں، ناز والے سوالات کیا کرتے ہیں۔

آپ کسی شیخ کے مرید دیکھ لیں، کسی عالم کے عقیدت مند دیکھ لیں، کسی باپ کے بیٹے دیکھ لیں! ہر مرید ایک جیسا نہیں ہے۔ بعض مرید ہر بات پر جی جی کہتے ہیں اور بولتے نہیں ہیں اور بعض مرید تھوڑے سے بے جھجک ہو کر بات کر لیتے ہیں۔ تو دونوں کے قسم کے مرید ہوتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے پیغمبر بھی دونوں قسم کے ہیں۔

مجمع البحرین میں خضر علیہ السلام سے ملاقات:

موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ مجھ سے بڑا کوئی عالم نہیں ہے۔ اللہ نے فرمایا: اچھا! تم سے بڑا کوئی عالم نہیں ہے تو تم اس جگہ پر جاؤ جو دو سمندروں کے ملنے کی جگہ ہے، ﴿مَجۡمَعَ الۡبَحۡرَيۡنِ﴾ دو سمندروں کے ملنے کی جگہ ہے۔

مفسرین کے اس پر کئی اقوال ہیں کہ کون سی جگہ ہے؟ لیکن ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ کون سی جگہ ہے۔ فرمایا کہ اس جگہ پر جاؤ اور اس کی علامت یہ ہے تمہارے پاس جو مچھلی موجود ہو گی یہ تمہارے پاس سے نکلے گی اور سرنگ بنا کر دریا میں داخل ہو جائے گی۔ جس جگہ پر مچھلی جائے وہاں تمہیں ہمارا ایک بندہ ملے گا اور وہ تم سے بھی بڑا عالم ہو گا، ان کے پاس وہ علم ہو گا جو تمہارے پاس بھی نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھ اپنے خادم یوشع بن نون بن افرائیم بن یوسف کو لیا۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پڑپوتے ہیں۔ بعض روایات میں ہے

کہ حضرت یوسف علیہ السلام نہیں بلکہ بھانجے تھے۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کی خدمت پر مامور تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ چلو! چلنا ہے۔ کہاں جانا ہے؟ جہاں دو دریاؤں کی ملنے کی جگہ ہے۔ کیوں جانا ہے؟ یہ ہمارا مقصد ہے۔

خادم کو بتانا چاہیے کہ کہاں جانا ہے!

مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے بڑی عجیب بات لکھی ہے۔ فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم کو بتا دیا کہ کہاں جانا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تواضع اور ادب دیکھیں کہ خادم کو بتایا۔ فرمایا: آج اگر خادم پوچھے کہ کہاں جانا ہے؟ تو کہتے ہیں کہ تو کون ہوتا ہے پوچھنے والا؟ تو کون ہوتا ہے بک بک کرنے والا؟ بس تو گاڑی چلا جو تیرے ذمے کام ہے۔

ہم موسیٰ علیہ السلام سے تو بڑے مخدوم نہیں ہیں، انہوں نے اپنے خادم کو بتا دیا کہ میں نے فلاں جگہ جانا ہے۔ اس لیے خادم کو بتانا یہ ادب کے خلاف نہیں ہے۔ اس کی حوصلہ افزائی کا سبب ہے کہ میں نے فلاں جگہ جانا ہے۔ اسی حساب سے گاڑی سیٹ کرے گا، اسی حساب سے خدام تیاری کریں گے ورنہ وہ تیاری نہیں کریں گے۔ پھر آپ غصے بھی ان پر ہوں گے، ہاں اگر کوئی خفیہ سفر ہو تو پھر بتانا ضروری نہیں ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے بھی فرمایا کہ آپ مدینہ منورہ میں ہیں۔ مزاجِ مبارک یہ تھا کہ جب آپ نے جنگی سفر کرنا ہوتا تو صحابہ کے درمیان میں بیٹھ کر مشورہ کرتے، مشرق کی طرف کا راستہ کتنا ہے، سفر کتنا ہے، راستہ میں مقامات کیسے ہیں؟ کیوں کہ اندر جو منافق موجود ہیں، وہ دشمن کو اطلاع نہ کریں کہ تمہارے اوپر حملہ ہے۔ مشورہ مشرق کا ہوتا لیکن صبح جب سواری پر سوار ہوتے تو سفر مغرب کا ہوتا، یہ عمومی مشورہ ہوتا تھا لیکن دو چار جو خاص لوگ ہوتے تھے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ یہ روزانہ کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کے شوریٰ کے

آدمی تھے، روزانہ ان کے ساتھ مشورہ سارے امور پر چلتا تھا ورنہ عموماً آپ مشورہ ایسے فرماتے تھے۔

مردہ مچھلی زندہ ہو کر پانی میں چلی گئی:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت یوشع علیہ السلام سے فرمایا: چلو! انہوں نے تیاری کی، ایک مچھلی ساتھ لے لی، اس مچھلی کو تیار کر لیا کہ سفر میں کھائیں گے۔ اللہ رب العزت نے یہ تو فرمایا تھا کہ دو دریاؤں کی ملنے کی جگہ ہے اور یہ علامت بھی بتا دی تھی کہ مچھلی ہو گی وہ دریا میں چلی جائے گی لیکن یہ نہیں بتایا کہ بطورِ متعین کون سا وقت ہو گا، کون سی خاص جگہ ہو گی؟

یہ چلتے رہے۔ راستہ میں ایک جگہ پر موسیٰ علیہ السلام نے آرام کیا اور خادم صاحت جاگتے رہے۔ اچانک ان کے سامان والے تھیلے سے مردہ مچھلی زندہ ہوئی اور دریا میں سرنگ بنا کر اندر چلی گئی۔ اب بتاؤ! دریا میں تو کبھی سرنگ نہیں ہوتی، سرنگ تو پہاڑوں میں ہوتی ہے لیکن موسیٰ علیہ السلام نبی تھے اور یہ سارے واقعات خرقِ عادت پیش آرہے تھے۔ اس خادم نے دیکھا اور بتانا بھول گیا۔ موسیٰ علیہ السلام اٹھے اور چل دیے۔

حدیث پاک میں ہے کہ ایک دن اور ایک رات کا سفر طے کیا تو موسیٰ علیہ السلام پر تھکاوٹ کے آثار ہوئے، پہلے لمبا سفر کیا تو تھکاوٹ کے آثار بھی نہیں ہیں، بھوک اور پیاس نے بھی نہیں ستایا اور اب منزل سے آگے بڑھے تو تھکاوٹ ہو گئی۔ اپنے خادم سے فرمانے لگے کہ ہمارا ناشتہ لاؤ، کھانا لاؤ! اس نے کہا: اوہو میں تو بتانا ہی بھول گیا، وہ تو کل کی بات ہے کہ مچھلی دریا میں چلی گئی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے ڈانٹا نہیں بلکہ فرمایا کہ چلو! فوراً سفر واپس کرو، اسی جگہ کی تلاش میں تو ہم نکلے تھے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ اگر وہ بھولے تھے تو موسیٰ علیہ السلام بھی تو بھول

گئے تھے، وہ مچھلی بتانا بھولا لیکن موسیٰ علیہ السلام نے بھی تو نہیں پوچھا کہ ہم جا رہے ہیں مچھلی تمہارے پاس نہیں ہے، وہ سامان کدھر ہے؟ ان کو بھی خیال نہیں آیا تو یہ بھول گئے اور وہ بھی بھول گئے۔ موسیٰ علیہ السلام مچھلی کا پوچھنا بھول گئے اور وہ مچھلی کا سمندر میں جانا بھول گئے۔

لیلۃ التعریس کا واقعہ:

یہ بالکل ایسے ہے جیسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر پر جا رہے تھے، راستہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا، رات کا آخری پہر تھا، اب صبح صادق میں کچھ وقت باقی تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آرام کرو اور ایک جا کر بیٹھے اور ہمارا پہرہ دے۔ جب اذان ہو جائے تو وہ اٹھائے۔ کون پہرہ دے گا؟ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور! میں جگاؤں گا۔ فرمایا: ٹھیک ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی سو گئے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی سو گئے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اپنا کجاوہ لیا اور کجاوہ سے ٹیک لگا لی اور مشرق کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی سو گئے۔ ادھر سورج نکلا تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھلی۔ فرمایا کہ بلال! کیا ہوا؟ تم تو بیٹھے تھے ہمیں اٹھانے کے لیے اور تم بھی سو گئے؟ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! جس اللہ نے آپ کو سلایا اس اللہ نے مجھے بھی سلا دیا، آپ بھی سو گئے، ہم بھی سو گئے۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اذان دو! اذان دی۔ فرمایا: سنتیں پڑھو! سنتیں پڑھیں۔ اقامت کہو، اقامت کہہ دی گئی۔ فرمایا: اب فجر کی نماز ادا کرو۔[89]

89۔ صحیح مسلم، رقم:680، وغیرہ

علماء نے لکھا ہے کہ اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے وقت بھولنا سمجھ نہیں آتا لیکن اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بھولے نہیں ہیں خدا نے بھلایا ہے۔ عملاً امت کو سمجھانے کے لیے کہ اگر کسی موقع پر پوری جماعت کی نیند نہ کھلے اور پوری جماعت کی نماز قضاء ہو جائے تو اب ان کو نماز کیسے پڑھنی چاہیے؟ اللہ کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات صرف زبان مبارک سے نہیں بلکہ عمل سے بات سمجھائی ہے۔ بہت سارے کام اللہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عملاً یوں کرواتے ہیں تاکہ امت کو مسائل سمجھ میں آجائیں اور اس سے پیغمبر کو اجر ملتا ہے جب نبی عمل سے ایک بات کو سمجھاتے ہیں۔

بیٹھ کر نفل پڑھیں تو آدھا ثواب ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر نفل پڑھیں تو پورا ثواب ہے۔ یہ فرق کیوں ہے؟ علماء نے وجہ لکھی ہے کہ ایک ہے بیٹھ کر نفل پڑھنے کا اجر اور دوسرا ہے امت کو تعلیم دینے کا اجر۔ تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا اجر ڈبل ہو جاتا ہے اور امتی کا اجر سنگل رہتا ہے۔

میں اس لیے کہتا ہوں کہ عوام جتنا بھی نیک عمل کرلے کبھی بھی عالم کے برابر ان کے اعمال نہیں پہنچ سکتے۔ یہ بات ذہین نشین فرمالیں! اگر عالم جمعہ کے دن صبح تین گھنٹے سو بھی جائے تو آپ کے نوافل اس کے برابر نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ عالم سوئے گا، پھر غسل کرے گا، مطالعہ کرے گا اور تازہ دم ہو کر ان کو درسِ قرآن دے گا، مسائل سمجھائے گا۔ اب یہ جو مسجد میں پانچ سو بندہ آیا ہے تو عالم تازہ دم ہو کر مسئلے بتا رہا ہے، اس کا سونا اپنے لیے نہیں تھا اس کا سونا بھی آپ کے لیے تھا۔ عالم کی عبادت کا آپ تصور نہیں کر سکتے کہ اس کی عبادت کا اللہ نے کیا اجر عطا فرمایا ہے! اللہ تعالی یہ باتیں ہمیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

عالم اور غیر عالم میں فرق:

عام بندہ اس بات کو نہیں سمجھتا! بالکل اس کا وہی مزاج بنتا ہے جو مشرکین کا مزاج تھا۔ مشرکین کا مزاج یہ تھا کہ ہم میں اور نبی میں کیا فرق ہے؟ ہم سوتے ہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی سوتے ہیں، ہم کھاتے ہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی کھاتے ہیں، ہم نکاح کرتے ہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی نکاح کرتے ہیں، ہم بازار جاتے ہیں نبی بھی بازار جاتے ہیں، ہم نے کام کیا نبی نے بھی کام کیا۔

جو دھوکا اس مشرک کو تھا یہی دھوکا آج عوام کو بھی لگتا ہے۔ ہم میں اور مولانا صاحب میں کیا فرق ہے؟ یہ نماز پڑھاتا ہے اور تنخواہ لیتا ہے ہم دکان پر جاتے ہیں تو تنخواہ لیتے ہیں۔ دونوں ہی تنخواہ لیتے ہیں، جو دھوکا اُن کو تھا وہی دھوکا اِن کو ہے۔ ان کو دھوکا لگا تو وہ نبوت کی صحبت سے محروم ہو گئے اور آج دھوکا لگے گا تو عالم کے علم سے محروم ہوں گے۔ اس عالم کے علم میں کیا فرق پڑے گا؟ لیکن ہلکی سی بے ادبی سے اللہ علم سے محروم کر دیتا ہے۔ اللہ ہمیں علم بھی عطا فرمائے، اللہ ہمیں ادب بھی عطا فرمائے۔ (آمین)

ملاقات ہو گئی:

موسیٰ علیہ السلام واپس تشریف لائے۔ یوشع بن نون ان کے ساتھ تھے۔ وہاں دیکھا کہ ایک بندہ پاؤں سے لے کر سر تک چادر اوپر لے کر سویا ہوا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جا کر کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! انہوں نے سلام کا جواب دیا اور تعجب کیا کہ اس ویرانے میں کون ہے جس نے مجھے سلام کیا۔ پوچھا کون ہو؟ انہوں نے کہا: میں موسیٰ ہوں۔ انہوں نے کہا: کون سے موسیٰ؟ جواب دیا: بنی اسرائیل کا نبی۔ انہوں نے پوچھا: ہمارے پاس کیسے آنا ہوا؟ انہوں نے کہا: کچھ علم آپ کے پاس ہے جو ہمارے پاس نہیں، ہمیں اللہ نے بھیجا ہے وہ علم آپ سے سیکھنا ہے۔

حضرت خضر علیہ السلام نے فوراً فرمایا: اے موسیٰ! جو علم میرے پاس ہے

میں آپ کو سکھاؤں گا لیکن اس کو سہنے کی طاقت آپ کو نہیں ہے، بہتر ہے کہ آپ مجھ سے نہ سیکھیں! موسیٰ علیہ السلام فرمانے لگے کہ میں آپ کی اتباع کروں گا، آپ کی بات مانوں گا، میں ضبط اور صبر سے کام لوں گا۔

حضرت خضر کی شرط اور حضرت موسیٰ کا عہد:

حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم میرے ساتھ چلو اور میں جو کرتا جاؤں گا تم نے دیکھتے جانا ہے لیکن تم نے مجھ سے سوالات نہیں کرنے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں آپ کے ساتھ چلوں گا اور جو کام آپ کریں گے میں دیکھوں گا لیکن ان شاء اللہ میں پوچھوں گا نہیں۔

حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: چلیے! حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام یہ دونوں چلے ہیں۔ دریا کے کنارے جارہے تھے۔ تھوڑی دیر سفر کرنے کے بعد دریا کے کنارے کشتی آگئی اور یہ دونوں کشتی میں بیٹھ گئے۔ کشتی والوں نے حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہم السلام کو نیک آدمی سمجھ کر کرایہ نہیں لیا، بغیر کرایہ کے کشتی میں سوار کرلیا۔ حضرت خضر علیہ السلام کشتی میں بیٹھے اور کشتی میں بیٹھتے ہی کشتی کا ایک تختہ توڑ کر پھینک دیا۔ موسیٰ علیہ السلام فوراً بول اٹھے کہ آپ نے کشتی کیوں توڑی ہے؟ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: میں نے کہا تھا کہ آپ نے سوال نہیں کرنا! آپ تو پہلی ہی بات پر بول پڑے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فوراً کہا:

﴿لَا تُؤَاخِذْنِيْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ﴿٧٣﴾﴾

میرے معاملے میں تنگی پیدا نہ کریں! میں بھول گیا ہوں، آئندہ میں خیال کروں گا۔ فرمایا: ٹھیک ہے اب چلو۔ اب وہاں کشتی سے نیچے اترے۔ پھر آگے ایک کنارے پر بستی آباد تھی۔ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام وہاں گئے تو دیکھا کہ بچے کھیل رہے تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک نابالغ بچے کو پکڑا اور اسے

قتل کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام فوراً پوچھنے لگے:

﴿اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ؕ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ﴿۷۴﴾﴾

یہ آپ نے کیا کیا؟ بے گناہ بندے کو قتل کر دیا؟ حضرت خضر علیہ السلام فرمانے لگے:

﴿اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۵﴾﴾

میں کہتا تھا کہ تم میرے ساتھ نہیں چل سکتے! اے موسیٰ! جو علم میرے پاس ہے تیرے بس میں نہیں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام فرمانے لگے: بس یہ آخری بار ہے۔

﴿اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۭ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ﴾

اب اگر سوال کروں تو پھر مجھے اپنے پاس نہ رکھنا! بس ایک موقع مجھے اور دے دیں۔

بستی والوں کی دیوار ٹھیک کرنا:

یہ دونوں حضرات پھر چل پڑے۔ دورانِ سفر حضرت موسیٰ و حضرت خضر علیہما السلام ایک بستی سے گزرے تو ان بستی والوں سے انہوں نے کہا: ہمیں اپنا مہمان بنالو، ہم مسافر لوگ ہیں۔ بستی والوں نے مہمان بنانے سے انکار کر دیا۔ اسی بستی میں ایک دیوار تھی جو کہ ٹیڑھی تھی اور گرنے کے قریب تھی۔ حضرت خضر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے دیوار کو ٹھیک کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام جلالی آدمی تھے۔ پھر بول پڑے، فرمایا: یہ ہمیں مہمان بنانے کے لیے تیار نہیں، ایک وقت کا دو بندوں کو کھانا نہیں کھلاتے اور آپ مفت میں ان کی دیواریں کھڑی کر رہے ہیں! آپ ان سے کہتے کہ میں دیوار کھڑی کرتا ہوں لیکن اس کے پیسے لوں گا، وہ پیسے ان سے لیتے اور بیٹھ کر کھانا کھالیتے۔ حضرت خضر علیہ السلام فرمانے لگے:

﴿هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَ بَيْنِكَ﴾

بس موسیٰ! بس ہو گئی ہے، اب میں اور آپ اکٹھے نہیں چل سکتے، تمہارا راستہ جدا ہے اور میرا راستہ جدا ہے۔

تین کاموں کی توضیح:

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام جب یہاں سے الگ ہونے لگے تو حضرت خضر علیہ السلام نے اب ان تینوں واقعات کی توضیح فرمائی کہ میں نے کشتی کا تختہ کیوں توڑا، میں نے اس نابالغ بچے کو قتل کیوں کیا اور میں نے بغیر پیسوں کے دیوار کو سیدھا کیوں کیا ہے۔ فرمانے لگے:

کشتی کا تختہ توڑنے کی وجہ:

[۱]: ﴿اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ﴾

یہ کشتی مساکین کی تھی۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ ایک باپ کے دس بیٹے تھے، ان میں سے پانچ معذور تھے اور پانچ صحت مند تھے۔ پانچ صحت مند مزدوری کرتے اور اسی میں سے پانچ معذورین کو کھلاتے تھے اور معذوروں سے پیسے نہیں لیتے تھے۔ یہ کشتی ان کی تھی جس میں سوار ہوئے۔ ان لوگوں نے مفت میں سوار کیا تو حضرت خضر علیہ السلام نے انہیں یہ صلہ دیا کہ دریا کے پار ایک ظالم بادشاہ تھا اور وہ کشتیاں چھین لیتا تھا۔ چھینتا صحیح کشتی کو تھا۔ یہ بات حضرت خضر علیہ السلام کے علم میں تھی اور کشتی والوں کے علم میں نہیں ہو گا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی میں بیٹھتے ہی ایک تختے کو توڑ دیا۔ جب اس کنارے پر جائیں تو ظالم بادشاہ کے کارندے اس کشتی کو صحیح سالم نہیں عیب دار کشتی سمجھ کر چھوڑ دیں گے اور مساکین کی یہ کشتی بچ جائے گی۔ انہوں نے کرایہ نہیں لیا اور حضرت خضر علیہ السلام نے انہیں صلہ یہ دیا کہ ان کی

کشتی بادشاہ سے محفوظ ہو گئی۔

باقی خضر علیہ السلام نے جو کشتی توڑی تھی تو بعض مفسرین فرماتے ہیں: تختہ نکال دیا تھا اور بعد میں اس میں آئینہ جوڑ لیا تھا۔ اگر آئینہ نہیں جوڑا تو پھٹا نکالنے کے باوجود پانی کیوں نہیں آیا؟ خضر علیہ السلام؛ اللہ کے نبی تھے۔ آگے بات آئے گی اور یہ خضر علیہ السلام کا معجزہ تھا کہ تختہ ٹوٹنے کے باوجود بھی کشتی میں پانی نہیں آیا۔ اب حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کو عیب دار کیا اور ظالم بادشاہ سے ان کو بچا لیا، معذورین کا جو رزق لگا ہوا تھا اس کی حفاظت ہو گئی۔

بچے کو قتل کرنے کا سبب:

[۲]: حضرت خضر علیہ السلام فرمانے لگے:

﴿وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ﴿۸۰﴾﴾

جو بچہ میں نے قتل کیا ہے اس کے والدین ایمان والے اور نیک ہیں۔ یہ اگر بڑا ہو جاتا تو ہمیں خدشہ تھا کہ یہ سرکشی کرتا اور کفر کرتا۔ ﴿فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ﴿۸۱﴾﴾

تو ہم نے چاہا کہ اس بچے کو ختم کریں اور اس بچے کے بدلے میں اللہ تعالی ان کو اچھا بیٹا دیں۔ یہ جو ﴿فَاَرَدْنَآ﴾ فرما رہے ہیں تو یہ حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کیا پھر اللہ سے دعا مانگی اور اللہ نے بدلے میں دیا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ جن والدین کے بچے کو قتل کیا تھا اس کے بدلے میں اللہ نے ان کو بیٹی دی اور اس بیٹی سے خدا کے دو نبی پیدا ہوئے۔ فوت شدہ بچے کو تو آدمی ویسے بھول جاتا ہے۔ اب دیکھیں! اگر والدین سے بیٹا لیا ہے تو بدلے میں جو دیا ہے وہ بہتر ہے کیونکہ اس کے بطن سے نبی پیدا ہوئے

ہیں اور ان کی آگے امت بھی چلی ہے۔

دیوار کو سیدھا کرنے کا مقصد:

[۳]: ﴿وَاَمَّا الۡجِدَارُ فَکَانَ لِغُلٰمَیۡنِ یَتِیۡمَیۡنِ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ وَکَانَ تَحۡتَہٗ کَنۡزٌ لَّہُمَا﴾

فرمایا: ہم نے دیوار اس لیے کھڑی کی ہے کہ یہ دیوار جن بچوں کی ہے وہ یتیم ہیں اور شہر میں رہتے ہیں۔ اس دیوار کے نیچے ایک خزانہ موجود ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ بچے اس خزانہ کو لے لیں۔

﴿وَکَانَ اَبُوۡہُمَا صَالِحًا﴾

اور ان کا والد بہت نیک آدمی تھا، دنیا سے چلا گیا، خزانہ دفن کر گیا۔ اگر یہ دیوار گر جاتی تو خزانہ نیچے سے باہر آ جاتا، لوگ خزانہ لے لیتے اور یتیم بچے محروم رہ جاتے۔ ہم نے دیوار سیدھی کھڑی کر دی تاکہ بچے جب کل بڑے ہوں گے تو دیوار کے نیچے سے اپنے باپ کا خزانہ خود لے لیں گے۔ تو ہم نے یتیم بچوں کا کام کیا ہے، ہم نے بستی والوں پر احسان نہیں کیا۔ ہماری مہمان نوازی سے انکار بستی والوں نے کیا ہے اور ہم نے نیکی یتیم بچوں پر کی ہے۔

یہ تو مختصر قصہ تھا حضرت موسیٰ و حضرت خضر علیہما السلام کا جو میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا۔

بڑے کی بھول پر ڈانٹ کی وجہ:

اب چند ایک باتیں سمجھ لیں۔ بعض سوالات جو آپ کے ذہن میں آئے ہوں گے اگر نہیں آئے تو آنے چاہییں۔ اگر انسان کا دماغ کام کرے تو پھر سوال دماغ میں ضرور آنے چاہییں۔ میں بات بالکل صاف کرتا ہوں تاکہ مسئلے میں الجھن نہ

رہے۔

پہلی بات تو یہ سمجھیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بیان فرمارہے تھے اور ایک بندے نے پوچھا: آپ سے بڑا کوئی عالم ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھ سے بڑا عالم کوئی نہیں۔ یہ جملہ اگرچہ ٹھیک تھا لیکن اس جملے کا اندازہ وہ تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا بلکہ یوں فرماتے کہ میرے علم کے مطابق تو کوئی نہیں۔ اگر اور کوئی بڑا عالم موجود ہو تو شاید اللہ کے علم میں ہو۔

موسیٰ علیہ السلام چونکہ بہت بڑے آدمی تھے اور بڑے کی چھوٹی بات جو خلاف اولیٰ ہو اللہ تعالیٰ اس پر تنبیہ فرمادیتے ہیں تاکہ آئندہ امت کو تعلیم ہو جائے۔

حضرت آدم علیہ السلام کو خدا نے حکم دیا:

﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۵﴾ [90]

کہ آپ نے اس درخت کے قریب نہیں جانا!

حضرت آدم و حواء علیہما السلام دونوں بھول گئے۔ بھول جانا کوئی جرم نہیں تھا لیکن اللہ نے بھولنے پر بھی ڈانٹ دیا: آدم! تمہاری شان کے لائق یہ بھولنا نہیں تھا۔

یہاں بھی یہی بات ہے کہ اے موسیٰ! تمہاری شان کے لائق یہ جملہ ٹھیک نہیں تھا۔ تو جتنا آدمی بڑا ہو اسی طرح اس کو محتاط بھی زیادہ رہنا چاہیے۔

میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں، آپ بات ذہن میں رکھیں! ہمارے امام مسجد صاحب نماز میں سورۃ البقرۃ تلاوت کریں یا سورۃ الکہف تلاوت کریں اور اس میں بھول جائیں تو آپ کو تعجب نہیں ہو گا کہ ہمارے امام صاحب سورۃ الکہف میں بھول گئے ہیں لیکن امام صاحب اگر سورۃ الفاتحہ میں بھول جائیں تو آپ کو تعجب تو ہو گا کہ امام

90۔ البقرۃ 35:2

صاحب سورۃ الفاتحہ میں بھی بھول گئے حالانکہ بھولنا انسان کے بس میں نہیں ہے، سورۃ الفاتحہ میں بھی بھول سکتا ہے، سورۃ الکہف میں بھی بھول سکتا ہے لیکن سورۃ الکہف میں بھول جائے تو تعجب نہیں ہوتا اور فاتحہ میں بھول جائے تو تعجب ہوتا ہے۔

اگر آپ کے امام صاحب چھٹی پر ہوں اور ایک نیک آدمی ہے، چہرے پر ڈاڑھی ہے، قاری اور حافظ بھی نہیں ہے اس نے گیارہ سورتیں جماعت میں سہ روزہ کے دوران یاد کی ہیں وہ مصلیٰ پر پہلی بار کھڑا ہوا اور وہ سورۃ الفاتحہ میں بھول جائے اور ٹانگیں بھی کانپ جائیں تو کسی کو بھی تعجب نہیں ہو گا کیوں کہ یہ پہلی بار مصلے پر آیا ہے اور سورۃ الفاتحہ عام آدمی بھولے تو تعجب نہیں ہوتا اور امام بھول جائے تو تعجب ہے۔

ایسے جملے اگر عام آدمی کی زبان سے نکلیں تو ڈانٹ نہیں پڑتی اور اگر اللہ کے نبی کی زبان سے نکلیں تو اللہ ڈانٹ دیتے ہیں کہ آپ کو یہ جملے نہیں کہنے چاہییں تھے کہ یہ آپ کی شان کے لائق نہیں ہیں۔

میں اس لیے سمجھاتا ہوں کہ آپ اعتراض نہ کر گزریں کہ پھر موسیٰ علیہ السلام نے ایسا جملہ کیسے کہہ دیا جو اللہ کو پسند نہیں تھا۔

آدم علیہ السلام بھولے تو خدا نے ڈانٹ دیا کہ اے آدم! آپ کو نہیں بھولنا چاہیے تھا۔ کوئی اور بھول جائے تو الگ بات ہے۔ چالیس سال آدم علیہ السلام روئے ہیں کہ اے اللہ! میری اس خطا کو معاف فرما دے۔ تو جیسی ڈانٹ ہے تو اس کے مطابق آدم علیہ السلام روئے ہیں۔

چالیس سال تک تکبیرِ اولیٰ فوت نہیں ہوئی:

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے امام اھل السنۃ والجماعۃ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ سے یہ جملے اپنے کانوں سے سنے۔ اب نئی نسل تو ان سے واقف نہیں ہے اور پرانی نسل جو مذہب نہیں جانتی وہ بھی واقف نہیں ہے۔ گکھڑ

منڈی ضلع گوجرانوالہ حضرت کی مسجد میں میں نے قرآن مجید حفظ کیا ہے۔ میں نے اپنے کانوں سے سنا کہ حضرت فرمارہے تھے: میں دار العلوم دیوبند میں پڑھتا تھا اور ایک دن فجر کی نماز کے لیے میری آنکھ نہیں کھلی اور پہلی رکعت چلی گئی۔ میں دوسری رکعت میں نماز میں آیا۔ میرے استاذ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ نے مجھے بلایا اور پوچھا: اے بیٹے سرفراز! تیری ایک رکعت آج قضاء کیوں ہوئی ہے؟ فرمایا: چالیس سال گزر گئے میں نے تکبیر اولیٰ نہیں جانے دی، چالیس سال گزر گئے تکبیر اولیٰ نہیں جانے دی۔ تو بڑے لوگوں کی جب ڈانٹ پڑے تو پھر بڑے یوں ہوتے ہیں۔

استاذ چھوٹا بھی ہو تب بھی اس کا ادب کیا جائے:

موسیٰ علیہ السلام کو ہلکی سی ڈانٹ پڑی ہے۔ دیکھو! کتنا لمبا سفر کیا ہے تاکہ اللہ پاک جس طرح خوش ہوں میں نے اپنے اللہ کو مَنا کر دکھانا ہے۔ اللہ تو راضی تھے، ناراض ہونے والی تو بات ہی نہیں تھی لیکن ہلکی سی تنبیہ پر نبی کس طرح میدان میں نکلے ہیں۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام جب حضرت خضر علیہ السلام کے پاس آئے ہیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے فرمایا:

﴿سَتَجِدُنِيٓ إِنْ شَآءَ ٱللَّهُ صَابِرًا﴾

میں آپ کی بات مانوں گا، ضبط سے کام لوں گا اور جو آپ فرمائیں گے میں اتباع کروں گا۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑے ہیں اور حضرت خضر علیہ السلام چھوٹے ہیں لیکن اب موسیٰ علیہ السلام سیکھنے کے لیے آئے ہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام استاذ بنے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام شاگرد بنے ہیں۔ اگر استاذ چھوٹا بھی ہو تو پھر بھی استاذ کا ادب شاگرد کے ذمہ ہے۔

آدمی کی عمر پچاس سال ہو جائے اور قرآن کریم نہ پڑھا ہو اور اب دل میں آئے کہ مجھے قرآن پڑھ لینا چاہیے تو وہ پندرہ سال کے بچے سے قرآن پڑھنا شروع کرے تو اب اسے یہ ذہن بنالینا چاہیے کہ یہ میرا استاذ ہے، عمر کا چھوٹا ہے تب بھی اس کا ادب میرے ذمہ ہے۔

علمِ تشریعی اور علمِ تکوینی:

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں ان شاء اللہ آپ کی مکمل بات مانوں گا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کر دیا کہ جب آپ چلیں گے تو کچھ باتیں ایسی ہوں گی جو آپ کے بس میں نہیں ہوں گی، آپ کو صبر کرنا پڑے گا۔ یہ بات حضرت خضر علیہ السلام نے کیوں فرمائی؟ یہ بات اچھی طرح سمجھیں! حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس علمِ شریعت ہے اور حضرت خضر علیہ السلام کے پاس علمِ تکوین ہے۔ علمِ تکوین الگ ہے اور علمِ تشریع الگ ہے۔ علمِ تشریع کا معنیٰ ہے کہ نماز پڑھو، روزے رکھو، زکوٰۃ دو، گناہ سے بچو، نیک کام کرو، حلال اختیار کرو، حرام سے بچو، ماں باپ کا ادب کرو، باپ کا حق یہ ہے، اولاد کا یہ ہے.... تو یہ شریعت کا علم ہے اور تکوین کا علم یہ ہے بارش کب ہو گی؟ ہوا کب چلے گی؟ فصل کب نکلے گی؟ کوئی بندہ کب مرے گا؟ کوئی بندہ کب پیدا ہو گا؟ کوئی کب ٹھیک ہو گا؟ کب صحت مند ہو گا؟ رزق کتنا ملے گا.... یہ سب تکوینی چیزیں ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذمے شریعت ہے اور حضرت خضر علیہ السلام کے ذمے تکوین ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور علم ملا ہے اور حضرت خضر علیہ السلام کو اور علم ملا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: میں جو کام کروں گا چونکہ آپ کا علم ان کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا اس لیے آپ نے یقیناً اعتراض کرنا ہے۔ آپ اعتراض تو نہیں کریں گے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

نہیں، میں اعتراض نہیں کروں گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ کیوں فرماتے ہیں کہ میں اعتراض نہیں کروں گا؟اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس شریعت کا علم ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی نبی ہے، یہ شریعت کے خلاف تو کام نہیں کرے گا اس لیے مجھے اعتراض کرنے کی ضرورت کیا ہے!

آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟

بعض لوگ میرے پاس آتے ہیں اور مجھے کہتے ہیں: مولانا صاحب! ایک بات پوچھنی ہے، آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟ میں کہتا ہوں: جی ناراض ہونے والی بات ہو گی تو ناراض ہوں گے، نہیں ہو گی تو نہیں ہوں گے، میں خوامخواہ ایڈوانس کہہ دوں کہ نہیں ناراض ہوں گا! یہ غلط بات ہے۔ ناراض ہونے والی بات پر ناراضگی ہونی چاہیے، غصہ والی بات پر غصہ ہونا چاہیے۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس آدمی کو غصے والی بات پر غصہ نہ آئے وہ انسان نہیں بلکہ گدھا ہے۔ اگلا جملہ ... پھر معافی مانگنے پر معاف نہ کرے تو وہ انسان نہیں بلکہ شیطان ہے۔ اب بعض لوگ غصے نہیں ہوتے اور بعض لوگ معاف بھی نہیں کرتے۔ یہ دونوں ہٹ دھرم قسم کے لوگ ہیں۔

کشتی توڑنے پر اشکال کی وجہ:

میں بات سمجھا رہا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں ان شاء اللہ آپ کی بات مانوں گا۔ اب حضرت خضر علیہ السلام نے پہلا کام یہ کیا کہ جنہوں نے کشتی میں سوار کیا ان کی کشتی کا تختہ توڑ دیا۔ اب بتاؤ! کسی بندے کا نقصان کرنا یہ شریعت کے خلاف ہے یا نہیں؟ (خلاف ہے۔ سامعین) تو جب موسیٰ علیہ السلام شریعت کے خلاف کام دیکھیں گے تو کیسے برداشت کریں گے؟ انہوں نے تو کہنا ہے کہ آپ نے

تختہ کیوں توڑا ہے؟ مساکین کی کشتی آپ نے خراب کیوں کی ہے؟ اور حضرت خضر علیہ السلام کے ذمہ شریعت تھی یا تکوین تھی؟ (تکوین تھی۔ سامعین) تو اللہ کی طرف سے ان کے ذمہ تھا کہ آپ نے کشتی کو سنبھالنا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام شریعت کی وجہ سے اعتراض کر رہے تھے۔

”حضرت خضر نے بچے کو کیوں مارا؟“ کا جواب

اب آگے گئے تو بچے کو قتل کر دیا۔ توجہ رکھنا! آپ کے ذہن میں بھی آئے گا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے نابالغ بچے کو بغیر جرم کے قتل کیا۔ یہ تو بہت بڑا گناہ ہے اور نبی نے اتنا بڑا گناہ کیسے کر دیا؟ اب بتاؤ! جس فرشتے کے ذمے ہے کہ فلاں کی جان لینی ہے وہ فرشتہ جان لینے کا پابند ہے کہ نہیں؟ (پابند ہے۔ سامعین) یہ ظلم ہے؟ (نہیں۔ سامعین) کسی فرشتے کے ذمے ہے کہ یہ مکان فلاں گھر والوں پر گرا دو! فرشتہ گرائے گا یا نہیں؟ (گرائے گا۔ سامعین) بتاؤ! یہ ظلم ہے؟ (نہیں۔ سامعین)

تو حضرت خضر علیہ السلام کے ذمہ شریعت نہیں تھی، حضرت خضر علیہ السلام کے ذمے تکوین تھی۔ آپ نے فلاں کو مارنا ہے، مارنا چاہیے تھا کہ نہیں؟ (مارنا چاہیے تھا۔ سامعین) بتاؤ بھائی! یہ تکوینی امور اللہ فرشتوں کو دیتے ہیں اور وہی تکوینی امور فرشتے کے بجائے اللہ کسی انسان کو دیں تو بندہ اعتراض کر سکتا ہے؟ (نہیں۔ سامعین) بس بات صرف اتنی ہے۔

کتنے بندے یہاں سے لاہور جاتے ہیں اور ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے اور وہ فوت ہو جاتے ہیں۔ یہ ایکسیڈنٹ خود ہوتا ہے یا فرشتہ کرواتا ہے؟ خود بخود تو گاڑی نہیں لگتی۔ یہ فرشتے کے ذمے ہے کہ گاڑی کا ایکسیڈنٹ کروانا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس بندے کی موت یوں ہو گی تو فرشتہ اسی طرح موت دینے کا پابند ہے۔ اس بچے کی موت یوں ہو گی تو حضرت خضر علیہ السلام پابند ہیں کہ آپ نے موت

یوں دینی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام شریعت والے تھے تو انہوں نے کہا: یہ ناحق قتل کیوں کیا ہے؟ موسیٰ علیہ السلام بھی ٹھیک تھے، خضر علیہ السلام بھی ٹھیک تھے۔

ایک سوال کا جواب:

اگلی بات سمجھیں! حضرت خضر علیہ السلام فرما رہے ہیں کہ اگر یہ بچہ بالغ ہو جاتا تو اس نے کافر ہونا تھا اور والدین کی ذلت کا سبب بننا تھا۔ توجہ رکھنا! یہ سوال بڑا اہم ہے۔ یہ بچہ بالغ ہو جاتا تو یہ کافر ہو جاتا یہ اللہ کے علم میں تھا، ہم نے بالغ ہونے سے پہلے قتل کر دیا تاکہ یہ نہ بالغ ہو اور نہ ہی کافر ہو اور اس کے بدلے میں ان کو نیک اولاد مل گئی جس کے پیٹ سے اللہ نے نبی پیدا کیا اور آگے ان کی امت چلی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب کسی آدمی کے مقدر میں لکھا ہے کہ اس نے بڑا ہو کر کافر ہونا ہے تو یہ اللہ کے علم میں ہے کہ یہ بالغ ہوا تو کافر ہو گا۔ تو جب یہ نابالغ ہو کر قتل ہو گیا تو پھر یہ اللہ کے علم کے خلاف نہیں ہے؟ پتا نہیں آپ کے ذہن میں سوال بھی ہے کہ نہیں! میں نے خوامخواہ ایک سوال چھیڑ دیا ہے۔ کبھی آپ کے ذہن میں سوال ہوتا نہیں ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ذہن میں سوال آیا ہو گا تو میں سوال کر کے پھنس جاتا ہوں کہ ان کے تو ذہن میں نہیں تھا، ہم نے کون سی بحث چھیڑ دی ہے۔ آپ کے ذہن میں سوال آ گیا؟ (جی۔ سامعین)

مفسرین نے اس کا بڑا پیارا جواب دیا ہے کہ وجہ یہ ہے ایک ہوتی ہے تقدیرِ مبرم، ایک ہوتی ہے تقدیرِ معلق۔ تقدیرِ مبرم کا معنی کہ بہر حال یوں ہونا ہے اور تقدیرِ معلق کا معنی کہ اگر یوں ہوا تو یوں ہونا ہے، اگر یوں ہوا تو یوں ہونا ہے۔ اگر یہ بالغ ہوا تو کافر ہونا ہے اور بالغ نہ ہوا تو کافر نہیں ہونا۔ اس کی تقدیرِ مبرم نہیں تھی بلکہ تقدیرِ معلق تھی۔ اگر بالغ ہوا تو کافر ہونا ہے، بالغ نہ ہوا تو کافر نہیں ہونا۔ بالغ ہوتا تو کافر ہوتا اور بالغ نہیں تھا اور بلوغ سے پہلے قتل ہو گیا تو کفر بھی نہیں۔ یہ تقدیرِ معلق ہے، تقدیرِ مبرم

نہیں تھی۔

یتیم بچوں کا خزانہ کیا تھا؟

اس کے بعد یہ جو دیوار کا معاملہ تھا اس کو بھی ذہن میں رکھیں! دیوار کے مسئلے پر حضرت خضر علیہ السلام فرماتے ہیں: یہ دو یتیم بچوں کی دیوار ہے، ان کا والد نیک تھا، دیوار کے نیچے خزانہ موجود تھا، خزانہ کی ہم نے حفاظت کی ہے۔

پہلی بات سمجھیں کہ وہ خزانہ کیا تھا؟ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ سونا اور چاندی دفن تھا، جب یہ بچے بڑے ہوئے تو والد کا خزانہ ان کو ملا ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ خزانہ سے مراد ایک سونے کی تختی تھی۔ تختی بھی ہے اور سونے کی بھی ہے یعنی ظاہری بھی خزانہ اور باطنی بھی خزانہ اور اس تختی پر لکھا ہوا کیا تھا؟ اس میں پہلا جملہ لکھا ہوا تھا:

[1]: بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

[2]: دوسرا جملہ لکھا تھا: "عَجِبۡتُ لِمَنۡ یُؤۡمِنُ بِالۡقَدَرِ کَیۡفَ یَحۡزَنُ"

کہ تعجب اس آدمی پر ہے جو تقدیر کو مانتا بھی ہے پھر غمگین بھی رہتا ہے۔ تقدیر کے ماننے والے کو غمگین نہیں ہونا چاہیے، تقدیر کے ماننے والے کو خوش ہونا چاہیے کہ میرے مقدر میں جو لکھا تھا مجھے خدا نے عطا فرما دیا ہے۔

[3]: تیسرا جملہ "وَعَجِبۡتُ لِمَنۡ یُؤۡمِنُ بِالرِّزۡقِ کَیۡفَ یَتۡعَبُ"

کہ تعجب اس آدمی پر ہے جو ایمان بھی رکھتا ہے کہ میرا رزق میرے مقدر کا ضرور ملنا ہے تو پھر ضرورت سے زیادہ جاگ جاگ کر محنت کیوں کرتا ہے؟ اتنی محنت کرے جتنی اس کے لیے کافی ہو جائے، ضرورت سے زیادہ مال کمانے میں پریشان کیوں ہوتا ہے۔

[4]: اور چوتھا جملہ "وَعَجِبۡتُ لِمَنۡ یُؤۡمِنُ بِالۡمَوۡتِ کَیۡفَ یَفۡرَحُ"

آدمی کا ایمان بھی ہے کہ میں مرنا ہے پھر ہر وقت گناہوں میں خوش بھی رہتا ہے، موت پر ایمان رکھنے والا کبھی گناہوں پر خوش نہیں ہوتا بلکہ غمگین رہتا ہے۔

[5]: پانچواں جملہ "وَعَجِبْتُ لِمَنْ يُؤْمِنُ بِالْحِسَابِ كَيْفَ يَغْفُلُ"
آدمی کو یقین ہے کہ میرا حساب ہوگا پھر بھی اعمال سے غافل ہے۔

[6]: چھٹا جملہ "وَعَجِبْتُ لِمَنْ يَعْرِفُ الدُّنْيَا وَتَقَلُّبَهَا بِأَهْلِهَا كَيْفَ يَطْمَئِنُّ إِلَيْهَا"
بندے کو یقین بھی ہے کہ اس دنیا نے بدلنا ہے، پھر بھی دنیا پر مطمئن ہے اور آخرت کو چھوڑا ہوا ہے۔

[7]: اور ساتواں جملہ لکھا ہوا تھا: "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللهِ"
یہ سونے کی تختی ہے، ظاہری نعمتیں بھی ہیں اور باطنی نعمتیں بھی ہیں۔[91]

باپ کی نیکی کا اثر کئی پشتوں تک ہوتا ہے:

اور قرآن کریم میں ہے:

﴿وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا﴾

ان بچوں کا باپ بہت نیک تھا۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ اوپر کی نسل میں سے ساتواں باپ تھا اور ایک مفسر فرماتے ہیں کہ اوپر کی نسل میں یہ دسواں باپ تھا۔ مفسرین نے بڑا عجیب نکتہ لکھا ہے: اگر ماں باپ نیک ہوں تو نیک باپ کا اثر ساتویں اور دسویں پشت تک کم از کم چلتا ہے، والد نیک ہو تو ساتویں پشت تک اللہ ان کو رزق اس باپ کی وجہ سے عطا فرماتے ہیں۔

یہاں مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر والدین عالم یا نیک ہوں اور ان کی

91۔ التفسیر الکبیر للرازی: ج21 ص163، وغیرہ

اولاد اگر نیک نہ بھی ہو اور آپ کو تنگ نہ کرے تو نیک والدین کی اولاد کا احترام پھر بھی کرنا چاہیے۔

حضرت خضر علیہ السلام کے تین جملوں کی تشریح:

حضرت خضر علیہ السلام کے جو تین لفظ فرمائے تھے ان لفظوں پر ذرا غور کرنا!

[۱] : جب کشتی کے باری آئی تو خضر علیہ السلام نے فرمایا:

﴿فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا﴾

کہ میں نے چاہا کہ کشتی کو عیب دار کر دوں تاکہ بادشاہ اس کو چھین نہ سکے۔

[۲] : اور جب بچے کی باری آئی تو فرمایا:

﴿فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا﴾

ہم نے چاہا کہ اس نالائق اور نافرمان بچے کے بجائے اللہ ان کو نیک بچہ دے دیں۔ یہاں کہتے ہیں "ہم نے چاہا کہ اللہ ان کو نیک اولاد دے"

[۳] : اور جب آگے دیوار کی باری آئی تو فرمایا:

﴿فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا﴾

تمہارے رب نے چاہا کہ جب یہ بچے بڑے ہو جائیں تو زمین کے نیچے سے ان کو خزانہ مل جائے۔

اب بتاؤ! حضرت خضر علیہ السلام نے یہ جو تینوں کام کیے ہیں یہ اپنی مرضی سے کیے یا اللہ کے حکم سے؟ (اللہ کے حکم سے کیے۔ سامعین) تو جب کشتی کو توڑا تو پھر یوں کیوں کہا کہ "میں نے چاہا کہ اس کشتی کو عیب دار کر دوں" اور جب بچے کو قتل کیا تو اپنا اور رب دونوں کا ذکر کیا کہ "ہم نے چاہا" اور جب دیوار ٹھیک کی ہے تو فرمایا کہ

''تمہارے رب نے چاہا''

مفسرین نے لکھا ہے کہ شر اور خیر کے خالق اللہ ہیں، بیماری اور صحت کے خالق اللہ ہیں لیکن ادب کا تقاضا یہ ہے جب اچھی چیز ہو تو نسبت خدا کی طرف کرنی چاہیے اور جب اچھی نہ ہو تو نسبت اپنی طرف سے کرنی چاہیے۔

☼ اب جو کشتی کا تختہ توڑا ہے تو بظاہر یہ اچھا کام نہیں تھا تو فرمایا: ﴿فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا﴾ کہ میں نے چاہا کہ تختہ توڑ دوں اور نسبت اللہ کی طرف نہیں کی، نسبت اپنی طرف کی ہے۔

☼ اور جب نابالغ بچے کو قتل کیا تو فرمایا: ﴿فَاَرَدْنَآ﴾ ہم نے چاہا۔ اب دیکھنا اس نابالغ نے قتل ہونا ہے تو بدلے میں ان کو ایک نئی بیٹی ملنی ہے۔ تو دو کام ہو گئے۔ ایک بچے کا قتل ہونا اور ایک ایسی بچی کا پیدا ہونا جس کا بیٹا نبی ہو۔ تو بچے کا قتل کرنا یہ بظاہر اچھا کام نہیں تھا اور بیٹی کا پیدا ہونا اور اس سے نبی کا پیدا ہونا یہ اچھا کام تھا۔ اب اس کی نسبت دونوں طرف سے کی ہے کہ ''ہم نے چاہا'' یعنی میں نے بچہ قتل کر دیا، خدا نے بدلے میں بیٹی دے دی۔

☼ جب دیوار کی باری آئی، اس کو کھڑا کیا تو یہ کام اچھا اور سراپا خیر تھا۔ اب نسبت صرف اللہ کی طرف کی ہے۔ فرمایا: ﴿فَاَرَادَ رَبُّكَ﴾ تمہارا رب چاہتا تھا۔ تو جو سراپا خیر تھا اس کی نسبت اللہ کی طرف کر دی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ادب:

حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِیۡ هُوَ یُطۡعِمُنِیۡ وَیَسۡقِیۡنِ﴾[92]

میرا اللہ مجھے پلاتا بھی ہے، مجھے کھلاتا بھی ہے۔ آگے فرمایا:

﴿وَاِذَا مَرِضۡتُ فَهُوَ یَشۡفِیۡنِ﴾[93]

یہ نہیں فرمایا کہ اللہ مجھے بیمار بھی کرتا ہے اور مجھے صحت بھی دیتا ہے بلکہ فرمایا کہ جب میں بیمار ہوتا ہوں تو اللہ مجھے صحت دے دیتا ہے، حالانکہ صحت بھی اللہ دیتے ہیں اور بیماری بھی اللہ دیتے ہیں لیکن ابراہیم علیہ السلام بیماری کی نسبت اپنی طرف کرتے ہیں اور صحت کی نسبت اللہ کی طرف کرتے ہیں۔ ادب کا تقاضا ہے کہ جو چیز اچھی نہ ہو اس کی نسبت انسان اللہ کی طرف نہ کرے۔ حالات جیسے بھی ہوں خدا کی طرف سے ہیں لیکن جب نعمت ملے تو یہ کہا کریں کہ میرے اللہ نے دی ہے اور جب فاقہ ملے تو کہیں کہ میرے گناہوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ جب اللہ اچھی ہوائیں چلا دے تو اللہ کی طرف سے ہیں، جب سیلاب اور دیگر آفات آ جائیں تو پھر کہیں کہ ہمارے اعمال کی وجہ سے ہیں۔ یہ ادب کا تقاضا ہے۔

خضر علیہ السلام نبی تھے:

صحیح بات تو یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نبی ہیں، ان کے نبی ہونے کی سب سے بڑی دلیل کو ذہن میں رکھیں۔ خضر علیہ السلام کام وہ کرتے ہیں جو بظاہر شریعت کے خلاف ہیں، شریعت کے خلاف کام ولی تو کر نہیں سکتا۔ اب جو بظاہر شریعت کے خلاف ہے تو یہ وحی کی وجہ سے ہو گا کشف کی وجہ نہیں ہو گا اور جس پر وحی آئے وہ نبی ہوتا ہے، ولی نہیں ہوتا۔ لہذا حضرت خضر علیہ السلام نبی تھے۔

92۔ الشعراء 79:26

93۔ الشعراء 80:26

کیا خضر علیہ السلام زندہ ہیں؟

دوسری بحث جس کا تذکرہ کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ چلتی ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا وفات پا چکے ہیں؟ بہت سارے لوگ کہتے ہیں کہ خضر علیہ السلام زندہ ہیں اور بہت سارے کہتے ہیں کہ وفات پا چکے ہیں۔

آپ فیصلہ کن بات ذہن نشین فرمالیں! علماء میں سے جو کہتے ہیں کہ خضر علیہ السلام زندہ ہیں، ان کے دلائل سماعت فرمائیں:

حیاتِ خضر علیہ السلام کے دلائل:

◆ پہلی دلیل یہ ہے کہ مستدرک حاکم میں روایت موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب وفات پا گئے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا مجمع موجود تھا۔ ایک شخص آیا۔ اس کی کچھ ڈاڑھی سیاہ تھی اور کچھ ڈاڑھی سفید تھی۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ مجمع چیرتا ہوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا۔ وہاں پر کچھ کلمات کہے اور واپس چلا گیا۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: اس شخص کو کوئی جانتا ہے؟ تو حضرت ابو بکر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جی ہاں!

هٰذَا أَخُوْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْخَضِرُ عَلَيْهِ السَّلَامُ.[94]

یہ جو بندہ آیا ہے یہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا بھائی حضرت خضر علیہ السلام ہیں۔

◆ دوسری دلیل صحیح مسلم میں روایت موجود ہے کہ جب دجال حملہ کرتا ہوا مدینہ منورہ کے قریب پہنچے گا تو ایک شخص مدینہ منورہ سے آئے گا جو اس وقت کے

94۔ المستدرک علی الصحیحین للحاکم: ج3 ص605 رقم الحدیث 4448

لوگوں میں سے سب سے بہتر ہو گا اور وہ دجال کا مقابلہ کرے گا۔ [95]

تفسیر قرطبی میں ہے کہ ابو اسحاق فرماتے ہیں کہ یہ آدمی حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے۔ [96]

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں۔

◆ تیسری دلیل یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں کہ میری حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی ہے اور انہوں نے مجھے یہ دعا بتائی ہے کہ فرض نماز کے بعد یہ دعا مانگا کریں۔ [97]

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں۔

وفاتِ خضر علیہ السلام کے دلائل:

اور جو علماء کہتے ہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام وفات پا چکے ہیں ان کے بھی دلائل ہیں۔

☼ پہلی دلیل ان کی یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی اور منہ مقتدیوں کی طرف کیا اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو ایک جملہ ارشاد فرمایا:

"أَرَأَيْتَكُمْ لَيْلَتَكُمْ هٰذِهِ؟"

آج کی رات کو دیکھ لیا ہے؟ یعنی اسے ذہن میں رکھو! پھر فرمایا:

فَإِنَّ رَأْسَ مِائَةِ سَنَةٍ مِنْهَا لَا يَبْقٰى مِمَّنْ هُوَ عَلٰى ظَهْرِ الْأَرْضِ أَحَدٌ. [98]

95۔ صحیح مسلم، رقم:2938

96۔ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ج2 ص1932

97۔ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ج2 ص1932

98۔ صحیح البخاری، رقم:116

آج جو لوگ زندہ ہیں تو آج کے سو سال کے بعد ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں ہو گا۔

تو یہ علماء کہتے ہیں کہ اگر حضرت خضر علیہ السلام اس وقت زندہ بھی تھے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتا دیا۔ اس لیے وہ بھی اس رات کے سو سال بعد دنیا سے چلے گئے۔

☼ دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تورات پڑھ رہے تھے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: آپ تورات پڑھ رہے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کی طرف دیکھ نہیں رہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو عرض کرنے لگے:

أَعُوذُ بِاللهِ مِنْ غَضَبِ اللَّهِ وَغَضَبِ رَسُولِهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَضِينَا بِاللهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا.

میں اللہ اور اس کے رسول کی ناراضگی سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ ہم اللہ کے پروردگار ہونے پر، اسلام کے دین حق ہونے پر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے پر ایمان رکھتے ہیں!

اس پر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَوْ بَدَا لَكُمْ مُوسٰى فَاتَّبَعْتُمُوْهُ وَتَرَكْتُمُوْنِي لَضَلَلْتُمْ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ وَلَوْ كَانَ حَيًّا وَأَدْرَكَ نُبُوَّتِي لَاتَّبَعَنِي.[99]

اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں مجھ محمد کی جان ہے، اب اگر

99۔ سنن الدارمی: ج1 ص180 رقم الحدیث 469

موسیٰ علیہ السلام تمہارے سامنے آجائیں اور تم ان کی پیروی کرو اور مجھے چھوڑ دو تو تم سیدھے راستے سے بھٹک جاؤ گے اور اگر آج موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے اور میری نبوت کا زمانہ پالیتے تو وہ بھی میری اتباع کرتے۔

اب یہ حضرات کہتے ہیں کہ خضر علیہ السلام زندہ نہیں۔ اگر زندہ ہوتے تو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے مطابق بات کرتے۔

فیصلہ کن رائے:

دونوں پہلوؤں کے جوابات موجود ہیں۔ میں مکمل بحث نہیں کر رہا۔ میں نے صرف ایک اصولی بات کی ہے۔ بہترین بات یہ ہے کہ حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ جو بہت بڑے جید عالم تھے، اپنی تفسیر تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں کہ حضرت سید احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے حالتِ کشف میں حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کی اور ان سے سوال کیا کہ آپ زندہ ہیں یا وفات پا چکے ہیں؟ تو حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اور حضرت الیاس علیہ السلام دونوں دنیا سے وفات پا چکے ہیں لیکن اللہ نے ہم دونوں کو یہ قدرت اور طاقت عطا کی ہے کہ ہم کسی بھی انسان کی شکل میں آکے کسی بھی انسان کی مدد کر سکتے ہیں۔[100]

یہ مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کا مکاشفہ ہے اور یہ اللہ کا نظام ہے جس میں بندہ دخل نہیں دے سکتا۔ اب جنہوں نے دیکھا ہے وہ بھی ٹھیک ہیں اور جو کہتے ہیں کہ وفات پا گئے ہیں وہ بھی ٹھیک ہیں۔ اب اس سے ثابت ہوا کہ حضرت خضر علیہ السلام نبی بھی ہیں اور زندہ بھی نہیں ہیں، وفات پا چکے ہیں۔ ہاں اللہ نے ان کو طاقت عطا فرمائی

100۔ التفسیر المظہری: ج6 ص62

ہے کہ اگر وہ کسی انسان کی شکل میں متشکل ہو کر آ بھی جائیں اور کوئی بندہ دعویٰ کر بھی دے تو آپ بہت جلدی اس پہ فتویٰ بھی فٹ نہ کریں! ہاں علماء سے ضرور سے پوچھیں کہ یہ بندہ ایسے کہتا ہے، سچ بولتا ہے یا جھوٹ بولتا ہے؟ کیوں؟ اس لیے کہ کوئی بندہ دعویٰ نہ کر دے کہ آج رات مجھے خضر علیہ السلام ملے تھے اور مجھے کہا تھا کہ فلاں کو مار دو اس لیے میں نے اس لیے مار دیا۔ اس پر 302 کا مقدمہ چلے گا، عدالت میں سزائے موت ہو گی اور اس دعویٰ پر اس کی جان نہیں چھوٹے گی۔ ہمارے فتوے اس کے خلاف یہی ہوں گے۔ اللہ رب العزت ہم سب کو شریعت کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

ذوالقرنین کا تذکرہ:

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِى الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۝۸۳﴾

مشرکینِ مکہ نے یہود مدینہ سے پوچھ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تین سوال کیے تھے۔ ان میں ایک سوال یہ تھا کہ وہ کون سا شخص ہے جس نے پوری دنیا پر حکومت کی ہے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ نے وحی کے ذریعے مشرکینِ مکہ کے سوالات کے جواب نازل کیے۔

اللہ رب العزت کا انعام ہے کہ اللہ رب العزت دنیا میں بعض ایسے افراد کو بھیجتے ہیں کہ جو انسان ہونے کے باوجود فرشتہ صفت ہوتے ہیں۔ بعض انسان حضرت آدم کی اولاد میں سے ہی ہوتے ہیں لیکن ان میں صفات فرشتوں والی ہوتی ہیں اور اللہ رب العزت ان کے تقویٰ اور عمل کی وجہ سے انہیں بعض ایسی چیزیں عطا فرما دیتے ہیں جسے ہم مافوق الاسباب یا خرق عادت کہتے ہیں۔

اگر پیغمبر سے صادر ہو تو اس کا نام "معجزہ" ہے اور غیر پیغمبر یعنی کسی ولی سے صادر ہو تو اسے "کرامت" کہتے ہیں۔

پوری دنیا پر حکومت کرنے والے چار اشخاص:

حضرت سکندر ذوالقرنین انہی اشخاص میں سے ایک شخص ہیں۔ مفسرین نے لکھاہے کہ بعض روایات میں آتاہے چار ایسے آدمی گزرے ہیں جنہوں نے پوری دنیا پر حکومت کی ہے۔ ان میں سے دو کافر ہیں اور دو مسلمان ہیں۔ مسلمانوں میں سے پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں اور دوسرے حضرت سکندر ذوالقرنین ہیں اور کافروں میں سے نمرود اور بخت نصر۔ اور ایک شخص ایسا آئے گا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے ہو گا اور وہ پوری دنیا پر حکومت کرے گا، وہ حضرت مہدی ہیں۔

تو حضرت ذو القرنین ان اشخاص میں سے ہیں جنہوں نے پوری دنیا پر حکومت کی ہے۔ جس طرح اللہ رب العزت نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے ہوا کو مسخر کر دیا تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام دور دراز کے سفر ہوا پر کرتے تھے تو حضرت سکندر ذو القرنین کے لیے اللہ نے ابر اور بادل کو مسخر کر دیا تھا۔ یہ لمبے سفر بادل پر کرتے تھے۔ یہ اللہ کا نظام ہے۔ اللہ چاہیں تو ہوا کو مسخر کر دیں یا بادل کو اور آج کے دور میں بات سمجھ نہیں آتی کہ پوری دنیا کا سفر کیسے کیا! اللہ رب العزت نے انہیں سب راستے بتائے تھے کہ کون ساراستہ کس ملک کو جاتاہے اور کون ساراستہ کس ملک کو جاتاہے۔ جو اللہ شہد کی مکھی کو علم دے سکتاہے وہ انسان کو نہیں دے سکتا؟

حضرت ذوالقرنین کو دنیا میں سفر اور فتوحات کے لیے جو اسباب درکار تھے اللہ رب العزت نے وہ سارے اسباب بھی ان کو عطا فرمائے تھے۔ ان کے بارے میں مشرکین نے پوچھا تھا کہ ذو القرنین کون ہے؟ حضرت ذو القرنین نے سب سے پہلے سفر کیاہے مغرب کا اور وہاں تک گئے ہیں جہاں سے سورج غروب ہو تاہے۔ پھر اس کے بعد سفر کیا مشرق کا اور وہاں پر گئے ہیں جہاں سے سورج طلوع ہو تاہے اور اس کے بعد سفر کیاہے شمال کا اور وہاں تک گئے ہیں جہاں سے آگے آبادی نہیں ہے۔

اللہ رب العزت نے انہیں رعب اور طاقت اتنی عطا فرمائی کہ جن کو بھی دعوت دیتے وہ ان کے تابع ہوتے گئے۔ کسی میں بھی ان کی مخالفت کا دم نہیں تھا۔

”ذوالقرنین“ کہنے کی وجہ:

اب ذوالقرنین سے مراد کیا ہے؟ ایک قول ہے علمائے شریعت کا اور ایک قول ہے علمائے طریقت کا۔ شریعت اور طریقت میں تضاد نہیں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جو علماء ظاہری مسائل کا علم رکھتے ہوں انہیں علمائے شریعت کہتے ہیں اور جو علماء مسائل باطنہ کے ماہر ہوں انہیں علمائے طریقت کہتے ہیں۔ تو شریعت بھی دین ہے اور طریقت بھی دین ہے۔ علمائے شریعت کہتے ہیں کہ ”قرن“ کا معنی ہے کنارہ، چونکہ یہ مشرق اور مغرب تک گئے تھے اس لیے انہیں ”ذوالقرنین“ کہتے ہیں کہ دو کناروں والا اور علمائے طریقت کہتے ہیں کہ ان کو اللہ نے ظاہر کا علم بھی دیا تھا اور باطن کا علم بھی دیا تھا۔ اس لیے اس کو دو کناروں والا کہتے ہیں۔ ایک کنارہ ظاہری علوم کا ہے اور ایک کنارہ باطنی علوم کا ہے۔

اس سے پہلے والی آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سفر کا واقعہ ہے اور ان آیات میں سکندر ذوالقرنین کے سفر کا قصہ ہے۔ اللہ نے دونوں کو جوڑا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا سفر کیوں تھا؟ علم کی طلب میں اور سکندر ذوالقرنین کا سفر کیوں ہے؟ اعمالِ شریعت کے نفاذ کی طلب میں۔ تو ایک علوم ہیں اور ایک ان کا نفاذ ہے۔ علوم کا سفر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہے اور نفاذ کا سفر سکندر ذوالقرنین کا ہے۔ معلوم ہوا کہ علمِ شریعت بھی ضروری ہے اور اس کا نفاذ بھی ضروری ہے۔ تو اللہ نے دونوں واقعات کو اکٹھے ذکر فرما دیا ہے۔

جواب بقدرِ سوال ہونا چاہیے:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال پوچھا گیا تھا کہ ذوالقرنین کون ہے؟

قرآن کریم میں ہے کہ میرے پیغمبر آپ انہیں بتائیں:

﴿سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۝﴾

یہاں یہ نہیں فرمایا "سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ ذِكْرًا" کہ میں اس کا ذکر کرتا ہوں، اس کی باتیں بتاتا ہوں بلکہ ﴿مِنْهُ ذِكْرًا﴾ فرمایا۔ "ذِكْرًا" اور "مِنْهُ ذِكْرًا" میں فرق ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں "مِنْ" آتا ہے تبعیض اور بعض کے لیے۔ ایک ہوتا ہے کہ میں نے کھانا کھالیا اور ایک ہوتا ہے کہ میں نے کھانے میں سے کھالیا۔ یہ "میں سے" کا معنی ہے "کچھ"۔ تو اللہ نے یہاں یہ نہیں فرمایا کہ اے محمد! ان کو بتاؤ کہ میں آپ کو ذوالقرنین کی باتیں بتاتا ہوں بلکہ فرمایا: ﴿سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا﴾ میں ان کی ساری باتیں نہیں بتاتا بلکہ ان کی کچھ باتیں بتاتا ہوں یعنی وہ باتیں جو تمہارے متعلق ہیں اور جو تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے وہ میں ہرگز نہیں بتاتا۔ یہ بات آپ ذہن نشین فرمالیں۔

ذوالقرنین کو تمام ضروری اسباب دیے گئے:

﴿اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۝﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ہم نے ذوالقرنین کو زمین میں اقتدار عطا فرمایا تھا اور انہیں ہر کام کے لیے ضروری اسباب بھی دیے تھے۔

اللہ کے عطا کردہ اسباب و وسائل کو استعمال کرتے ہوئے ذوالقرنین مغرب کی طرف نکلے تھے، اتنا آگے گئے کہ ﴿حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ﴾ کہ ان کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کالے کیچڑ والی جگہ پر سورج غروب ہو رہا ہے حالانکہ وہ سورج غروب نہیں ہو رہا تھا بلکہ محسوس ایسے ہوتا تھا اور یہ آخری کنارہ تھا۔

اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۗ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ﴿٨٦﴾﴾

وہاں پر ایک قوم تھی جو کافر تھی۔ اللہ نے اجازت دی کہ آپ چاہیں تو ان کو کفر کی سزا کے طور پر قتل کر دیں اور آپ چاہیں تو قتل کرنے کے بجائے ان کو دعوت دے دیں۔ حضرت سکندر ذوالقرنین نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان کو دعوت دیں گے، جو دینِ ابراہیمی کو قبول کرے گا ہم اس کو معاف کریں گے اور جو دینِ ابراہیمی کو قبول نہیں کرے گا ہم اس کو سزا دیں گے۔

ذوالقرنین نبی تھے یا نہیں؟

یہاں ایک بات سمجھیں! اس مقام پر ہے:

﴿قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے کہا اے ذوالقرنین! تم چاہو تو ان کو سزا دے دو اور تم چاہو تو ان سے نرمی والا معاملہ فرما دو۔

علماء کے درمیان بحث چلی ہے کہ ذوالقرنین نبی تھے یا ولی؟ اب دیکھیں! علماء کتنی دور کی بات سوچتے ہیں کہ نبی تھے یا ولی تھے؟ بعض علما کہتے ہیں کہ ولی تھے دلیل یہ ہے کہ اللہ فرماتے ہیں: ”اے ذوالقرنین! چاہو تو ان کو سزا دے دو اور اگر چاہو تو ان کو معاف کر دو!“ اور یہ خطاب نبی کو ہوتا ہے، غیر نبی کو نہیں ہوتا۔ تو اللہ نے خطاب اس لیے کیا کہ ذوالقرنین نبی تھے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ ذوالقرنین نبی تو نہیں تھے البتہ ولی تھے۔ ابراہیم علیہ السلام کے دور میں انہوں نے مکہ مکرمہ جا کر حج کیا ہے اور ابراہیم علیہ السلام نے

دعائیں دی ہیں۔ یہ ابراہیم علیہ السلام کے صحابی بنے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے بعد انہوں نے دنیا کا سفر شروع کیا ہے اور ان کی دعا کے بعد خدا نے یہ سارے معاملات ان کے سپرد کر دیے ہیں۔[101]

باقی رہی یہ بات کہ اگر نبی نہیں تھے تو پھر اللہ نے خطاب کیسے کیا؟ اس کا علماء نے جواب یہ دیا ہے کہ یہ خطاب ایسے تھا کہ جیسے یوسف علیہ السلام ابھی چھوٹے تھے اور کنویں میں تھے تو اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمۡ بِاَمۡرِهِمۡ هٰذَا﴾[102] کہ ہم نے یوسف پر وحی بھیجی تھی کہ ایک وقت آئے گا کہ تم ان کو بتاؤ گے کہ انہوں نے یہ کام کیا تھا۔ تو یوسف علیہ السلام کے دل میں اللہ نے ایک القاء فرمایا تھا اور اس کا نام اللہ نے وحی رکھ دیا۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ جب پریشان تھیں کہ فرعونی سپاہی اسرائیلی بچوں کو قتل کر رہے ہیں تو میرے بیٹے کا کیا بنے گا؟ تو اللہ فرماتے ہیں:

﴿وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّ مُوۡسٰۤی اَنۡ اَرۡضِعِیۡهِ ۚ فَاِذَا خِفۡتِ عَلَیۡهِ فَاَلۡقِیۡهِ فِی الۡیَمِّ وَ لَا تَخَافِیۡ وَ لَا تَحۡزَنِیۡ ۚ﴾[103]

ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں یہ الہام کر دیا کہ تم اپنے بچے کو دودھ پلاتی رہو، جب تمہیں خوف ہو کہ اس کی جان کو خطرہ ہے تو اس کو صندوق میں ڈال کر سمندر میں ڈال دینا اور ڈرنا نہیں! اب موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نبی تو نہیں ہیں لیکن لفظ "وحی" کا آیا ہے۔

101۔ البدایۃ والنہایۃ: ج2 ص123

102۔ یوسف 15:12

103۔ القصص 7:28

اسی طرح شہد کی مکھی کے بارے میں قرآن کریم میں ہے:

﴿وَ اَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ﴾ [104]

خدا نے شہد کی مکھی کے دل میں خیال ڈالا۔

اب یہاں پر بھی لفظ "وحی" استعمال ہوا ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ یہاں پر وہ خطاب نہیں ہے جو نبیوں کو ہوتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ نبی ان سے خطاب کیا کہ ہماری طرف سے ذوالقرنین کو یہ پیغام دے دو کہ تم کافروں کو قتل کرو یا ان کو قید میں ڈال دو، ہم نے تمہیں اختیار دیا ہے۔

مشرک قوم کے متعلق ذوالقرنین کا موقف:

سکندر ذوالقرنین نے دوسری بات کو اختیار کیا اور اعلان فرمایا کہ:

﴿اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿٨٧﴾﴾

اے اللہ! ان میں سے جس شخص نے ظلم کیا تو ہم اسے سخت سزا دیں گے، پھر اسے اپنے رب کے پاس پہنچا دیا جائے گا اور اللہ اس سے بھی سخت دردناک عذاب دے گا۔

﴿وَ اَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ِۨالْحُسْنٰى ۚ وَ سَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ﴿٨٨﴾﴾

اور جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرے تو اس کو اچھا بدلہ ملے گا یعنی اس کا دنیا میں بھی اجر ہے اور آخرت میں بھی بدلہ ہے۔

طلوع آفتاب کی جگہ پر پہنچنا:

حضرت ذو القرنین اب مغرب سے واپس ہوئے۔ مشرق کی طرف چلے

104۔ النحل 68:16

گئے۔ لمبا سفر کیا اور اتنے دور پہنچے کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿٩٠﴾﴾

حضرت سکندر ذوالقرنین نے دیکھا اور یوں محسوس ہوا کہ سورج یہاں سے طلوع ہو رہا ہے اور ایسی قوم پر سورج طلوع ہو رہا تھا کہ جو بالکل بے پردہ قوم تھی، نہ انہوں نے مکان بنائے تھے نہ انہوں نے کپڑے پہنے تھے، جنگل میں بغیر مکان کے برہنہ رہتے تھے۔ انہوں نے زمین میں اپنے ٹھکانے بنائے ہوئے تھے۔ رات کو ان کے اندر چلے جاتے تھے۔ دن کو کام کرتے تھے۔ بالکل جانوروں کی طرح زندگی گزارتے تھے۔

یاجوج ماجوج کو روکنے کے لیے دیوار کی تعمیر:

جب اس سفر سے فارغ ہوئے تو حضرت سکندر ذوالقرنین نے شمال کی جانب لمبا سفر کیا۔ اب یہاں قرآن کریم نے جو بات کی ہے وہ یہ ہے:

﴿حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿٩٣﴾﴾

کہ ایسی قوم کے پاس پہنچے جو حضرت سکندر ذوالقرنین کی بات کو نہیں سمجھتی تھی، اُن کی زبان اور تھی، اِن کی زبان اور تھی۔ ان سے بات کیسے کریں؟ خیر ترجمان سے یا اشاروں سے بات ہوئی۔ اس قوم نے سکندر ذوالقرنین سے کہا: ہمارا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، اس مسئلے کو حل کریں۔ پوچھا: مسئلہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہاں ایک قوم ہے جنہیں "یاجوج ماجوج" کہتے ہیں، یہ ہمیں بہت تنگ کرتے ہیں، مال کھاتے ہیں، مویشی کھاتے ہیں، ہمیں نقصان پہنچاتے ہیں، ہمیں ان سے بچائیں۔

اب سکندر ذوالقرنین نے کسی طرح ان کو بات سمجھائی کہ ایک یہ پہاڑ ہے اور ایک ادھر پہاڑ ہے، درمیان میں لمبا راستہ ہے، وہ ادھر سے آپ کے پاس آتے ہیں تو میں یہاں آپ اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دیتا ہوں جو بہت لمبی اور چوڑی ہو تاکہ تم بچ جاؤ! انہوں نے کہا کہ آپ بنا دیں، ہم چندہ جمع کر کے آپ کو پیسے دیتے ہیں جتنا ہمارے بس میں ہے۔ حضرت سکندر ذوالقرنین نے فرمایا کہ میں پیسے تم سے نہیں لیتا، ﴿مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ﴾ تم افراد مجھے دو، سامان میرے پاس موجود ہے۔

حضرت سکندر ذوالقرنین نے دیوار کھڑی کی۔ تقریباً تمام مفسرین نے لکھا ہے کہ بطور کرامت اتنی بڑی لمبی دیوار حضرت سکندر ذوالقرنین نے کھڑی کی۔ دیوار کیسے کھڑی کی؟ انہوں نے کہا کہ تم لوہے کے تختے لاؤ، جتنا لوہا تم لا سکتے ہو لاؤ! دونوں پہاڑوں کے درمیان لوہے پر لوہا رکھتے گئے اور ایک لمبی دیوار بنائی۔ اب ادھر بھی لوہا ادھر بھی لوہا اور درمیان میں خالی جگہ۔ اب فرمایا کہ اس میں لکڑی ڈال دو اور اتنی آگ جلاؤ کہ یہ لوہا سخت گرم ہو جائے۔ جب یہ لوہا گرم ہوا تو اس پر پگھلتا ہوا تانبا ڈال دیا۔ اب وہ دیواریں ٹھنڈی ہو گئیں اور ان کی درزیں بند ہو گئیں تو دیوار بہت اونچی، لمبی اور مضبوط بن گئی۔

یہ حضرت سکندر ذوالقرنین کی کرامت ہے۔ کرامت کیوں تھی؟ مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ کرامت اس لیے کہتے ہیں کہ جب اتنی اونچی دیوار آدمی کھڑی کرے اور جب پہاڑیوں کے دو کونوں کے درمیان لوہے کے تختوں کو برابر کر کے رکھ لے اور پھر آگ جلائے تو آپ بتاؤ! جلتی ہوئی آگ کے قریب کوئی نہیں جا سکتا تو اس کو ہلاتے کیسے ہوں گے؟ پھر اتنا تانبے کو اندر ڈالا کیسے ہو گا؟ تو کرامت کے علاوہ اسباب کے تحت یہ کام ممکن نہیں تھا۔

دیوار کی مضبوطی اور شکرِ خداوندی:

آگے قرآن مجید میں ہے:

﴿فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿٩٧﴾﴾

دیوار اتنی بڑی بنادی کہ یاجوج ماجوج چڑھ بھی نہیں سکتے تھے اور اتنی مضبوط بنادی کہ وہ سوراخ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

جب یہ دیوار مکمل ہو گئی تو حضرت سکندر ذو القرنین نے فرمایا: ﴿هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ﴾ یہ میرا کمال نہیں ہے، میرا اللہ کا کرم ہے۔ یہ نیک آدمی کی نشانی ہوتی ہے کہ اتنا بڑا کام ہونے کے باوجود بھی نسبت اپنی طرف نہیں کرتا بلکہ نسبت اپنے خدا کی طرف کرتا ہے۔

دیوار کب ٹوٹے گی؟

جب یہ دیوار بنادی تو اب یہ دیوار ان سے ٹوٹے گی نہیں۔ یہ کب ٹوٹے گی؟ فرمایا: ﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ﴾ جب قیامت قریب آئے گی تو پھر یہ دیوار پھٹ جائے گی۔ ﴿وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا﴾ فرمایا کہ میرے اللہ کا وعدہ ہو کر رہنا ہے۔

قیامت کے قریب یہ دیوار پھٹے گی۔ پھر یاجوج ماجوج وہاں سے نکلیں گے اور زمین میں پھیل جائیں گے۔ بہت تباہی پھیلائیں گے، بعد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اللہ تعالیٰ ان سے اہل زمین کو نجات عطا فرمائیں گے۔ یہ مختصر سا واقعہ میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا۔

سکندر کا کچھ تعارف:

اب آپ دو تین باتیں سمجھیں:

[1]: ہماری تاریخ میں کئی ایک سکندر گزرے ہیں۔ یہ سکندر جن کا ذکر قرآن کریم میں ہے یہ نیک آدمی تھے، نمرود کے دور کے تھے، ابراہیم علیہ السلام کی زیارت کی ہے اور مکہ مکرمہ میں جا کر حج کیا ہے، مشرق اور مغرب کا سفر کیا ہے، شریعت اسلامیہ کا نفاذ کیا ہے، یاجوج ماجوج کے سامنے دیوار کھڑی کی ہے اور کفر کو طاقت کے ساتھ مسلمان کیا ہے، جو مسلمان نہیں تھے ان کو سزا دی ہے۔ یہ وہ باتیں تھیں جو ان کے بارے میں قرآن کریم میں آئی ہیں یا روایات میں آئی ہیں۔ یونان کا مشہور سکندر جسے لوگ سکندر اعظم بھی کہتے ہیں وہ اور تھا۔

یاجوج ماجوج کون ہیں؟

[2]: یاجوج ماجوج کون ہیں؟ میں تفاسیر اور احادیث کا خلاصہ پیش کر رہا ہوں۔ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر جب سیلاب کا عذاب آیا تھا تو پوری دنیا سے انسان ختم ہو گئے۔ اس کے بعد دوبارہ جو نسل چلی ہے وہ حضرت نوح علیہ السلام کی نسل میں سے ہے اور یاجوج ماجوج؛ نوح علیہ السلام کے بیٹے یافث بن نوح کی اولاد میں سے ہیں۔ تو یاجوج ماجوج یہ انسان ہی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ اجساد کے لحاظ سے جانور اور درندوں کی طرح ہیں اور اپنی صفات کے اعتبار سے جنات کی طرح ہیں۔ جیسے جن میں طاقت بہت ہوتی ہے اسی طرح ان میں طاقت بہت ہوتی ہے لیکن یہ ہیں انسانوں میں سے، یہ کوئی الگ مخلوق نہیں ہے۔

دیوار ذوالقرنین:

تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں میں پانچ بڑی بڑی دیواروں کا تذکرہ ہے اور مصنفین نے اپنے خیال اور تخمینہ سے دیوارِ ذوالقرنین کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے لیکن دلیل کسی کے پاس نہیں ہے۔ وہ پانچ دیواریں کون سی ہیں؟

☼ ایک دیوارِ چین ہے جس کی لمبائی کا اندازہ بارہ سو میل سے پندرہ سو میل تک کیا گیا ہے۔

☼ ایک دیوارِ آذربائیجان ہے یہ بہت بڑی دیوار ہے۔

☼ ایک دیوارِ سمرقند ہے۔

☼ ایک دیوار؛ دیوارِ تبت ہے

☼ اور پانچویں دیوار بحیرۂ روم کے مشرقی کنارہ پر ایشیائے کوچک کے جزائر میں سے کسی جزیرہ میں واقع ہے۔

لیکن سکندر ذو القرنین نے جو دیوار بنائی اور جس کا تذکرہ قرآن کریم میں ہے وہ مذکورہ پانچوں دیواروں میں سے کوئی نہیں ہے۔

حضرت مولانا ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ تفسیر معارف القرآن میں لکھتے ہیں کہ نہ ہم اس جگہ کی تعین کر سکتے ہیں اور نہ اس جگہ کا تعین کرنا ہماری شرعی ضرورت ہے۔ دیوار بنائی ہے اور یاجوج ماجوج وہاں بند ہیں اور قیامت کے قریب آکر وہ دیوار کھلے گی اور اللہ ان کو باہر نکالیں گے۔

یاجوج ماجوج کب نکلیں گے؟

حضرت مہدی مدینہ منورہ میں پیدا ہوں گے۔ مکہ مکرمہ میں جا کر اعلان کریں گے۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے اور عیسیٰ علیہ السلام چالیس سال تک اس دنیا میں رہیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں دجال کا ظہور ہو گا اور پھر یہ دنیا میں چالیس دن تک رہے گا لیکن دنوں کی ترتیب یوں ہو گی کہ پہلا دن ایک سال کے برابر، دوسرا دن ایک ماہ کے برابر اور تیسرا دن ایک ہفتے کے برابر اور باقی دن معمول کے دنوں کے برابر ہوں گے اور ان دنوں میں وہ شمال وجنوب، مشرق ومغرب پوری کی پوری دنیا پر پھیل جائے گا۔

دجال کا خروج اور اس کی فتنہ انگیزی:

اور دجال کو اللہ ایسی قوت عطا کریں گے کہ یہ ایک علاقے میں جائے گا اور کہے گا کہ میرا کلمہ پڑھو! ہر کسی سے کہے گا کہ مجھے خدا مانو! جو نہیں مانیں گے وہ جادو کی طاقت سے انہیں ختم کر دے گا۔ گھاس ختم ہو جائے گی، پانی خشک ہو جائے گا اور جو لوگ اس کو مانیں گے وہاں زمین سے خزانے نکلیں گے۔

حدیث میں آتا ہے کہ دجال کے پیچھے خزانے ایسے جائیں گے جیسے شہد کی مکھی اپنے مالک کے پیچھے چلتی ہے۔ اب دیکھیں! کتنا مشکل ہو جائے گا ایسی حالت میں ایمان کی حفاظت کرنا! اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیت المقدس کے قریب ایک جگہ ہے اس کا نام ہے "بابِ لُد" وہاں دجال کو قتل کر دیں گے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جہاں تک نگاہ جائے گی وہاں تک ان کا سانس جائے گا اور جہاں تک ان کا سانس جائے گا وہاں تک کافر مر جائیں گے۔ یعنی جس کافر کو حضرت عیسی علیہ السلام کی سانس لگے گی وہ مر جائے گا۔ اس طرح سارے کافر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں ختم ہو جائیں گے اور دجال بھی قتل ہو جائے گا۔ جو نہی دجال ختم ہو جائے گا تو اس کے متصل بعد ہی یاجوج ماجوج کا خروج ہو گا۔

یاجوج ماجوج کے کچھ احوال:

بعض احادیث میں آتا ہے کہ یاجوج ماجوج روزانہ اس دیوار کو چاٹتے ہیں اور جب اتنی باریک ہو جاتی ہے کہ دوسری جانب نظر آنا شروع ہو جاتا ہے تو پھر کہتے ہیں کہ کل آکر اس کو چاٹیں گے اور جب دوسرے دن آتے ہیں تو دیوار پھر مکمل ہو جاتی ہے، اس طرح یہ روزانہ کرتے رہتے ہیں۔

حدیث پاک میں ہے کہ یہ خالص اللہ کی طرف سے ہے ورنہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یاجوج ماجوج جو محنت کرتے ہیں چوبیس گھنٹے کام کریں، اس طرح کہ سارے

آدمی کام نہ کریں کچھ سوئیں اور کچھ کام کریں۔ کچھ کام کریں اور کچھ سوئیں۔ اچھا! اگر یہ بھی نہ کریں تو پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب خدا نے ان کو اتنی بڑی طاقت دی ہے تو بندے پر بندہ بیٹھ کر وہ دیوار کو پھلانگنے کی ترتیب بنائیں۔ کون سا کام ہے جو نہیں ہو سکتا لیکن ان کا دماغ کام ہی نہیں کر رہا۔

جب اس دیوار میں سوراخ ہونا ہو گا تو حدیث پاک میں ہے کہ جب وہ سونے لگیں گے تو کہیں گے کہ ان شاء اللہ کل آئیں گے۔ اگرچہ یہ مسلمان نہیں بلکہ کافر ہوں گے لیکن ان شاء اللہ کی برکت سے جتنی دیوار چھوڑ کر جائیں گے اگلے دن اتنی باقی ہو گی اور کچھ دیر میں دیوار ختم ہو جائے گی۔ یہ پوری دنیا میں پھیل جائیں گے۔ پھر فوج در فوج یوں ہوں گے کہ جیسے ہر اونچی جگہ سے وہی نکلتے ہیں اور اتنے زیادہ ہوں گے کہ دریا سے گزریں گے تو سارا پانی ختم کر دیں گے۔

یاجوج ماجوج کا فتنہ اتنا بڑا ہو گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں کو لے کر کوہِ طور پر چلے جائیں گے۔ اس فتنے سے بچاؤ بڑا مشکل ہو گا۔ بالآخر حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا سے دعا مانگیں گے: یا اللہ! مسلمانوں کی حفاظت فرما، ان سے ہماری جان بچا! حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا کی برکت سے جتنے بھی یاجوج ماجوج ہوں گے ان کی گردن میں ایک دانہ نکلے گا جس کی وجہ سے سارے مر جائیں گے اور پوری زمین میں بدبو پھیل جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کچھ بھاری بھرکم پرندوں کو بھیجیں گے جن کی گردنیں اونٹ کی گردن کی طرح ہوں گی۔ وہ یاجوج ماجوج کی لاشوں کو اٹھائیں گے اور جہاں اللہ کا حکم ہو گا وہاں گرا دیں گے۔

اس کے بعد بارش ہو گی اور پوری زمین کو اس بدبو سے پاک کیا جائے گا۔ اب پھر بہارِ اسلام شروع ہو گی۔ دنیا میں اس قدر فراوانی ہو گی کہ اللہ تعالیٰ زمین کو حکم فرمائیں گے کہ خزانے کو باہر نکالو! برکتیں ظاہر کر دو! تو برکتیں یوں ظاہر ہوں گی کہ

ایک گائے کا دودھ پورے خاندان کے لیے کافی ہو گا، ایک انار کاٹیں گے تو کھانے کے لیے آدھا کافی ہو جائے گا اور دوسرے آدھے سے چھتری بنائیں گے۔ آخر کار حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا سے چلے جائیں گے۔

آپ علیہ السلام کی وفات کے کافی عرصے بعد آہستہ آہستہ کفر پھیلنے لگے گا۔ جب کفر بہت زیادہ پھیل جائے گا تو حدیث پاک میں آتا ہے کہ ایک ٹھنڈی سی ہوا چلے گی اور اس وقت کے جو مسلمان ہیں اس ہوا سے سارے فوت ہو جائیں گے۔ پھر دنیا میں صرف کفر رہ جائے گا۔ کفر پر خدا نے قیامت برپا کرنی ہے۔ جب ایک انسان بھی اس دنیا پر اللہ اللہ کہنے والا ہو گا تو اس دنیا پر قیامت نہیں آئے گی۔ پھر صور پھونکا جائے گا۔ کب سے فرشتہ کھڑا ہے کہ خدا کا حکم ہو اور میں صور پھونکوں! نہ وہ تھکتا ہے اور نہ وہ اونگھتا ہے۔ جب وہ صور پھونکے گا تو دنیا تباہ ہو جائے گی۔ چالیس سال اسی طرح گزریں گے۔ چالیس سال کے بعد پھر صور پھونکا جائے گا۔ پھر قبروں سے نکالا جائے گا۔ اللہ پاک ہم سب کو یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

سورۃ الکہف کے واقعات میں مناسبت:

سورۃ الکہف میں پہلے واقعہ اصحاف کہف کا تھا، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اور پھر حضرت سکندر ذو القرنین کا۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ نے بڑی عجیب بات لکھی ہے، فرمایا کہ یہ سکندر ذو القرنین اگرچہ بادشاہ تھا لیکن اصحابِ کہف سے زیادہ ولی تھا۔ مشرق اور مغرب کا بادشاہ ہو اس کے باوجود اس میں غرور نہ آئے تو اصل بندہ تو یہ ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ولی تو اصحابِ کہف بھی تھے لیکن بڑا ولی یہ تھا۔ کیوں کہ وہ ولی وہ تھے جو جابر بادشاہ سے چھپے اور غار میں عبادت کی اور یہ ولی وہ تھا جو جابر بادشاہ سے ٹکرایا اور کفر کے خلاف واضح کام کیا ہے۔ تو دونوں نے اپنے ایمان کو بچایا لیکن انھوں نے ایمان کو بچانے کے لیے غار کا رخ کیا اور انھوں نے ایمان کو بچانے

اور دنیا میں دین پھیلانے کے لیے سمندوں کا رخ کیا ہے۔ اللہ ہمیں یہ باتیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

دیوارِ ذوالقرنین میں سوراخ ہو چکا ہے:

آخر میں آپ سے ایک بات عرض کرتا ہوں۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سوئے ہوئے تھے۔ اچانک رات کو اٹھے اور فرمایا:

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَيْلٌ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ

کہ ہلاکت ہو عرب کے لیے ایک ایسے شر سے جو قریب آچکا ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فُتِحَ الْيَوْمَ مِنْ رَدْمِ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مِثْلُ هٰذِهٖ.

یاجوج ماجوج والی جو دیوار ہے اس سے اتنا سوراخ ہو گیا ہے۔

اب یہ کتنا ہے؟ اس حدیث کے جو راوی ہیں حضرت سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے دس کے عدد کی شکل بنا کر دکھائی۔[105]

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی جو روایت ہے کہ "فُتِحَ الْيَوْمَ مِنْ رَدْمِ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مِثْلُ هٰذِهٖ" کہ یاجوج ماجوج والی جو دیوار ہے اس سے اتنا سوراخ ہو گیا ہے۔ اس روایت کے راوی وہیب ہیں، انہوں نے انگلیوں کے اشاروں سے نوے کے عدد کی شکل بنائی۔ "وَعَقَدَ وُهَيْبٌ بِيَدِهٖ تِسْعِينَ"[106]

جس بندے کو عدد معلوم نہیں وہ کہے گا کہ دونوں احادیث میں تعارض ہے اور جس بندہ کو عدد معلوم ہو گا وہ کہے گا کہ تعارض نہیں ہے۔

105۔ صحیح مسلم، رقم:2880

106۔ صحیح مسلم، رقم:2881

میں نے اس پر مستقل ایک فائل تیار کی ہے جس میں انگلیوں کی مدد سے گنتی گننے کا طریقہ لکھا ہے۔ اس طریقے کو "عقد انامل" کہتے ہیں۔ آپ اگر چاہیں تو وہ فائل مرکز اهل السنۃ والجماعۃ سے منگوا لیں۔ آپ یقین فرمائیں کہ ان دس انگلیوں کی مدد سے انسان دس ہزار تک آسانی کے ساتھ گنتی گن سکتا ہے۔

یاجوج ماجوج کی تعداد:

یاجوج ماجوج دنیا میں کتنے ہوں گے؟ حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ رب العزت حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ آپ اپنی اولاد میں سے ان لوگوں کو اٹھایئے جو جہنمی ہیں۔ وہ عرض کریں گے: یا اللہ! جہنمی کون لوگ ہیں؟ اللہ فرمائیں گے ہر ایک ہزار میں سے نو سو ننانوے جہنمی ہیں اور صرف ایک جنتی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب یہ بات سنی تو ڈر گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! ہم میں سے وہ ایک جنتی کون سا ہو گا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پریشان نہ ہو کیونکہ یہ نو سو ننانوے جہنمی تم میں سے ایک اور یاجوج وماجوج میں سے ایک ہزار کی نسبت سے ہوں گے۔[107]

اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ (آمین)

متکلمِ اسلام کی نصیحت:

دو باتیں ذہن میں رکھ لیں: اللہ کے ذکر اور قرآن کریم کی تلاوت کا اہتمام کریں۔ اور اہل الذکر اور علماء کے ساتھ تعلق رکھیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ذکر کی بھی توفیق عطا فرمائے اور اہل الذکر کے ساتھ تعلق کی بھی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

107۔ صحیح البخاری، رقم: 4741

سورۃ مریم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿کٓہٰیٰعٓصٓ ۟ۚ﴿۱﴾ ذِکۡرُ رَحۡمَتِ رَبِّکَ عَبۡدَہٗ زَکَرِیَّا ۚ﴿۲﴾ اِذۡ نَادٰی رَبَّہٗ نِدَآءً
خَفِیًّا ﴿۳﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ وَہَنَ الۡعَظۡمُ مِنِّیۡ وَ اشۡتَعَلَ الرَّاۡسُ شَیۡبًا وَّ لَمۡ اَکُنۡۢ
بِدُعَآئِکَ رَبِّ شَقِیًّا ﴿۴﴾﴾

ہمارے آج کے درس قرآن کا عنوان ہے مضامینِ سورت مریم۔ سورت مریم کے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کا ذکر فرمایا ہے۔ حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کا ذکر ایک تو پارہ نمبر سولہ سورت مریم میں ہے اور ایک پارہ نمبر تین سورت آل عمران میں ہے۔ ان دو جگہوں پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اور اجمال و اختصار کے ساتھ دو اور مقامات پر بھی ذکر فرمایا ہے۔

حضرت مریم کے ذکر سے پہلے یحییٰ اور حضرت زکریا کا تذکرہ کیوں؟

حضرت یحییٰ اور حضرت زکریا علیہما السلام کا ذکر حضرت مریم علیہا السلام کے ذکر سے پہلے کیا ہے، بظاہر آدمی کے ذہن میں آتا ہے کہ سورت کا نام ”سورت مریم“ ہے تو اس میں حضرت مریم کا ذکر ہونا چاہیے تھا۔ اس کی ایک دو وجوہات ذہن نشین فرمالیں:

پہلی وجہ یہ ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام حضرت مریم علیہا السلام کے خالو ہیں، حضرت مریم کی والدہ کا نام حنہ تھا اور حضرت زکریا علیہ السلام کی بیوی کا نام ایشاع یا الیشع تھا۔ یہ دونوں آپس میں بہنیں تھیں۔ تو حضرت مریم کے ذکر سے پہلے حضرت زکریا کا ذکر کیا جائے تو یہ خاندان ہی کا ذکر ہے کسی اور کا ذکر تو نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کا بچپن حضرت زکریا علیہ السلام کی تربیت میں گزرا ہے۔ حضرت زکریا نے پرورش کی ہے حضرت مریم علیہا السلام کی۔ جب حضرت مریم علیہا السلام کا ذکر آئے گا تو میں اس میں تفصیل سے عرض کروں گا۔

حضرت مریم کی والدہ کا نذر ماننا:

یہ آپ کے علم میں ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ امید سے تھیں، انہوں نے منت مانی تھی:

﴿رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ﴾[108]

اے میرے رب! میں نے نذر مانی ہے کہ میرے پیٹ میں جو بچہ ہے میں اس کو ہر کام سے آزاد کر کے تیرے لیے وقف کروں گی۔

میں اس کو تیرا دین سیکھنے کے لیے وقف کر دوں گی لیکن جب ان کے ہاں پیدائش ہوئی تو وہ بیٹا نہیں بلکہ بیٹی تھی تو حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نے بڑی حسرت کے ساتھ کہا: ﴿اِنِّيْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى﴾ کہ میرا خیال تھا کہ بیٹا ہوتا تاکہ تیرے دین کے لیے وقف کرتی، یہ دین کو پڑھتا اور دین کا کام کرتا لیکن میرے ہاں تو بیٹی کی پیدائش ہوئی ہے۔ اللہ رب العزت نے جو ان کو جواب دیا وہ بڑا پیارا ہے۔ فرمایا:

108۔ آل عمران 35:3

﴿وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى﴾ اس آیت کا مطلب سمجھیں، فرمایا کہ جو لڑکا تو نے مانگا تھا وہ کمالات اور برکات میں اس لڑکی کی طرح نہیں ہے جو ہم نے تمہیں دی ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نے لڑکا اپنی حیثیت کے مطابق مانگا تھا اور اللہ نے لڑکی اپنی شان کے مطابق دی ہے۔ اب ان کی سوچ اپنی ہے اور اللہ رب العزت کے فیصلے اپنے ہیں۔

پھر حضرت مریم علیہا السلام کا ذکر قرآن کریم میں اللہ نے کئی بار فرمایا ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام کس قدر عظیم خاتون ہیں کہ جن کے بطن سے اللہ نے بغیر شوہر کے بیٹا عطا فرمایا اور بیٹا بھی نبی ہے اور وہ بھی مادر زاد نبی۔ آپ یہ تو سنتے ہیں کہ فلاں بندہ مادر زاد ولی ہے لیکن یہ بھی سنیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مادر زاد نبی ہیں۔ عام طور پر اللہ کسی بھی بندے کے لیے نبی ہونے کا فیصلہ فرماتے ہیں تو اس کی عمر کے چالیس سال کے بعد اس سے اعلان نبوت کرواتے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بتیس سال کی عمر میں زمین سے آسمان پر بھی چلے گئے تھے تو یہ پیدائشی نبی ہیں، بتاؤ! کس قدر اللہ کا انعام ہے۔

اور تاریخ میں کئی ایسے بچے گزرے ہیں جنہوں نے اس عمر میں گفتگو کی جس میں بچہ بول نہیں سکتا لیکن جس کا تذکرہ اللہ نے قرآن میں کیا ہے اس کا نام حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہے۔ انہوں نے بچپن میں ماں کی گود میں کلام کیا ہے اور بڑے ہو کر بھی کریں گے اور نزول کے بعد جب زمین پر تشریف لائیں گے تو پھر دوبارہ گفتگو فرمائیں گے ان شاء اللہ۔ اگر ہماری زندگی میں اللہ انہیں لے آئے تو دعا کریں کہ اللہ ہمیں ان کا سپاہی بننے کی توفیق عطا فرمائے اور اگر ہماری زندگی میں نہ آئیں تو اپنی اولاد کو یہ وصیت کر کے جائیں کہ حضرت عیسیٰ اور حضرت مہدی آئیں تو بیٹا! آپ نے ان کا ساتھ دینا ہے۔

تو حضرت مریم علیہا السلام کے ذکر سے پہلے حضرت زکریا علیہ السلام کا ذکر اس لیے کیا کہ حضرت مریم حضرت زکریا کی تربیت میں رہی ہیں۔

حضرت مریم کی کفالت کے لیے قرعہ اندازی:

حضرت مریم علیہا السلام پیدا ہوئیں، چلنے کے قابل ہوئیں، سنِ شعور کو پہنچیں تو آپ کی والدہ نے آپ کو لیا اور بیت المقدس جو اس وقت کا مدرسہ تھا، وہاں لے گئیں اور بیت المقدس میں اس زمانے میں تورات پڑھائی جاتی تھی، اس وقت آسمانی کتاب تورات تھی، تورات کو لوگ پڑھتے اور لکھتے تھے، حضرت مریم علیہا السلام کا خاندان دینی و علمی اور معاشرتی شرافت کا حامل خاندان تھا۔ تو حضرت مریم علیہا السلام کو ان کی والدہ لے کر گئیں۔ تو وہاں جو علماء تھے تورات کو سمجھنے والے اور تورات کو جاننے والے ان میں سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ حضرت مریم علیہا السلام اس کی پرورش میں رہیں، اچھے شریف خاندان کی بیٹی ہے، اس بیٹی کی تربیت ہم کریں۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُوْنَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ﴾[109]

اے پیغمبر! آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہیں تھے جب وہ لوگ قرعہ اندازی کے طور پر اپنی قلمیں ڈال رہے تھے کہ مریم کی کفالت کون کرے؟

فیصلہ یہ ہوا کہ قرعہ اندازی کریں اور قرعہ اندازی کا طریقہ بڑا عجیب تھا، طریقہ یہ تھا کہ وہاں قریب ایک دریا گزرتا تھا تو جن قلموں سے تورات کو لکھتے تھے ہر عالم اپنے اپنے قلم کو اس دریا میں ڈالے تو جس کا قلم پانی کی مخالف سمت چل پڑے گا تو وہ مریم کی کفالت کرے گا۔ انہوں نے اپنا اپنا قلم ڈالا تو حضرت مریم کی کفالت کے

109۔ آل عمران 44:3

لیے حضرت زکریا علیہ السلام کا قلم اس طرف چلا جہاں سے پانی آرہا تھا یعنی مخالف سمت پر۔ تو حضرت مریم حضرت زکریا علیہ السلام کی کفالت میں آگئیں۔

بے موسم کے پھلوں کی آمد:

حضرت زکریا علیہ السلام چونکہ اللہ کے نبی تھے، دعوت دینے کے لیے اور امت کو دین سمجھانے کے لیے جایا کرتے تھے۔ بیت المقدس کے محراب میں جو کمرہ تھا وہاں حضرت مریم کو چھوڑ کر دروازہ بند کر کے چلے جاتے تھے اور واپس آکر ان کو سبق پڑھانا ہوتا تھا۔ جب واپس تشریف لاتے تو آپ نے کئی مرتبہ دیکھا کہ حضرت مریم کے پاس بے موسم کے پھل موجود ہیں، موسم نہیں ہے پھل کا لیکن پھل موجود ہے۔ اس کا تذکرہ اللہ نے سورت آل عمران میں کیا ہے:

﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾[110]

وہاں بغیر موسم کے پھل دیکھا تو حضرت مریم علیہا السلام سے کہا کہ اے مریم! یہ پھل کہاں سے آئے؟ انہوں نے جواب دیا:﴿هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ یہ اللہ کی طرف سے ہیں۔

"عند اللہ" قرآنی اصطلاح ہے:

یہاں یہ ضابطہ سمجھ لیں۔ اصل میں اس "عند اللہ" کے لفظ پر کئی گھنٹے چاہئیں تاکہ میں آپ کو کئی عقائد سمجھاؤں۔ اس ایک لفظ کے سمجھنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسان کے کئی عقائد حل ہوتے ہیں۔ صرف ایک لفظ سمجھ لیں۔ حضرت مریم علیہا

110۔ آل عمران 37:3

السلام نے کہا:

﴿هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ﴾

یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

آپ بتائیں! جو کھانا حضرت زکریا علیہ السلام روزانہ دیتے تھے تو وہ کھانا کس کی طرف سے تھا؟ (اللہ کی طرف سے۔ سامعین) تو پھر یہ کیوں کہا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر چیز کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے لیکن ضابطہ یہ ہے کہ جب اللہ کسی چیز میں ظاہری ملکیت انسان کی رکھ دیں تو اس میں نسبت انسان کی طرف ہوتی ہے، اللہ کی طرف نہیں ہوتی، مثال سمجھیں:

یہ گھر اللہ رحمٰن کا اور یہ عبد الرحمٰن کا:

ایک آدمی نے ایک کنال زمین خریدی۔ اس نے اس کنال میں سے پانچ مرلے میں مسجد بنا کر وقف کر دی اور باقی پندرہ مرلے میں اپنا مکان بنا لیا۔ جب یہ دونوں مکان بن جاتے ہیں تو پوچھا جائے کہ یہ مکان کس کا ہے؟ وہ کہے گا: یہ اللہ کا گھر ہے، اور یہ پندرہ مرلے والا مکان کس کا ہے؟ یہ بھائی عبد الرحمٰن کا گھر ہے۔ تو یہ نام بدل کیوں گیا ہے؟ اس لیے کہ یہ جو بھائی عبد الرحمٰن کا گھر ہے اس پر ظاہری ملکیت بھی اس کی ہے جبکہ حقیقی مالک تو اللہ ہیں اور مسجد کے معاملے میں حقیقی مالک بھی اللہ اور ظاہری ملکیت بھی اللہ کی ہے۔ تو جہاں بندے کے اختیارات ختم ہو جاتے ہیں وہاں قرآن کریم میں نسبت آتی ہے "هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ"۔ اگر آپ حضرات کو یاد ہو تو میں کچھ گفتگو اس پر پہلے دوسرے پارے میں کر چکا ہوں۔

تو حضرت مریم علیہا السلام فرمانے لگیں: ﴿هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ بِغَیۡرِ حِسَابٍ﴾ یہ اللہ کی طرف سے ہے، اللہ جس کو چاہے بغیر

حساب کے رزق دیتا ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا:

﴿هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿٣٨﴾﴾[111]

حضرت زکریا علیہ السلام کی عمر بعض روایات کے مطابق ننانوے سال یا اس سے بھی زیادہ تھی اور حضرت زکریا کی بیوی جوانی ہی میں بانجھ تھیں، ان کے ہاں اولاد کی صلاحیت ہی نہیں تھی اور اب تو تھیں ہی بوڑھی۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم کے پاس بے موسم کے پھل کو دیکھا تو سجدے میں گرے اور اللہ سے دعا مانگی: ﴿رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً﴾ اے اللہ! تو اپنی طرف سے مجھے نیک اور پاکیزہ اولاد عطا فرمادے جس طرح بغیر موسم کے آپ مریم کو پھل دے سکتے ہیں تو بغیر موسم کے اللہ مجھے بھی اولاد والا پھل عطا فرمادے۔

ولی کی کرامت دیکھ کر ولی کے خدا سے مانگیں!

اب یہاں ایک بات سمجھیں! حضرت مریم نبی نہیں ہیں بلکہ اللہ کی ولی ہیں، ہم نبی سے معجزہ اور ولی سے کرامت کے قائل ہیں۔ نبی کی نبوت بھی مانتے ہیں اور معجزہ بھی مانتے ہیں، ولی کی ولایت بھی مانتے ہیں اور ولی کی کرامت بھی مانتے ہیں، نہ نبی کا معجزہ نبی کے اختیار میں ہوتا ہے اور نہ ولی کی کرامت ولی کے اختیار میں ہوتی ہے۔ اللہ چاہیں تو نبی کے ہاتھ پر معجزہ ظاہر فرمادیں، چاہیں تو ظاہر نہ فرمائیں، ولی کے ہاتھ پر چاہیں تو کرامت ظاہر فرمادیں اور چاہیں تو کرامت ظاہر نہ کریں۔ حضرت مریم ولی

111۔ آل عمران 38:3

ہیں، نبی نہیں ہیں۔ بے موسم کے پھل ملنا ان کی کرامت ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم کی کرامت کو دیکھا تو کرامت کا انکار نہیں کیا بلکہ کرامت کو مان لیا لیکن مریم کی کرامت کو دیکھ کر مریم سے نہیں مانگا بلکہ مریم کے خدا سے مانگا ہے۔ اب اس سے ہمیں ایک بات سمجھ لینی چاہیے کہ بعض لوگ دنیا میں ولی کی کرامت کو مانتے ہیں اور ولی سے مانگتے ہیں، عیسائی حضرت مریم سے مانگتے ہیں، آپ چرچ میں جاکر دیکھ لیں وہ بی بی مریم سے مانگتے ہیں اور بعض لوگ ولی کی کرامت کو مانتے ہیں اور پھر ولی کے خدا سے مانگتے ہیں، ولی کی کرامت کو مان کر ولی سے مانگنا یہ عیسائیت ہے اور ولی کی کرامت کو مان کر ولی کے خدا سے مانگنا یہ اسلام ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا:

حضرت زکریا علیہ السلام نے ولی کی کرامت کو مانا اور مانگا اللہ سے۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے اللہ سے دعا مانگی ہے، ایک دعا سورت آل عمران میں صرف اتنی ہے: ﴿رَبِّ هَبۡ لِيۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً﴾ کہ اے اللہ! تو مجھے نیک اولاد عطا فرما دے۔ میں پہلے ان کی دعا پر بات کر لوں، دعا کی قبولیت پر بات بعد میں ہو گی۔ پہلے ذرا دعا سمجھ لیں، اور جو دعا سورت مریم میں مانگی ہے اس میں حضرت زکریا علیہ السلام کی تمہید ہے، پہلے انہوں نے اللہ سے باتیں کی ہیں:

﴿اِذۡ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝۳﴾

جب انہوں نے اپنے رب کو چپکے سے پکارا۔

اللہ سے دعا مانگی ہے تو اونچی آواز سے نہیں مانگی بلکہ آہستہ آہستہ دعا کی ہے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ بعض دعائیں ایسی ہوتی ہیں کہ اس کو مانگتے ہوئے انسان کو جھجک محسوس ہوتی ہے، اب زکریا علیہ السلام بوڑھے ہیں، بیوی بانجھ ہے تو دعا بھی مانگ رہے ہیں اور ساتھ چونکہ خود بھی تعجب ہے کہ یہ میں کیسی دعا مانگ رہا ہوں تو دعا میں یہ فرما

رہے ہیں:

﴿رَبِّ اِنِّیۡ وَهَنَ الۡعَظۡمُ مِنِّیۡ وَ اشۡتَعَلَ الرَّاۡسُ شَيۡبًا﴾

اے اللہ! میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں اور میرے سر میں سفیدی چھا گئی ہے، بڑھاپا آ گیا ہے۔

﴿وَّ لَمۡ اَكُنۡۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝۴﴾

اور اے اللہ! میں نے جب بھی آپ سے مانگا تو آپ نے میری دعا کو قبول فرمایا، اب بظاہر جو دعا میں مانگنے لگا ہوں کوئی آثار نہیں ہیں کہ مجھے ایسی چیز ملنی چاہیے لیکن آپ نے ہمیشہ مجھے نوازا ہے۔ میں یہ دعا اس لیے مانگ رہا ہوں کہ:

﴿وَاِنِّیۡ خِفۡتُ الۡمَوَالِیَ مِنۡ وَّرَآءِیۡ﴾

میرے جو رشتہ دار ہیں یہ دینی معاملات میں میرا ساتھ نہیں دیتے، مجھے ڈر ہے کہ میرے جانے کے بعد میری اس دعوت کو اور میرے علم کو میرے رشتہ دار چلا نہیں سکیں گے، مجھے موت کے بعد اس کے ضائع ہونے کا خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔

﴿وَ كَانَتِ امۡرَاَتِیۡ عَاقِرًا فَهَبۡ لِیۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ وَلِيًّا ۝۵ يَّرِثُنِیۡ وَ يَرِثُ مِنۡ اٰلِ يَعۡقُوۡبَ﴾

میری بیوی بانجھ ہے۔ اے اللہ! مجھے کوئی ایسا وارث عطا فرما دیں جو میرا بھی وارث بنے اور یعقوب علیہ السلام کی اولاد کا بھی وارث بنے۔

حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کی جامعیت:

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر بیان القرآن میں بہت پیاری بات لکھی ہے کہ یہ کیوں فرمایا کہ میرا بھی وارث ہو اور آل یعقوب کا بھی وارث ہو۔ فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو دعا مانگنا چاہتے ہیں

کہ اللہ ایک تو جو میرا مخصوص علم ہے یہ بھی اس کے پاس ہوں اور جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی آل کے پاس علم ہے وہ بھی اس کے پاس ہو، اس کو دونوں قسم کے علوم عطا فرمادے۔ تو ایسا کہنا جامعیت کی وجہ سے تھا کہ دونوں علوم کا جامع ہو۔

انبیاء کے مال میں وراثت نہیں چلتی:

اب یہاں پر ایک مسئلہ سمجھ لیں! ہمارا مسلک یہ ہے کہ نبی کے رشتہ دار اور نبی کے خاندان کے لوگ نبی کی وفات کے بعد نبی کے مال کے وارث نہیں ہوتے اور بعض لوگوں کی رائے یہ ہے -جن کا ہم سے تعلق نہیں ہے- کہ پیغمبر کے جانے کے بعد پیغمبر کی اولاد وارث ہوتی ہے۔ دلیل ان کی یہ ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے دعا مانگی ہے کہ اے اللہ! مجھے بیٹا دے جو میرا وارث ہو۔ اگر نبی کا وارث نہیں ہوتا تو زکریا علیہ السلام نے دعا کیوں مانگی ہے؟ تو وہ کہتے ہیں اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کا وارث ہوتا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ نبی کا مالی وارث کوئی نہیں ہوتا اس پر تو بہت سے دلائل موجود ہیں۔ یہاں ایک دو دلیلیں سن لیں کہ وارث کیوں نہیں ہوتا؟ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ دلیل ارشاد فرمائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانے کے بعد یہ بحث چلی کہ پیغمبر کا جو باغ فدک تھا خیبر والا اس کا کیا بنے گا؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گھر کے اخراجات کے لیے جو باغات تھے ان کا وارث کون بنے گا؟ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سنی ہے:

"إِنَّا مَعْشَرَ الْأَنْبِيَاءِ لَا نُوَرَثُ مَا تَرَكْنَا فَهُوَ صَدَقَةٌ." [112]

112۔ المعجم الاوسط للطبرانی: ج3 ص276 رقم الحدیث 4578

فرمایا کہ ہم نبیوں کے گروہ ہیں، ہمارے مال میں کوئی وارث نہیں ہوتا، جو مال نبی چھوڑ کر جائے وہ امت کے لیے صدقہ بن جاتا ہے۔

اور ایک روایت ہے جو صحیح بخاری میں موجود ہے، اگر کوئی شخص آپ کے خلاف پیش کرے تو آپ اس کا جواب بھی ذہن نشین فرمالیں۔ روایت یہ ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئیں کہ باغ فدک اور خیبر کی زمینوں میں ہمارا حصہ ہے، آپ ہمیں دے دیجئے! حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ فاطمہ! اللہ کے نبی تمہارے والد کا ارشاد ہے کہ "لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ" کہ نبی کا کوئی وارث کوئی نہیں ہوتا، نبی جو مال چھوڑ کر جاتا ہے وہ امت کے لیے صدقہ ہوتا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہرا خاموش ہو گئیں حتی کہ ان کا انتقال ہو گیا۔[113]

اس روایت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا؛ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد چھ ماہ زندہ رہیں اور دوبارہ انہوں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے وراثت کا مطالبہ نہیں کیا کیونکہ مسئلہ ان کو سمجھ آ گیا۔

تو جن کا تقاضا تھا انہوں نے چھوڑ دیا کیونکہ مسئلہ ان کو سمجھ میں آ گیا تھا اور جن کا تقاضا نہیں ہے وہ چودہ سو سال ہو گئے ابھی تک لڑ رہے ہیں کہ ابو بکر صدیق نے -العیاذ باللہ- وراثت پر قبضہ کر لیا ہے۔

نبی کے مال میں وراثت نہ چلنے کی وجہ؟

تو پیغمبر کا وارث کوئی نہیں ہوتا، یہ بڑی اہم اور نکتہ کی بات ہے۔ اتنی تو آپ نے حدیث سن لی کہ نبی کا وارث کوئی نہیں ہوتا کیونکہ اللہ کے نبی نے خود فرمایا ہے کہ

113۔ صحیح البخاری، رقم: 6726

ہم نبی ہیں اور ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا ہے لیکن ہوتا کیوں نہیں؟ اس کا بہترین جواب وہی ہے جو قاسم العلوم والخیرات بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہ نے اپنی کتاب "تحذیر الناس" میں دیا ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ پیغمبر کا وارث نہ بننے کی بنیادی وجہ یہ ہے -یہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں لیکن اب صرف یاددہانی کے لیے دوبارہ عرض کر رہا ہوں- کہ موت امتی پر بھی آتی ہے اور موت نبی پر بھی آتی ہے لیکن دونوں کی موت میں فرق ہے۔ موت کا معنی ہوتا ہے "قبض روح"-میں درسِ قرآن سبق کے انداز میں دیتا ہوں تاکہ آپ دلائل کو اچھی طرح سمجھیں اور یاد کریں-اور "قبض" کے دو معنی ہو سکتے ہیں:

1: قبض کا ایک معنی ہے سمٹ جانا اور ایک معنی ہے نکل جانا۔ میں سمجھانے کے لیے کہتا ہوں دیکھیں اس وقت میرے ہاتھ میں کنگھا ہے اور میں نے ہاتھ پھیلایا ہوا ہے، عربی میں کہیں گے: "بَسَطۡتُّ یَدِیۡ" کہ میں نے ہاتھ پھیلا دیا۔ اب میں نے ہاتھ سمیٹ لیا ہے تو عربی میں کہیں گے: "قَبَضۡتُ یَدِیۡ" کہ میں نے ہاتھ سمیٹ لیا ہے۔ اب یہ قبض؛ بسط کے مقابلے میں ہے، قبض کا معنی ہے سمٹ جانا اور بسط کا معنی ہے پھیل جانا۔

2: اور قبض کا ایک معنی ہوتا ہے؛ لے لینا۔ [متکلم اسلام حفظہ اللہ سامعین میں سے ایک شخص کو اپنے پاس بلا کر اس کے سر سے ٹوپی ہاتھ میں لے کر فرماتے ہیں] مثلاً یہ ٹوپی پہلے اِن کے پاس تھی اور اب میرے پاس ہے۔ آپ کہیں گے کہ پہلے ٹوپی اِن کے پاس تھی اور اب ان سے نکل کر مولانا کے پاس آگئی ہے۔ اب قبض کا معنی ہے کہ ایک چیز کا ایک شخص سے نکل کر دوسرے کے پاس چلے جانا، پہلے قبضہ اِن کا تھا اور اب قبضہ میرا ہے۔ تو یہاں قبض کا معنی ہے خروج۔

تو قبض کا ایک معنی ہے؛ حبس یعنی سمٹ جانا اور ایک معنی ہے؛ خروج یعنی

نکل جانا۔

حضرت نانوتوی کی توجیہہ:

مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب امتی پر موت آتی ہے تو اب قبضِ روح کا معنی ہے؛ روح کا نکل جانا، گویا امتی کے وجود سے روح نکل جاتی ہے اور جب نبی پر موت آتی ہے تو اب قبضِ روح کا معنی ہے؛ روح کا سمٹ جانا یعنی نبی کے سر مبارک کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخن مبارک تک تمام جسم سے روح سمٹتی ہوئی قلبِ اطہر میں جمع ہو جاتی ہے۔ تو امت کے لیے قبض بمعنی خروج ہوتا ہے اور نبی کے لیے قبض بمعنی حبس ہے۔

اگلی بات سمجھیں کہ نبی کی وراثت کیوں نہیں چلتی! مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وراثت تو تب چلے گی جب جس کا مال ہو اس کی ملکیت سے نکل جائے، جب اس کی ملکیت سے مال نکلے گا ہی نہیں تو دوسرا شخص اس کا مالک کس طرح بن سکتا ہے؟ تو حضرت فرماتے ہیں کہ مال ملکیت سے اس وقت نکلتا ہے جب موت آجائے اور موت ایسے آئے کہ تمام اجزاء سے روح نکل جائے، نبی کی موت ایسی نہیں ہے کیونکہ یہاں روح جسم کے دیگر اجزاء سے نکلی ہے اور قلب اطہر میں سمٹ گئی ہے، جب پیغمبر کا مال ان کی ملکیت سے نکلا ہی نہیں ہے تو پیغمبر کے ورثاء مال کے مالک کیسے بنیں گے؟ اور ملکیت سے مال نکلنے کے لیے ضروری ہے کہ تمام اجزاء سے روح نکل جائے، یہاں تمام اجزا سے روح نکلی نہیں ہے بلکہ قلب اطہر میں جمع ہو گئی ہے۔ اس لیے نبی کا مال نہ ملکیت سے نکلتا ہے اور نہ ہی رشتہ دار کو ملتا ہے۔

نبی کے قلب میں حیات ہوتی ہے:

اگلی بات آپ ذہن میں رکھیں۔ اس حدیث میں پہلا لفظ ہے "لَا نُوْرَثُ" ہمارا کوئی وارث نہیں بنتا اور دوسرا لفظ ہے "مَا تَرَکْنَا صَدَقَةٌ" جو مال ہم چھوڑ کر جاتے

ہیں وہ امت میں صدقہ بن جاتا ہے۔ بھائی! صدقہ تو تب بنے گا جب مال کا کوئی مالک ہو۔ مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بڑی عجیب بات فرماتے ہیں کہ صدقے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ جس وقت مال صدقہ ہوتا ہے اس وقت صدقہ کرنے والا زندہ ہو، صدقہ کرنے والا زندہ ہو گا تو مال صدقہ ہو گا نا! اگر وہ زندہ نہیں ہو گا تو صدقہ کیسے ہو گا؟ اس لیے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب نبی پر موت آتی ہے تو مال اس کی ملک سے نکلتا نہیں ہے کہ کوئی رشتہ دار وارث بنے، ہاں خود نبی کا مال اللہ کے نبی کے فرمان کے مطابق صدقہ بنتا ہے، تو صدقہ بن جانا اس بات کی دلیل ہے کہ موت آ بھی جاتی ہے اور نبی کے قلبِ اطہر میں حیات بھی ہوتی ہے۔

اگر آپ قلب کی حیات نہیں مانیں گے تو مال صدقہ کیسے ہو گا؟ اس لیے نبی کا مال وراثت میں تبدیل نہیں ہوتا البتہ نبی کا مال صدقہ بن جاتا ہے۔

ہمارے پاس دلائل موجود ہیں:

میں اپنے حضرات سے ایک بات کہتا ہوں کہ آدمی دلائل سنتا رہے اور دلائل سمجھ نہ بھی آئیں لیکن اپنے عقیدے سے پھرتا نہیں ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ ہمارے پاس دلائل ہیں لیکن میں سمجھا نہیں سکتا۔ میں یہ بات اس لیے کہتا ہوں کہ مجھے ایک ساتھی نے ایک مرتبہ ایک جلسے میں یہ چٹ دی کہ مولانا صاحب! آپ اپنے بیان میں بسا اوقات اتنے مشکل دلائل دیتے ہیں کہ لوگ سمجھتے نہیں۔ میں نے کہا: میں بھی سمجھ رہا ہوں کہ یہ دلیل نہیں سمجھ رہے لیکن میں دلیل پھر بھی دیتا ہوں کیونکہ انہیں دلیل سمجھ تو نہیں آئے گی لیکن یہ تو پتا چل جائے گا کہ ہمارے پاس دلائل موجود ہیں۔

آپ نے بینک میں اکاؤنٹ کھلوایا ہے اور اس اکاؤنٹ میں کتنے پیسے ہیں آپ بیٹے کو بتاتے نہیں ہیں اور آپ کے پاس چیک بک پڑی ہے۔ اب بیٹے کو یہ تو پتا ہے کہ باپ کے اکاؤنٹ میں پیسے ہیں لیکن یہ پتا نہیں کہ کتنے ہیں، پیسے ہوں تو بیٹا خوش ہوتا ہے

اگر نہ ہوں تو پریشان ہوتا ہے۔ آپ کہتے ہیں: بیٹا! عید آرہی ہے ہم ان شاء اللہ اس پر اونٹ ذبح کریں گے۔ ابو! پیسے کہاں ہیں؟ میرے اکاؤنٹ میں ہیں۔ کتنے ہیں یہ نہیں بتاتے لیکن بیٹا مطمئن رہتا ہے۔ تو آپ کو پتا ہے کہ آپ کے اکاؤنٹ میں دلائل ہیں تو آپ بھی مطمئن رہتے ہیں۔ اس لیے دلائل دیتے رہنا چاہیے اور آہستہ آہستہ آدمی سنتا رہے... سنتا رہے... ایک وقت آتا ہے کہ دلائل سمجھ میں بھی آجاتے ہیں۔

میرے علم میں -بحمد للہ تعالیٰ- دنیا کے غیر علماء کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے جو مسلسل دلائل سننے کی وجہ سے اپنے عقائد پر دلائل سے گفتگو فرماتے ہیں اور تھوڑی بہت تعداد نہیں ہے چونکہ ہمارے پاس تو ایک نعمت موجود ہے ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم انٹرنیٹ استعمال کریں، سامنے بیٹھ کر دلائل سنتے ہیں، وہ جو انٹرنیٹ پر مسائل دیکھتے ہیں الحمدللہ ان کو بے حد نفع ہوتا ہے۔ اللہ ہمیں بھی ان دلائل کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

وراثت سے مراد وراثت علمی ہے، قرآنی دلیل:

اب ان کی دلیل کا جواب ذہن نشین فرمالیں کہ جو کہتے ہیں حضرت زکریا علیہ السلام نے دعا کی تھی اور کہا تھا کہ اے اللہ! مجھے بیٹا دے جو میرا وارث بنے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وراثت چلتی ہے۔

ہم نے کہا: جب قرآن آدھا پڑھیں تو مسئلہ آدھا ہوتا ہے اور جب قرآن پورا پڑھیں تو مسئلہ بھی پورا ہوتا ہے۔ زکریا علیہ السلام نے صرف یہ نہیں کہا کہ میرا وارث بنے، انہوں نے کہا کہ اے اللہ! میرا وارث بھی بنے اور آل یعقوب کا وارث بھی بنے۔ اگر وراثت سے مراد مال والی وراثت ہو تو بتائیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد تو اِن کی رشتہ دار نہیں ہے، ان کا وارث کیسے بنے گا؟ معلوم ہوا کہ اس وراثت سے مالی وراثت مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد علمی اور دینی وراثت ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کی قبولیت:

زکریا علیہ السلام کی دعا اللہ رب العزت نے قبول فرمالی۔ میں پہلے بتارہا تھا کہ سورت آل عمران میں ہے کہ زکریا علیہ السلام نے دعا مانگی تھی۔ جب دعا مانگی تو:

﴿فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٣٩﴾﴾

جب وہ محراب میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے تو فرشتوں نے انہیں آواز دی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو یحییٰ کی خوشخبری دیتے ہیں، یحییٰ اللہ کے ایک کلمے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کریں گے، ایک امت کے پیشوا ہوں گے، اپنے آپ کو نفسانی خواہشات سے مکمل طور پر روکے ہوئے ہوں گے اور نیک صالح نبی ہوں گے۔

زکریا علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے فرشتوں نے آکر یہ خوشخبری دی کہ اس بیٹے کا نام یحییٰ ہو گا، وہ اللہ کے کلمہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرے گا، سردار اور پیشوا بھی ہو گا، "حَصُوْرًا" وہ عورتوں سے بالکل الگ تھلگ ہو گا۔

حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا ایک قصہ:

حضرت یحییٰ علیہ السلام نے شادی نہیں کی۔ میں آج پڑھ رہا تھا کہ حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام دونوں باہر نکلے چہل قدمی کے لیے۔ چونکہ دونوں رشتہ دار تھے اور بعض روایات کے مطابق دونوں کی عمروں میں صرف چھ ماہ کا فرق ہے، یحییٰ علیہ السلام چھ ماہ بڑے ہیں۔ اور بھی روایات ہیں۔ تو دونوں چل رہے تھے۔ اچانک حضرت یحییٰ علیہ السلام کا کسی گزرتی ہوئی خاتون سے ٹکراؤ سا ہو گیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت یحییٰ علیہ السلام سے فرمانے لگے -وہ دونوں نبی ہیں، دونوں

دوست ہیں، رشتہ دار ہیں، آپس میں باتیں کر رہے ہیں، وہ کہہ سکتے ہیں لیکن ہم یہ بات نہیں کہہ سکتے - انہوں نے کہا کہ یحیٰ! آج تو نے ایسا گناہ کیا کہ تیرا گناہ کبھی بھی معاف نہیں ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ میں نے کون سا گناہ کیا؟ حضرت عیسیٰ نے کہا کہ تیرا عورت سے ٹکراؤ ہو گیا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے کہا کہ اللہ کی قسم! اگر جبرائیل بھی آ جائیں تو میرا اللہ کے عرش سے ہر وقت ایسا تعلق رہتا ہے کہ میرا دل اُدھر بھی نہیں ہٹتا، تو اِدھر کیسے ہٹ جائے گا؟ مجھے تو پتا ہی نہیں ہے کہ کسی عورت کے ساتھ میرا ٹکراؤ ہوا ہے تو میرا گناہ کیسے ہے؟ تو حضرت یحییٰ علیہ السلام اس طرح عورت سے الگ تھلگ تھے کہ چوبیس گھنٹے ان کا قلب اطہر اللہ کے ساتھ تعلق میں لگا رہتا تھا۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی صفات:

حضرت زکریا علیہ السلام کو خوشخبری دی جا رہی ہے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی۔ یہ میں سورت آل عمران سے پڑھ رہا تھا۔ یہاں سورت مریم میں ہے:

﴿يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ِۨ اسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ﴿٧﴾﴾

اے زکریا! ہم تمہیں ایسے لڑکے کی خوشخبری دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہو گا۔ ہم نے ان کا ہم نام بھی ان سے پہلے پیدا نہیں کیا۔

اور ان صفات والا بندہ بھی پہلے پیدا نہیں کیا۔ یہ نام بھی ان کا یکتا ہے اور صفات بھی یکتا ہیں۔ بعض ایسی صفات اللہ تعالی نے ان کو عطا کی تھیں جو ان سے پہلے کسی کو نہیں دی تھیں۔ جب یہ دعا قبول ہو گئی تو اب زکریا علیہ السلام اللہ سے پوچھنے لگے:

﴿رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ﴿٨﴾﴾

اے اللہ! میرے ہاں بیٹا ہو گا کیسے؟ میری بیوی تو بانجھ ہے اور میں انتہائی بوڑھا ہو چکا ہوں کہ میرا جسم سوکھ چکا ہے۔

اب دیکھیں! جب مانگا ہے تو تعجب نہیں ہوا اور جب دعا قبول ہوئی ہے تو اب تعجب ہو رہا ہے کہ کیسے ہو گا؟ اور یہ ذہن میں رکھنا کہ زکریا علیہ السلام کو شک نہیں تھا، شبہ نہیں تھا۔ تو سوال ہوتا ہے کہ پھر یہ کیوں پوچھا کہ کیسے ہو گا؟ اس کی وجہ آگے آ رہی ہے۔ اللہ نے فرشتہ بھیجا، اس نے کہا:

﴿كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَكُ شَيْـًٔا ۝٩﴾

اسی حالت میں ہو گا۔ تمہارے رب نے فرمایا ہے کہ یہ تو میرے لیے آسان ہے، میں نے اس سے پہلے تمہیں پیدا کیا تھا حالانکہ تم اس وقت کچھ بھی نہیں تھے۔

میرے ہاں بیٹا کیسے ہو گا؟

اے زکریا! پہلے آپ کا وجود ہی نہیں تھا، ہم نے آپ کو پیدا کر دیا اور آپ سے بیٹا پیدا کرنا کیا مشکل ہے؟ آپ کچھ نہیں تھے تو ہم نے آپ کو وجود دیا تو آپ سے وجود دینا کیا مشکل ہے؟ تو اللہ نے فرمایا کہ اسی طرح ہو گا۔

﴿كَذٰلِكَ﴾ "اسی طرح ہو گا" اس کا معنی کیا ہے؟ اصل میں زکریا علیہ السلام کے ذہن میں تین کیفیتیں، تین صورتیں تھیں:

[1]: یا اللہ! جو بیٹا مجھے ملے گا تو کیا میں پھر جوان ہو جاؤں گا اور میری بانجھ بیوی ٹھیک ہو جائے گی تب ملے گا؟

[2]: یا مجھے جو بیٹا ملے گا میری بیوی تو بانجھ ہے، کیا میں کوئی اور شادی کروں گا پھر ملے گا؟

[3]: میں بوڑھا ہوں، میری بیوی بانجھ ہے۔ کیا ہمیں بیٹا اسی حالت میں ملے گا؟

مزید اطمینان کے لیے سوال کرنا قابلِ اشکال نہیں:

اب سمجھیں! کہ یہ کوئی اشکال کی بات نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالی سے پوچھا تھا کہ اے اللہ! آپ مجھے دکھا دیں کہ آپ مردے کو زندہ کیسے کرتے ہیں؟ اللہ نے پوچھا: ﴿اَوَ لَمۡ تُؤۡمِنۡ﴾ کیا تجھے یقین نہیں ہے؟ کہا: ﴿بَلٰی﴾ کیوں نہیں، مجھے تو یقین ہے، ﴿وَ لٰکِنۡ لِّیَطۡمَئِنَّ قَلۡبِیۡ﴾ لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرا دل مزید مطمئن ہو جائے۔

آپ سوچیں گے کہ مزید مطمئن ہونے کا معنی کیا ہے؟ میں اس کو سمجھانے کے لیے ایک مثال دیتا ہوں۔ میرا پچھلے ہفتے کراچی میں درس تھا، وہاں پر ابراہیم علیہ السلام کی یہ بات بھی آگئی تو میں نے ان کو ایک مثال دی تھی کہ میرا گھر سرگودھا ہے اور آپ کراچی کے ہیں۔ آپ نے مجھ سے تاریخ لی ہے تو میں نے آپ کو تاریخ دی ہے۔ اب آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ مولانا صاحب! آپ کراچی کیسے آئیں گے؟ میں کہتا ہوں کہ میں نے وقت دے دیا ہے، میں آ جاؤں گا۔ آپ کہیں گے: پھر بھی آپ کیسے آئیں گے؟ آپ بس پر آئیں گے، آپ جہاز پر آئیں گے، ٹرین کے ذریعے آئیں گے، کیسے آئیں گے؟ تو آپ کو یہ تو یقین ہے کہ میں آؤں گا لیکن کیفیت کا پتا نہیں ہے کہ کیسے آؤں گا؟ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعے میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یقین ہے کہ اللہ مردوں کو زندہ کریں گے لیکن چونکہ مردہ کو زندہ کرنے کی کئی کیفیتیں ہو سکتی ہیں اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام پوچھتے ہیں کہ اے اللہ! اس کی کیفیت کیا ہو گی؟ بس میں یہ چاہتا ہوں۔ اب بات سمجھ میں آگئی؟

اب حضرت زکریا علیہ السلام جو سوال کرتے ہیں کہ اے اللہ! میں بوڑھا ہوں میری بیوی بانجھ ہے تو میرے ہاں بیٹا کیسے ہو گا؟ تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کو

کوئی شک تھا بلکہ ان کے سامنے تین کیفیات تھیں؛ ایک... کہ آپ مجھے جوانی دے دیں گے اور میری بانجھ بیوی ٹھیک ہو جائے گی تب ملے گا، دوسری... کہ میں نیا نکاح کروں گا تب ملے گا، تیسری... کہ اسی حالت میں رہیں گے تب ملے گا۔ تو اللہ نے فرمایا: "کَذٰلِکَ" دونوں اسی حالت میں رہو گے اور میں تمہیں بیٹا عطا کروں گا۔

بچے کی امید لگنے کی نشانی:

اب حضرت زکریا علیہ السلام نے اللہ سے دعا مانگی:

﴿رَبِّ اجۡعَلۡ لِّیۡۤ اٰیَۃً ؕ﴾

اے میرے رب! پھر کوئی نشانی بتا دیں۔

دیکھیں! اللہ سے کتنی پیار و محبت کی باتیں ہو رہی ہیں، اب یہ جلدی ہے کہ اللہ کوئی نشانی بتا دیں۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ مثلاً آپ کسی بندے سے کہیں کہ اس سال ہمارا ارادہ ہے حج پر جانے کا، آپ سفارش کریں کہ آپ کے اچھے تعلقات ہیں، ویزہ لگوا دیں۔ وہ بندہ کہتا ہے کہ لگوا دیں گے۔ کل آپ پوچھتے ہیں کہ لگ جائے گا نا؟ تو وہ کہتا ہے: میں جو کہہ دیا ہے نا کہ لگ جائے گا۔ آپ پھر اس سے پوچھتے ہیں: بھائی! پکی بات ہے نا؟ وہ کہتا ہے یار! پکی بات ہے لگ جائے گا۔ آپ پھر کہتے ہیں: اچھا یہ بتاؤ کب تک لگے گا؟ وہ کہتا ہے کہ بھائی آپ حج سے پہلے پہنچ جائیں گے، آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ اب دیکھیں! آپ کو پورا یقین ہے لیکن پھر بھی کہہ رہے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا شوق بڑھ رہا ہے۔ اسی طرح زکریا علیہ السلام کا شوق ابھر رہا تھا تو فرمانے لگے کہ اللہ! کوئی نشانی بتا دیں۔ اللہ رب العزت نے فرمایا کہ اس کی نشانی یہ ہے:

﴿قَالَ اٰیَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا ﴿۱۰﴾﴾

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ بالکل ٹھیک ہیں لیکن آپ تین دن تین راتیں

زبان سے بات نہیں کر سکیں گے، ذکر کرتے رہیں گے، نماز پڑھتے رہیں گے، تورات کی تلاوت کرتے رہیں گے۔ جب آپ پر یہ حالت طاری ہو جائے تو آپ سمجھنا کہ آپ کی بیوی امید سے ہو گئی ہے، بس یہ اس کی علامت ہے۔

قوم کو اشاروں سے تسبیح کی تلقین:

﴿فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا ۝۱۱﴾

اب زکریا علیہ السلام محراب سے نکلے اور لوگوں کو اشارے سے کہا کہ تم صبح شام تسبیح کیا کرو۔ تم بھی ذکر کرو، میں بھی ذکر کرتا ہوں۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ ان کی بیوی امید سے ہیں۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کو خطاب:

جب حضرت یحییٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور سن شعور کو پہنچے تو اللہ تعالی نے یحییٰ علیہ السلام سے فرمایا:

﴿يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ﴾

اے یحییٰ! تورات کو مضبوطی سے پکڑو۔ اس پر عمل کرو اور امت کو عمل کی دعوت دو! یحییٰ علیہ السلام نبی تھے۔ آپ کی دعوت میں پانچ بنیادی باتیں تھیں:

1: اللہ کی عبادت کرو، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔

2: نماز توجہ سے پڑھو، دائیں بائیں دھیان نہ کرو۔

3: روزے کا بہت زیادہ خیال کرو۔

4: صدقات کا بہت اہتمام کرو۔

5: ہر وقت اللہ کا ذکر کرو۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کو عطا کردہ چیزیں

﴿وَاٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا ﴿۱۲﴾ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ؕ وَكَانَ تَقِیًّا ﴿۱۳﴾ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَیْهِ وَلَمْ یَكُنْ جَبَّارًا عَصِیًّا ﴿۱۴﴾ وَسَلٰمٌ عَلَیْهِ یَوْمَ وُلِدَ وَیَوْمَ یَمُوْتُ وَیَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا ﴿۱۵﴾﴾

حضرت یحییٰ علیہ السلام کو اللہ نے کئی چیزیں عطا فرمائیں:

پہلی چیز:... فرمایا کہ ﴿وَاٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا﴾ ہم نے بچپن میں ان کو دانائی اور فہم عطا فرمایا۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں کہ جن کو بچپن میں اللہ دانائی عطا فرمائیں، فہم و فراست عطا فرمائیں۔

دوسری چیز:.... ﴿وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا﴾ کہ ہم نے دل کی نرمی ان کو عطا کی تھی، یہ ہر وقت بہت روتے تھے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے بیٹے حضرت یحییٰ علیہ السلام گھر میں نہیں تھے، تین دن گھر سے باہر رہے، حضرت زکریا علیہ السلام پریشان ہو کر نکلے کہ میرا بیٹا کدھر ہے؟ ایک جگہ پر گئے تو دیکھا کہ حضرت یحییٰ نے قبر کھودی ہوئی ہے اور اس میں لیٹ کر رو رہے ہیں۔ حضرت زکریا نے پوچھا: بیٹا! یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ابو آپ خود ہی کہتے تھے کہ جہنم کا معاملہ بڑا سخت ہے اور قبر کی گھاٹی سے گزر کر جانا ہے، جو یہاں سے پاس ہو گیا تو وہ آگے بھی پاس ہے، اور یہ راستہ آنسو بہائے بغیر طے نہیں ہو سکتا اس لیے تو میں روتا ہوں۔ تو زکریا علیہ السلام بھی رونے لگ گئے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام بہت زیادہ روتے تھے۔ اللہ نے رقت عطا فرمائی تھی۔

تیسری چیز:... ﴿وَزَكٰوةً﴾ اللہ نے اخلاق بڑے صاف ستھرے عطا فرمائے۔

چوتھی چیز:... ﴿وَكَانَ تَقِیًّا﴾ خدا نے تقویٰ بھی عطا فرمایا تھا۔

پانچویں چیز:... ﴿وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ﴾ والدین کے فرماں بردار بہت تھے۔

چھٹی چیز:... ﴿وَ لَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا﴾ نہ مخلوق کو تنگ کرتے اور نہ اللہ کی نافرمانی کرتے تھے۔

حضرت مریم کا تذکرہ کیجیے:

﴿وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۙ﴿۱۶﴾ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۫ فَاَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿۱۷﴾ قَالَتْ اِنِّيْۤ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿۱۸﴾﴾

حضرت مریم علیہا السلام کی عمر تیرہ سال یا پندرہ سال تھی، دونوں قول ملتے ہیں۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام خوبصورت مرد کی شکل میں آئے۔ فرشتہ جب بھی انسان کی شکل میں آتا ہے تو ہمیشہ خوبصورت مرد کی شکل میں آتا ہے۔ تو حضرت مریم نے ان کو دیکھا تو پردے کا اہتمام کیا۔ انہوں نے بتایا کہ میں جبرائیل امین ہوں، اللہ کی طرف سے بچے کی بشارت لے کر آیا ہوں۔ حضرت مریم کے گریبان میں پھونک ماری اس سے ان کو حمل ٹھہر گیا۔

ولادت کے دن جب قریب آئے تو ان کو بتایا گیا کہ فلاں جگہ پر تشریف لے جائیں، وہ ٹیلے کی طرف گئیں تو وہاں پر بغیر موسم کے اللہ نے کھجور پر پھل لگا دیا اور پانی کا چشمہ بھی جاری فرما دیا۔ بچہ کی ولادت کے بعد آپ وہیں پر کھجور کھاتیں اور چشمہ کا پانی پیتیں۔ چالیس دن تک یا جتنے دن نفاس کے تھے وہیں ٹھہری رہیں۔

اس کے بعد واپس اپنے خاندان میں آئیں تو خاندان والوں نے کہا: یہ بچہ کہاں سے آ گیا ہے؟ تمہارا تو نکاح ہی نہیں ہے۔ تو حضرت مریم کو حکم تھا کہ آپ اس بچے کی طرف اشارہ کریں، پھر عیسیٰ علیہ السلام نے صفائی دی کہ میں اللہ کا بندہ ہوں،

مجھے اللہ رب العزت نبی بنائیں گے، مجھے کتاب دیں گے۔ اس طرح ان لوگوں کا سارا بہتان ختم ہو گیا۔

﴿وَ اذۡكُرۡ فِى الۡكِتٰبِ مَرۡيَمَ﴾ اس کتاب میں مریم علیہا السلام کا بھی ذکر فرمائیں، ﴿اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا﴾ اس وقت کا ذکر کریں جب وہ اپنے گھر والوں سے الگ ہو کر مشرق کی طرف واقع ایک جگہ پہ چلی گئیں تھیں، ﴿فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا﴾ پھر انہوں نے اپنے اور لوگوں کے درمیان ایک پردہ لٹکا لیا۔ جس محراب میں آپ عبادت کیا کرتی تھیں اس سے مشرقی جانب آپ تشریف لے گئیں۔ اس لیے عیسائی آج بھی بیت المقدس کی مشرقی جانب کو اپنا قبلہ بنا کر عبادت کیا کرتے ہیں۔

حضرت جبرئیل کی حضرت مریم کے پاس آمد:

﴿فَاَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا﴾

اس وقت ہم نے ان کے پاس اپنی روح یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا جو ان کے سامنے ایک مکمل انسان کی شکل وصورت میں ظاہر ہوا۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام کی ذات نور تھی اور شکل اور ڈھانچا بشر کا تھا۔ آج نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نور اور بشر ہونے پر اہل بدعت یہی بحث چلاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جس طرح جبرائیل امین آئے تھے کہ ذات نور تھی اور شکل و صورت بشر کی تھی اسی طرح اللہ کے نبی ذات کے اعتبار سے نور ہیں اور آپ شکل و صورت کے اعتبار سے بشر ہیں، یہ ان کا عقیدہ ہے۔

جبکہ ہمارا اھل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ذات کے اعتبار سے بشر ہیں اور آپ وصف کے اعتبار سے نور ہیں۔ جہاں آپ کی اور صفتیں ہیں

مثلاً سراجا منیرا ہیں، بشیر ہیں، نذیر ہیں، رحمت ہیں وہاں آپ کی ایک صفت نور بھی ہے۔

متکلمِ اسلام کی ایک بدعتی سے گفتگو:

فیصل آباد جامعہ اسلامیہ امدایہ؛ جلالین والے سال ہم پڑھتے تھے اور عمارت کی چھت پر ہمارا تکرار ہوتا تھا، تو ظاہر ہے کہ تیسری منزل پر چھت ہے، آس پاس کی آوازیں بھی زیادہ آتی ہیں، ہمارے مدرسے کے قریب ایک اہل بدعت کی مسجد تھی تو وہاں مولانا سعید اسد صاحب آئے، وہ جو معروف سعید اسد ہیں وہ نہیں بلکہ کوئی اور تھا۔ اعلان ہوا تو میں تکرار کرا رہا تھا، طلبہ نے کہا چلیں، تو میں نے طلبہ سے کہا: بھائی! آپ کو پتا ہے کہ جامعہ امدادیہ میں کس طرح سختی ہوتی ہے۔ خیر انہوں نے کہا: لازمی جانا چاہیے۔ جب سب کا مشورہ ہو گیا تو میں بھی تیار ہو گیا۔ پھر جب وہاں گئے تو ہم پانچ سات لڑکے ساتھ تھے، تو میں نے پہلے ایک ترتیب بنالی کہ ان کا بیان توجہ سے سنیں۔ جب بیان ختم ہو جائے تو پھر گفتگو کرتے ہیں۔ یہ ہم نے آپس میں مشورہ کر لیا۔ خیر بیان ختم ہوا۔ ان کے مولانا محراب میں بیٹھے۔ ہم قریب ہو گئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے یہ جو کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نور ہیں تو آپ کیا فرمانا چاہتے ہیں کہ آپ کی ذات نور ہے اور آپ لبادۂ بشریت میں آئے ہیں یا آپ کی ذات بشر ہے اور آپ صفت کے اعتبار سے نور ہیں؟ آپ کا عقیدہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ذات اور ماہیت دونوں کے اعتبار سے نور ہیں اور لبادہ بشریت میں آئے ہیں جس طرح جبرائیل امین آئے تھے۔

میں نے کہا: آپ اس پر کوئی دلیل پیش فرمائیں، تو انہوں نے دلیل پڑھی:

﴿قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيۡنٌ ۝١٥﴾ [114]

کہنے لگے: فلاں فلاں مفسر نے لکھا ہے کہ یہاں نور سے مراد رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی ذات ہے۔ میں نے کہا کہ عقیدہ میں کون سی نص پیش کرتے ہیں؟ نص کی تو چار قسمیں ہیں:

1: قطعی الثبوت قطعی الدلالت

2: ظنی الثبوت ظنی الدلالت

3: قطعی الثبوت ظنی الدلالت

4: ظنی الثبوت قطعی الدلالت

"دلالت" کہتے ہیں معنی کو اور "ثبوت" کہتے ہیں اس کے ثابت ہونے کو یعنی الفاظ اللہ کے نبی سے ہم تک قطعیت کے ساتھ پہنچے ہوں اور اس کا معنی متعین ہو کہ یہی معنی ہے، اس کے علاوہ کوئی اور معنی نہیں ہے، یہ ہے قطعی الدالت، اور اگر معنی میں کئی احتمالات ہوں کہ یہ بھی ہے... یہ بھی ہے... اسے کہتے ہیں کہ ظنی الدلالت ہے۔

آپ یہ بات یاد رکھ لیں جو عقیدہ قطعی ہو اور اس کا منکر کافر تو ایسے عقیدہ میں نص وہ پیش کرتے ہیں جو قطعی الثبوت بھی ہو، قطعی الدلالت بھی ہو۔ جب عقیدہ ظنی ہو، اس کا منکر کافر نہ ہو تو پھر دلیل میں قطعیت کی ضرورت نہیں ہوتی، ظنیت سے بھی کام چل جاتا ہے۔

میں نے ان صاحب سے کہا: یہ جو آپ نے آیت پڑھی ہے یہ قطعی الثبوت تو ہے لیکن قطعیت الدلالت نہیں ہے۔ چونکہ علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے روح

114۔ المائدۃ 15:5

المعانی میں تین احتمالات لکھے ہیں کہ یہاں نور سے مراد کیا ہے! اور ضابطہ ہے کہ "إِذَا جَاءَ الِاحْتِمَالُ بَطَلَ الِاسْتِدْلَالُ" تو یہ آیت قطعی الثبوت تو ہے لیکن قطعی الدلالت نہیں۔ آپ ایسی نص پیش کریں جو قطعی الثبوت بھی ہو اور قطعی الدلالت بھی ہو۔ اب ان مولانا صاحب کو احساس ہوا کہ ہم نے چیلنج تو بہت کیے ہیں لیکن اب سامنے بھی طالب علم تگڑا ہے- بندے کو محسوس ہو جاتا ہے- وہ تھوڑا سا گھبرایا۔ مجھے کہنے لگا کہ مولوی اشرف علی تھانوی نے نشر الطیب میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضور کو پیدا کیا ہے اور اس میں لفظ نور آیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے نشر الطیب پڑھی ہے؟ میں نشر الطیب بھی پڑھی ہے اور اس کا حاشیہ بھی پڑھا ہے، حضرت نے لکھا ہے کہ یہاں نور سے مراد روح محمد ہے، ذات محمد مراد ہی نہیں۔ آپ لوگ نشر الطیب کا تو بتاتے ہیں لیکن حاشیہ میں جو تشریح حضرت خود کرتے ہیں وہ کیوں نہیں بتاتے؟ وہ مولانا اٹھ کے کھڑے ہو گئے کہ شرطیں طے کرو، باضابطہ مناظرہ کریں گے۔ میں نے کہا: باضابطہ کیا ہوتا ہے، اب تو بات شروع ہو گئی ہے، آپ شروع کرنے سے پہلے کہتے کہ شرطیں طے کرو، جب بات چل پڑی تب آپ کو یاد آیا.... خیر وہ بات ختم ہو گئی اور وہ اٹھ کر چلا گیا۔

میں آپ سے بھی کہتا ہوں کہ پہلے اپنی تیاری مکمل کرو، پھر بات کرنے کا مزہ آتا ہے، فضول باتیں نہ کرو، فتویٰ بازی نہ کرو، پھڈا نہ ڈالو لیکن تیاری آپ کی مکمل ہونی چاہیے۔

حضرت مریم علیہا السلام کا استعاذہ:

﴿قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿۱۸﴾﴾

حضرت مریم علیہا السلام نے جبرائیل امین کو انسانی شکل میں دیکھا تو آپ نے فرمایا کہ اگر تم اللہ سے ڈرنے والے ہو، متقی ہو تو میں رحمٰن کی پناہ میں آتی ہوں،

میں تم سے بچتی ہوں۔ اب اس جملے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ متقی نہ ہو تو پھر نہ بچیں، متقی ہو تو پھر بچیں، "اِنۡ كُنۡتَ تَقِيًّا" یہ استعاذہ کی شرط ہے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ یہ جو شرط ہے "اِنۡ كُنۡتَ تَقِيًّا" یہ استعاذہ کے مؤثر ہونے کی شرط برائے ترغیب ہے، مطلب یہ کہ تم متقی آدمی ہو، تمہیں تو یہ کام نہیں کرنا چاہیے، تمہیں تو خیال کرنا چاہیے۔ جیسے ہم ایک طالب علم سے کہتے ہیں کہ اگر تم طالب علم ہو تو پھر تمہیں تہجد پڑھنی چاہیے، کیا اس کا یہ معنی ہے کہ اگر طالب العلم نہ ہو تو نہیں پڑھنی چاہیے؟ ہرگز یہ معنی نہیں۔ تو یہ جملہ ترغیب کے لیے ہے کہ اگر تم متقی ہو تو تمہیں خیال کرنا چاہیے، میں اللہ کی پناہ میں آتی ہوں، اور یہ بطور مبالغہ کے ہے کہ اگر عام آدمی ہو تو گناہ اس کو بھی نہیں کرنا چاہیے لیکن تم متقی ہو اور یہ گناہ کرتے ہو، تم بھی نامحرم عورت کے سامنے آتے ہو!

اللہ ہی بیٹا دینے والا ہے:

﴿قَالَ اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوۡلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝١٩﴾

انہوں نے کہا: میں اللہ کی طرف سے رسول ہوں، فرشتہ ہوں، میں تو تمہیں پاکیزہ بیٹا دینے کے لیے آیا ہوں۔ اس پر اشکال یہ ہے کہ جب حضرت جبرائیل بیٹا دے سکتے ہیں تو نبی کیوں نہیں دے سکتا؟ فرشتہ دے سکتا ہے تو پیر کیوں نہیں دے سکتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام خود فرما رہے ہیں "اَنَا رَسُوۡلُ رَبِّكِ" کہ میں تمہارے رب کا نمائندہ ہوں، یعنی اللہ نے مجھے بھیجا ہے کہ میں تمہیں بیٹا دوں، وہ اپنی طرف سے تو نہیں دے رہے بلکہ اللہ نے بھیجا ہے۔

حضرت مریم علیہ السلام کی پریشان حالی:

﴿قَالَتۡ اَنّٰى يَكُوۡنُ لِىۡ غُلٰمٌ وَّلَمۡ يَمۡسَسۡنِىۡ بَشَرٌ وَّلَمۡ اَكُ بَغِيًّا ۝٢٠ قَالَ

كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَ لِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا﴾

حضرت مریم بولیں: میں نے نہ تو نکاح کیا کہ جائز طریقے پر کوئی مرد میرے قریب آیا ہو اور نہ ہی میں بد کردار ہوں تو بچہ کیسے پیدا ہو گا؟ تو انہوں نے کہا: ”كَذٰلِكِ“ اسی طرح ہو گا یعنی بغیر مرد کے ہو گا۔ اللہ فرماتے ہیں یہ تو میرے لیے بہت آسان ہے۔

بچہ کے پیدا ہونے کے چار طریقے ہیں: کبھی مرد اور عورت ملتے ہیں تو بچہ ہوتا ہے جیسا کہ عام طریقہ ہے، کبھی نہ مرد ہوتا ہے نہ عورت لیکن اللہ تعالیٰ پیدا فرما دیتے ہیں جیسے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، کبھی صرف مرد سے پیدا فرماتے ہیں جیسے حضرت حوا کو حضرت آدم سے پیدا کیا اور کبھی صرف عورت سے پیدا فرماتے ہیں جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت مریم سے پیدا کیا۔

﴿وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا﴾

یہ اللہ کا فیصلہ ہے جو ہو کر رہنا ہے۔

بیت اللحم میں آمد:

﴿فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ﴾

حضرت مریم امید کے ساتھ ہو گئیں تو لوگوں سے الگ ایک دور کے مقام پر چلی گئیں۔ اس مقام کا نام بیت اللحم ہے اور یہ بیت المقدس سے آٹھ میل دور ہے، یہ تقریباً تیرہ کلو میٹر بنتے ہیں، آپ وہاں چلی گئیں اور وہاں عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔

﴿قَالَتۡ يٰلَيۡتَنِىۡ مِتُّ قَبۡلَ هٰذَا وَكُنۡتُ نَسۡيًا مَّنۡسِيًّا ﴿٢٣﴾﴾

حضرت مریم علیہا السلام فرمانے لگیں: کاش! میں اس سے پہلے مر جاتی اور میں بھولی بسری ہو جاتی، کسی کو پتا بھی نہ ہو تا کہ مریم نام کی کوئی عورت دنیا میں آئی تھی۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام نے بشارتیں دی ہیں جیسا کہ دوسرے مقام پر ہے کہ آپ کا بیٹا ان ان صفات کا حامل ہو گا، کتاب و حکمت جانتا ہو گا، تورات وانجیل کا علم رکھتا ہو گا، اسے معجزات عطا ہوں گے وغیرہ وغیرہ لیکن اس کے باوجود بھی جب درد نے بہت زیادہ تکلیف دی اور بدنامی کا خوف سوار ہوا تو وہ بشارتیں بھی بھول گئیں اور کہا کہ کاش میں مر جاتی۔

موت کی تمنا کب جائز ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ موت کی تمنا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ حدیث پاک میں ہے کہ تم اللہ سے موت نہ مانگا کرو، اگر موت مانگنی ہی پڑے تو یوں مانگا کرو کہ:

اَللّٰهُمَّ أَحۡيِنِيۡ مَا كَانَتِ الۡحَيَاةُ خَيۡرًا لِيۡ وَتَوَفَّنِيۡ إِذَا كَانَتِ الۡوَفَاةُ خَيۡرًا لِيۡ.[115]

اے اللہ! اگر زندگی میرے حق میں بہتر ہے تو مجھے زندگی دے اور اگر موت میرے حق میں بہتر ہے تو مجھے موت دے دے۔

تو سوال یہ ہے کہ حضرت مریم نے موت کیوں مانگی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بسا اوقات آدمی اپنے حالات سے مغلوب ہو جاتا ہے اور جب مغلوب الحال ہو جائے تو وہ من کل الوجوہ مکلف نہیں رہتا، کچھ احکام اس سے

115۔ صحیح البخاری، رقم:5671

ساقط ہو جاتے ہیں، پھر اگر وہ مغلوب الحال ہو کر کوئی ایسی بات کرتا ہے تو اس کو بطور اعتراض پیش نہیں کرتے۔ دیکھیں! رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر کے موقع پر فرمایا:

اللّٰهُمَّ إِنْ تُهْلِكْ هٰذِهِ الْعِصَابَةَ مِنْ أَهْلِ الْإِسْلَامِ فَلَا تُعْبَدْ فِي الْأَرْضِ أَبَدًا۔[116]

اے اللہ! یہ میری مٹھی بھر جماعت اگر ہلاک ہو گئی تو قیامت تک کوئی تیری عبادت نہیں کرے گا۔

تو کیا اللہ کی عبادت تین سو تیرہ اصحابِ بدر پر موقوف ہے؟ یہ ختم ہو جائیں تو عبادت بھی کوئی نہیں کرے گا؟ دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلبہ حال میں یہ بات ارشاد فرمائی تھی کہ میری پونجی تو یہی ہے، مجھے آپ نے نبی بنا کر بھیجا، میرے ساتھ یہی ہیں، میں بھی ختم ہو گیا اور یہ بھی ختم ہو گئے تو آپ کی عبادت کون کرے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسباب اور حالات کو دیکھ کر یہ بات ارشاد فرمائی۔

تو حضرت مریم علیہا السلام نے بھی غلبہ حال میں یہ بات ارشاد فرمائی کہ کاش! میں مر جاتی، باقی چیزوں کی طرف ان کی توجہ نہیں گئی۔ یا اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مریم علیہا السلام نے یہ سوچ کر فرمایا کہ جب میرا خاوند نہیں ہے، میرے ہاں بچے کی پیدائش ہو اور لوگ طعنہ دیں، مجھے بدنام کریں تو اس وقت انسان کو صبر سے کام لینا چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں بدنامی کے ڈر سے بے صبری ہو جاؤں اور بے صبر ہونا بہت بڑا گناہ ہے اور گناہ سے تو بہتر ہے کہ بندہ مر ہی جائے۔ تو گناہ کے خوف سے موت مانگنا یہ تو کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔

116۔ مسند احمد: ج1 ص259 رقم الحدیث 221

﴿فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ۝ وَ هُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ۝﴾

اور نیچے سے آواز آئی - اس کا معنی یہ ہے کے وہ ٹیلہ پر تھیں - تو فرشتے نے آواز دی کہ غم نہ کرو، دیکھو! تمہارے نیچے چشمہ بھی ہے۔ کھجور کے تنے کو ہلاؤ تو تمہارے پاس تر کھجوریں بھی آئیں گی۔ یوں اس نے بشارت دی۔

یہاں دو چیزوں؛ پانی اور کھجور کا ذکر فرمایا۔ ایک تو اللہ تعالیٰ نے خرقِ عادت وہاں چشمہ جاری فرما دیا کیونکہ وہاں پانی نہیں تھا اور دوسرا وہاں کھجوروں پر پھل نہیں تھا، یہ بھی خرق عادت تھا۔ یہ دونوں چیزیں بطور کرامت کے تھیں۔

انسان کوشش کرے، نتیجہ اللہ دیتے ہیں:

اب یہاں سوال یہ ہے اللہ تعالیٰ پانی دینا چاہتے تو چشمہ کے بغیر ویسے دے دیتے، پھل دینا تھا تو یہ کیوں فرمایا کہ تنے کو حرکت دے دو تو کھجور اترے گی! دراصل یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ حرکت انسان کرتا ہے اور دیتے اللہ ہیں، جس حد تک ممکن ہو اس حد تک محنت کرو، حضرت مریم کیا کر سکتی تھیں! اب جب موسم نہیں ہے تو کھجوریں پیدا تو نہیں کر سکتی تھیں اس لیے فرمایا کہ تم تنے کو ہلاؤ، اللہ تعالیٰ تمہیں کھجوریں دیں گے۔ انسان کو اپنی ہمت کے مطابق اسباب اختیار کرنے چاہیں۔

کھانا پہلے یا پینا پہلے؟

﴿فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا﴾

کھاؤ اور پیو اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرو!

اب یہاں ایک نکتہ سمجھیں! جب فرشتے نے بشارت دی تو پانی کا ذکر پہلے ہے اور کھجور کا بعد میں ہے اور جب کھانے کا حکم دیا تو فرمایا کہ کھاؤ اور پیو! یہاں کھانے کا

حکم پہلے ہے اور پینے کا حکم بعد میں ہے۔ یہ ترتیب کیوں بدلی ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کھانے کا انتظام کرنا ہو تو دستر خوان پر پانی پہلے رکھتے ہیں، کھانا بعد میں رکھتے ہیں اور خصوصاً اگر کھانا ایسا ہو کہ جس کے بعد پیاس لگے تو کھانے سے پہلے پانی کا انتظام کرتے ہیں۔ اللہ نے انہیں کھجوریں دی تھیں تو کھجور کھانے کے بعد پانی کی طلب بڑھ جاتی ہے، اس لیے پانی کا انتظام پہلے کیا ہے۔

دستر خوان لگانے کا طریقہ:

اس لیے میں اپنے طلبہ کو خدمت کرنے کا طریقہ سمجھاتا ہوں کہ جب بھی کھانے کی خدمت ہو تو پہلے دستر خوان لگاؤ، اس کے بعد برتن رکھو، اس کے بعد پانی رکھو اور اس کے بعد کھانا رکھو، پھر روٹیاں رکھو اور چاول اس کے بعد لاؤ کیونکہ چاول جلدی ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ تو جس چیز نے جلدی ٹھنڈا ہونا ہے اس کو بعد میں لاؤ، جس چیز نے دیر تک رہنا ہے اس کو پہلے لاؤ۔ اگر سلاد ہو، رائتہ ہو، دہی ہو تو یہ چیزیں بھی پہلے رکھو۔

دستر خوان کے متعلق چند واقعات:

[۱]: کل صبح ہم ایک جگہ پر تھے۔ جن کے ہاں تھے ماشاء اللہ ان کا ادارہ بہت اچھا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ ہم چائے پییں گے۔ چائے بن گئی۔ تو میں نے کہا کہ بغیر چینی والی دو! انہوں نے کہا کہ جی چائے تو چینی والی ہے۔ میں نے کہا: جب مہمان مانگے تو یہ نہیں کہتے کہ چینی والی ہے بلکہ اس سے پوچھے بغیر چینی والی بنا کر لاتے ہیں، یہ ادب کا تقاضا ہوتا ہے، آپ نے چینی والی بنا لی اور ہمیں بغیر چینی والی چاہیے تو یہ نہ کہیں کہ یہ تو چینی والی بنی ہے، چاہیے تھا کہ کچھ چائے پھیکی بھی لاتے، اگر نہیں ہے تو دوبارہ بنا لیں، جب یہ کہیں گے کہ چینی والی ہے تو مہمان کہے گا کہ بس رہنے دو! تو آپ لوگ ادب بھی سیکھیں، آپ شہر میں رہتے ہیں۔

میرے ساتھ کچھ ساتھی بیٹھے تھے۔ میں نے کہا: چلیں چینی والی چائے ہے تو ان کو پلا دیں۔ ان سے پوچھا کہ آپ میں سے کوئی بغیر چینی کے پیے گا؟ انہوں نے کہا جی ہم میٹھی پیتے ہیں۔ میں نے کہا: چلو یہ ان کو پلا دو۔ تو اس وقت میزبان نے کہا: جی میں نے آپ کے لیے ایک کپ بغیر چینی کے بھی بنائی ہوئی ہے۔ میں نے کہا: پھر پوری بات پہلے کر دو، پوری بات کرنے میں کیا حرج ہے۔ پھر بسکٹ لینے کے لیے لڑکا گیا ہوا تھا اور چائے پہلے آ گئی۔ جب ہم نے چائے پی لی تو بسکٹ بعد میں آئے۔ بھائی خدمت کرنا سیکھو! میں اس لیے سمجھاتا ہوں، طریقہ بتاتا ہوں کہ خدمت کیسے کی جاتی ہے؟ آپ یقین کریں! بسا اوقات دستر خوان کی ترتیب مہمان کو کھینچ لیتی ہے، کھانے کی چیزیں بہت مہنگی نہ ہوں لیکن دستر خوان صاف ہو، برتن صاف ہوں، دال رکھی ہو، اچار رکھا ہو، سلاد رکھا ہو، دہی رکھا ہو، اچھے چمچ رکھے ہوں اور ساتھ پانی رکھا ہو تو دیکھو دستر خوان میں حسن کتنا آتا ہے! انسان کی رغبت بڑھ جاتی ہے کھانے میں۔

[۲]: آج صبح ہمارے اساتذہ کا اجلاس تھا۔ دس بج کر بیس منٹ پر چھٹی ہوئی۔ ہمارا اجلاس دس بج کر بیس منٹ پر شروع ہوا اور دس بج کر تیس منٹ پر ختم ہو گیا اور پینتیس منٹ پر کھانا شروع ہوا تو پچاس پر ختم۔ یعنی تیس منٹ میں اجلاس بھی ہے اور کھانا بھی ہے۔ آپ کسی کو بتائیں گے تو کوئی نہیں مانے گا۔ ہم نے اتنے سے وقت میں اجلاس بھی کیا اور کھانا بھی کھایا۔ اب کھانا باہر کا نہیں تھا، یہی لنگر کی دال تھی، میں نے کہا کہ دال کو تڑکا لگا دو اور دو کلو دہی لاؤ اور اس کی لسی بناؤ، ساتھ سلاد رکھ دو، آپ کھانے کے لیے آئیں گے تو آپ کا جی چاہے گا کہ کھائیں۔ دستر خوان کو دیکھ کر بھوک لگ جاتی ہے۔

ہمارے ہاں کچھ دن پہلے کراچی سے مہمان آئے تھے۔ میں نے ان کو بتایا کہ ہمارے ہاں اجلاس ہوتا ہے دس بجے، تو دس کا معنی دس ہوتا ہے، ہمارے تمام اساتذہ

دس بجے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ان کو میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ فرمار ہے تھے کہ وقت کی پابندی میں آپ کو تو راحت ہوتی ہو گی لیکن باقیوں کو تو تکلیف ہوتی ہو گی۔ میں نے کہا: نہیں، ان کو مجھ سے بھی زیادہ راحت ہوتی ہے کیونکہ مزاج بن گیا ہے۔

نذر نہیں مانی تھی تو یہ کیوں کہا کہ نذر مانی ہے؟

﴿فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّىْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ۝ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۝﴾

فرمایا: جب تم کسی آدمی کو آتا دیکھو تو تم کہنا کہ میں نے اللہ کے لیے روزے کی منت مانی ہے، میں آج کسی سے بات نہیں کروں گی۔ جب حضرت مریم واپس آئیں تو لوگوں نے کہا: اے ہارون کی بہن! تیرا باپ بھی اچھا تھا اور تمہاری ماں بھی بدکردار نہیں تھی، تو ماں باپ نیک ہوں اور پھر اولاد جرم کرے تو لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ نیک باپ کی بیٹی، نیک بھائی کی بہن، اور یہ تو نے کیا کیا؟

حضرت مریم نے کہا: میں نے تو چپ رہنے کی منت مانی ہے، اشارہ کیا کہ میں نہیں بولوں گی، بچے کی طرف اشارہ کیا، پھر وہ بچہ بولا۔

اس پر سوال یہ ہے کہ انہوں نے تو منت مانی نہیں تھی لیکن اللہ فرمارہے ہیں کہ تم کہنا "اِنِّىْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا" اس کا جواب یہ ہے کہ نذر مانی تھی اسی حکم میں خود بخود آ گیا ہے یعنی جب وہ پوچھیں گے تو تم نے کہنا ہے کہ میں نذر مانی تھی یعنی نذر مان لینا اور کہہ دینا کہ میں نے نذر مانی ہوئی ہے۔

پہلی شریعت میں چپ کا روزہ چلتا تھا، اس شریعت میں چپ کا روزہ نہیں ہے بلکہ چپ کو ثواب سمجھنا گناہ ہے۔ ہاں اگر بندہ اس وجہ سے خاموش رہے کہ میں بولوں

گا تو غیبت ہو گی تو بہتر ہے کہ میں چپ رہوں تو پھر کوئی حرج نہیں، پھر خاموش رہنا چاہیے، "مَنْ صَمَتَ نَجَا"[117] حدیث میں بھی ہے کہ جو خاموش رہتا ہے وہ نجات پاتا ہے۔

حضرت مریم کو ہارون کی بہن کہنے کی وجہ:

حضرت مریم کو ہارون کی بہن کیوں کہا گیا؟ اس کی دو وجوہات ہیں:

(1): یا ان کا بھائی تھا جس کا نام ہارون تھا۔

(2): یا آپ حضرت ہارون علیہ السلام کے خاندان میں سے تھیں اور یہ ان میں یہ رواج تھا۔ جیسے عرب کا آدمی ہو تو اس کو "ابو العرب" کہتے ہیں، تمیم کے خاندان کا ہو تو اخو التمیم کہتے ہیں، اسی طرح "اخت ہارون" کہا کہ یہ ہارون علیہ السلام کے خاندان کی عورت ہے۔

یقینی خبر کو ماضی سے تعبیر کر دیتے ہیں:

﴿قَالُوۡا كَيۡفَ نُكَلِّمُ مَنۡ كَانَ فِى الۡمَهۡدِ صَبِيًّا ﴿۲۹﴾﴾

انہوں نے کہا کہ اس بچے سے کیسے بات کریں جو گود میں ہے؟

اب بظاہر یہ سوال ہوتا ہے کہ "كَانَ" فعل ماضی ہے اور ماضی بعید ہوتا ہے تو انہوں نے کیسے کہا کہ ہم اس بچے سے کیسے بات کریں جو بچہ گود میں تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ "كَانَ" ہمیشہ ماضی بعید کے لیے نہیں آتا بلکہ کبھی کبھی حال کے لیے بھی آتا ہے۔

قرآن کریم میں ہے:

117۔ سنن الترمذی، رقم: 2501

﴿اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَ ہُوَ شَہِیۡدٌ ﴿۳۷﴾﴾[118]

اس میں اس شخص کے لیے نصیحت کا سامان ہے جو صاحبِ دل ہو اور متوجہ ہو کر سنتا بھی ہو اور حاضر بھی ہو۔

ایک اور جگہ ہے:

﴿وَ لَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً ؕ وَ سَآءَ سَبِیۡلًا ﴿۳۲﴾﴾[119]

زنا کے قریب نہ جاؤ کیونکہ یہ بے حیائی کا کام ہے اور بہت بر اراستہ ہے۔

تو یہاں تینوں آیات میں "کَانَ" حال کے معنی میں ہے۔ تو "کَانَ" ہمیشہ ماضی کے لیے نہیں آتا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گود میں گفتگو کرنا:

﴿قَالَ اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰہِ ۟ؕ اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیۡ نَبِیًّا ﴿ۙ۳۰﴾ وَّ جَعَلَنِیۡ مُبٰرَکًا اَیۡنَ مَا کُنۡتُ ۪ وَ اَوۡصٰنِیۡ بِالصَّلٰوۃِ وَ الزَّکٰوۃِ مَا دُمۡتُ حَیًّا ﴿۪ۖ۳۱﴾ وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیۡ ۫ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡنِیۡ جَبَّارًا شَقِیًّا ﴿۳۲﴾﴾

تو انہوں نے فرمایا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، مجھے اللہ تعالیٰ کتاب عطا فرمائیں گے، مجھے نبی بنائیں گے اور میں جہاں بھی ہوں گا اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمائیں گے، اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے نماز کا، حکم دیا ہے زکوۃ کا، میں جب تک زندہ رہوں مجھے اپنی ماں کا فرمانبردار بنایا ہے اور مجھے سختی والا نہیں بنایا۔

﴿وَ السَّلٰمُ عَلَیَّ یَوۡمَ وُلِدۡتُّ وَ یَوۡمَ اَمُوۡتُ وَ یَوۡمَ اُبۡعَثُ حَیًّا ﴿۳۳﴾ ذٰلِکَ

118۔ق 37:50

119۔الاسراء 32:17

عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ ﴿٣٤﴾

اور مجھ پر اللہ کی طرف سے سلامتی ہے جس دن میں پیدا ہوا، جس دن مروں گا اور جس دن میں دوبارہ اٹھایا جاؤں گا۔ یہ عیسیٰ بن مریم تھے جنہوں نے بالکل سچی بات کی ہے، یہی وہ حق بات ہے جس کے بارے میں لوگ شک کرتے ہیں۔

کتاب ابھی ملی نہیں تو یہ کیوں فرمایا کہ کتاب ملی ہے؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کتاب دی ہے حالانکہ ابھی کتاب دی نہیں تھی بلکہ کتاب تو ابھی ملنی تھی تو ماضی سے کیوں تعبیر فرمایا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ "ماضی تحقق کے لیے ہے" کیا مطلب کہ جس کام کا مستقبل میں ہونا یقینی ہو اس کو ماضی کے لفظ سے تعبیر کر دیتے ہیں۔

اس کی مثال سمجھیں! آپ میرے پاس آتے ہیں کہ استاذ جی! سردی بہت ہے، ہمارا جی چاہتا ہے کہ کل حلوہ پکے۔ میں کہتا ہوں: پک گیا اور بتاؤ؟ استاذ جی! ہمارا دل چاہتا ہے کہ کل چھٹی ہو۔ میں نے کہا: ہو گئی، اور بتاؤ؟ اب میں یہاں ماضی کا لفظ بول رہا ہوں لیکن یہ عرف ہوتا ہے اور مراد یہ ہوتا ہے کہ مستقبل میں اس کام کا ہونا یقینی ہے۔ یہاں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ" لفظ ماضی کا استعمال کیا ہے لیکن مراد مستقبل ہے کہ مجھے اللہ کتاب دیں گے۔

آپ کی تعبیرات کے کیا کہنے!

میں کل ایک جگہ لاہور میں تھا۔ بعض علماء مجھے ملے تو انہوں نے مجھے کہا: مولانا! ہم نے تفاسیر بہت پڑھی ہیں لیکن یہ جو آپ دروس القران میں تفسیر کرتے ہیں مثال کے ساتھ بس یہ مثال آپ کے پاس ہے، اس سے بات ایسے کھلتی ہے کہ قرآن کو سمجھنے میں الجھن نہیں ہوتی۔ تو آپ کا درسِ قرآن کب مکمل ہو گا؟ ایک جلد کے بعد

اتنے تقاضے دنیا سے ہو رہے ہیں کہ آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہے! میں نے ان سے کہا کہ ان شاء اللہ جلد مکمل ہو جائے گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نماز و زکوٰۃ کا حکم:

فرمایا: ﴿وَ اَوۡصٰنِیۡ بِالصَّلٰوۃِ وَ الزَّکٰوۃِ﴾ مجھے اللہ نے حکم دیا ہے کہ میں نماز پڑھوں اور زکوٰۃ دوں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس زندگی بھر میں کبھی اتنا پیسہ جمع نہیں ہوا کہ وہ زکوٰۃ دیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی برتن نہیں رکھے بلکہ آپ چلو سے پانی پیتے رہے، کبھی آپ نے مکان بھی نہیں بنایا، بس جہاں رات آئی تو وہاں سو جاتے تھے۔ تو انہیں زکوۃ کا حکم کیسے دیا؟ اصل بات یہ ہے کہ زکوۃ کا حکم ہونا الگ ہے کہ اللہ نے ہم پر زکوٰۃ کو فرض قرار دیا لیکن دیں گے تب جب پیسہ ہو گا۔ اللہ نے حج فرض قرار دیا ہے لیکن کب؟ جب استطاعت ہو گی۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام فرمارہے ہیں کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں نماز بھی پڑھوں اور زکوٰۃ بھی دوں، کیا مطلب کہ اگر میرے پاس پیسہ ہو تو زکوٰۃ دوں! یہ ایسا معنی ہے کہ اس میں تاویلات نہیں کرنی پڑتیں۔

﴿وَ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیۡ﴾ میں اپنی والدہ کا فرنبردار ہوں گا۔ ظاہر ہے کہ والد تو تھے نہیں اس لیے صرف والدہ کا ذکر فرمایا۔

منکرین حیات النبی کے استدلال کا جواب:

﴿وَ السَّلٰمُ عَلَیَّ یَوۡمَ وُلِدۡتُّ وَ یَوۡمَ اَمُوۡتُ وَ یَوۡمَ اُبۡعَثُ حَیًّا ﴿۳۳﴾﴾

بعض لوگوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ نہیں ہیں۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمارہے ہیں کہ مجھ پر سلامتی ہو جس دن میں پیدا ہوا، جس دن مجھ پر موت آئی اور جس دن میں زندہ

کیا جاؤں گا۔ موت کے بعد حشر کو مَیں زندہ کیا جاؤں گا۔ یہاں درمیان میں قبر والی حیات کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی قبر میں زندہ نہیں ہیں۔

جبکہ ہم اھل السنۃ والجماعۃ احناف دیوبند کا عقیدہ ہے کہ انبیا علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ ہم نے کہا: یہ بات وہ کرتا ہے جس کو نحو نہیں آتی، نحو آتی تو اتنی حماقت و غلطی کبھی نہ کرتا۔ نحو کا ضابطہ ہے کہ حال اور ذوالحال کا زمانہ ایک ہوتا ہے۔ جیسے آپ کہتے ہیں کہ ہمارے استاذ جی آئے ہیں اور آپ کو ملنا چاہتے ہیں۔ کب آئے ہیں؟ آپ کہتے ہیں: آٹھ بجے۔ کس چیز پر آئے ہیں؟ جی اپنی گاڑی پر آئے ہیں۔ آپ کہتے ہیں: ”جَاءَنِیْ اُسْتَاذِیْ رَاکِبًا عَلٰی سَیَّارَتِہٖ“ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آئے ہیں تو گاڑی پر سوار تھے۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ گھر سے چلے تھے تو پیدل تھے اور جب گیٹ سے داخل ہوئے تو گاڑی پر بیٹھ گئے بلکہ جب آئے ہیں تو گاڑی پر سوار تھے، اس سے پہلے گاڑی پر تھے یا نہیں تو وہ ہمارے عرف سے ثابت ہوتا ہے کہ گاڑی پر ہی سوار تھے، لغت اس پر خاموش ہو جاتی ہے۔

تو اس سے تو اتنا ثابت ہو رہا ہے کہ جب میں کھڑا ہوں گا تو زندہ ہوں گا۔ یہ نہیں کہ کھڑا ہونے سے پہلے میں مردہ ہوں گا۔ بعثت اور حیات اکٹھی ہوں گی، تو اس سے تو قبر کی حیات کا ثبوت مل رہا ہے۔

﴿وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۳۶﴾﴾

اللہ تعالیٰ میرا اور تم سب کا رب ہے، اسی کی عبادت کرو، یہی صراط مستقیم ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ:

﴿وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ اِبْرٰهِیْمَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا ﴿۴۱﴾﴾

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں اور

دوسرے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں۔ آپ کی ایک بیوی کا نام سارہ ہے اور دوسری بیوی کا نام ہاجرہ ہے۔ تو ہماری گفتگو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات تک رہے گی، حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام کا تذکرہ ان شاء اللہ آئندہ ہو گا۔ ویسے تو جب آدمی قرآنی آیات پر گفتگو کرے تو ایک ایک آیت پر کتنی تفصیل سے گفتگو کی جاسکتی ہے آپ سنتے ہیں آپ کو اس کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ ہم خلاصہ بیان کرتے ہوئے تھوڑا تھوڑا کر کے درس آگے چلا رہے ہیں تاکہ خلاصہ اور ضروری مضامین آپ کے سامنے آجائیں۔ اس سے پھر بات مکمل ہوتی ہے۔

میرا پچھلے مہینے عرب امارات، کینیا، ملائیشیا کا سفر تھا۔ گفتگو ہوئی تو ان حضرات کو احساس ہوا کہ ایک آیت، ایک حدیث اور ایک عقیدہ کو سمجھنے کے لیے کتنا وقت درکار ہوتا ہے۔ ہمارا ایک جگہ سبق تھا صبح نو سے بارہ بجے تک اور پھر ظہر سے عصر اور پھر مغرب سے عشاء۔ تو انہوں نے ایک مجلس میں مجھے کہا کہ مولانا صاحب! ہماری خواہش ہے کہ کسی عقیدہ پر کوئی ایک دلیل پیش فرمادیں۔ تو میں نے عشاء کے بعد ایک حدیث "اَلْأَنْبِيَاءُ أَحْيَاءٌ فِي قُبُوْرِهِمْ يُصَلُّوْنَ"[120] پر جب بات شروع کی تو رات کے ساڑھے دس بج گئے۔ میں نے کہا کہ آگے شروع کریں یا بس کریں؟ کہنے لگ: بس کریں، باقی اگلے سفر میں۔ تو ایک حدیث پر دو گھنٹے لگے ہیں۔

میں تھوڑے تھوڑے اشارے کرتا ہوں ورنہ بہت تفصیل سے گفتگو کی جا سکتی ہے۔ ہم آپ کے وقت کا بھی خیال کرتے ہیں اور اس بات کا بھی خیال کرتے ہیں کہ ضروری ضروری مضامین بھی ہمارے سامنے آتے رہیں۔

بیان ریکارڈ کرنے کی اہمیت:

120۔ مسند ابی یعلی الموصلی: ص658 رقم الحدیث 3425

آج چونکہ رائیونڈ کا اجتماع بھی شروع ہے۔ اللہ اس کو مبارک فرمائے، اس کو امت کے لیے ہدایت کا ذریعہ بنائے، شرور اور فتن سے محفوظ فرمائے۔ ہمارے بہت سارے ساتھی وہاں پر تشریف لے گئے ہیں اور ہم نے بھی کل جانا ہے ان شاء اللہ، دعا کے بعد واپس آئیں گے تو بعض حضرات کا خیال تھا کہ شاید یہ درس مؤخر ہو۔ میں نے کہا کہ بھائی درس مؤخر نہیں ہو گا، سارے ساتھی تو اجتماع پر بھی نہیں جاتے، کچھ رہ بھی جاتے ہیں اور جو جاتے ہیں اگر وہ واقعتاً درس سننے کا شوق رکھتے ہوں تو ہمارا درس ریکارڈ ہوتا ہے تو وہ سن لیں گے اور وہ ریکارڈنگ نہ مانگیں تو آپ سمجھیں کہ وقت پورا کرتے ہیں، سننے کا شوق نہیں رکھتے، جن کو سننے کا شوق ہو تو ہمارا تو ہر درس ریکارڈ ہوتا ہے، وہ بعد میں سن لیا کریں۔

میں اس سفر میں عجیب باتیں دیکھتا رہا، شاید آپ کو میری بات پر کسی حد تک یقین آئے۔ میں نے اس دفعہ باہر کے سفروں میں بعض ایسے حضرات کو دیکھا ہے کہ میرے خیال میں میری نجی مجلس کی گفتگو جو میں نے کی ہے اور اس کی آڈیو ریکارڈنگ ہوئی ہے اور وہ نیٹ پر بھی گئی ہے تو شاید کوئی بھی ایسی گفتگو نہیں ہے جو انہوں نے نہ سنی ہو، بیانات تو بہت دور کی بات ہیں، اور بعضوں نے تو ایک ایک بیان کو سو سو بار سنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مولانا صاحب! ہم خلوت میں آپ کے بیانات سنتے رہتے ہیں اور پھر کیسٹ بند کر کے روتے ہیں، پھر سنتے ہیں پھر روتے ہیں اور ہم پاکستان والوں پر حیران ہوتے ہیں کہ آپ جیسا بندہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حوالے کیا ہوا ہے!

آپ واقعی نرم آدمی ہیں!

ہمارے ہاں جیسے بہت مشہور ہے کہ مولانا گھمن صاحب بہت سخت ہیں، لہجہ بڑا سخت ہے، مجھے اس سفر میں شافعی المسلک اور ملائیشیاء کے دو علماء اکٹھے ملے۔ ایک عجیب بات کی۔ دنیا میں جو قومیں نرم شمار ہوتی ہیں ان میں شاید ملائیشیاء والے ایک نمبر

پر ہوں، یہ بہت نرم لوگ ہیں، مزاج نرم ہے، آپ لوگ چائے گرم پیتے ہیں اور وہ چائے ٹھنڈی پیتے ہیں، اتنی ٹھنڈی پیتے ہیں کہ بسا اوقات تو برف ڈال دیتے ہیں، ہوٹل سے چائے لیں گے اور پلاسٹک میں بند کریں گے، موٹر سائیکل پر رکھیں گے اور گھر جاکر پییں گے۔ اب بتاؤ! وہ کیسی چائے ہو گی؟! ہر دستر خوان پر جیسے کھانے کے لیے پلیٹ رکھتے ہیں اس طرح وہ چائے بھی رکھتے ہیں، تو جو قوم اتنی ٹھنڈی چائے پیتی ہو وہ کتنی نرم مزاج ہو گی؟

مجھے ان علما نے کہا کہ ہمیں ایک بات پر تعجب ہے کہ مشہور یہ ہے کہ آپ بہت سخت ہیں اور آپ کے میز بان ملائشیا کے لوگ ہیں جن سے زیادہ نرم ہی کوئی نہیں۔ تو اس دعویٰ کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا کافی ہے کہ ملائشیا کے لوگ آپ کو شوق سے سنتے ہیں حالانکہ یہ سخت بندے کو بالکل نہیں سنتے۔ ملائشیا میں ایک ٹی وی ہے IKIM، انہوں نے مجھے بلایا اور جو بیان آپ نہیں سن سکتے انہوں نے کہا کہ جی مولانا صاحب! ہمارے ٹی وی پر عقیدہ اھل السنۃ کے نام سے بیان کریں! ہم اہل حدیث اور اہل قرآن نہیں بلکہ خود کو اھل السنۃ والجماعۃ کہتے ہیں، آپ اس پر دلائل دیں اور لائیو بیان دنیا میں نشر ہوا اور لوگ اس کو سن رہے ہیں اور ساتھ ملائیشین زبان میں اس کا ترجمہ بھی چل رہا ہے۔

تو خیر مجھے ایک بات کا احساس ہوا باہر کے سفروں میں کہ یہ جو آپ کی مسجد کا درس ہے دنیا کا بہت بڑا طبقہ ہے جو اس درس کو بڑے اہتمام سے سنتا ہے، جب یہ ریکارڈ ہو کر نیٹ پر جاتا ہے تو لوگ اس کو شوق سے سنتے ہیں۔ لوگ "دروس القرآن" کو شوق سے خریدتے ہیں اور ابھی دروس القرآن کی ایک ہی جلد چھپی ہے اور چھپ کے دنیا میں جارہی ہے اور لوگ بار بار کہہ رہے ہیں کہ مولانا صاحب! دوسری جلد کب آئے گی؟ میں نے کہا: بھائی! ہمارے اس درس کا چھ سات دفعہ ناغہ ہوا ہے کچھ مجبوریوں کی

وجہ سے، ان شاء اللہ ہم کوشش کریں گے کہ دسمبر میں اگر نہیں تو جنوری میں دوسری جلد بھی آ جائے گی تو پھر آپ کو اندازہ ہو گا کہ جامع مسجد عثمانیہ کے دروس القرآن کا فیض دنیا میں کتنا پھیلا ہے۔ اللہ ہمیں اس کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حوالے سے دو تین باتیں ذہن میں رکھ لیں! حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا جو سلسلہ ہے وہ اپنے گھر سے ہی شروع ہوا۔ سب سے پہلے اپنے والد کو دعوت دی۔ جو میں نے آیت تلاوت کی ہے:

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝۴۱﴾

فرمایا: اس کتاب قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی باتیں بھی کیا کرو! وہ سچے نبی ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے والد کو دعوت:

﴿اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ۝۴۲ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝۴۳ يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝۴۴﴾

جب انہوں نے اپنے والد سے کہا: اے اباجی! آپ ان بتوں کی عبادت کیوں کرتے ہیں جو سنتے بھی نہیں اور دیکھتے بھی نہیں، آپ کے کسی کام کے نہیں اور میرے پاس وحی کا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں ہے۔ میرے پاس وہ علم ہے جو آپ کے پاس نہیں ہے تو آپ میری بات مان لیں اور شیطان کی بات نہ مانیں، شیطان اللہ کا نافرمان ہے اور دشمن ہے، یہ آپ کو پریشان کرے گا اور میں ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ پر اللہ کا عذاب نہ آ جائے۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ سے کہہ رہے ہیں۔

والد نے کہا: ﴿اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ﴾ اے ابراہیم! کیا تو یہ چاہتا ہے کہ تیری اس دعوت کی وجہ سے میں بتوں کی عبادت چھوڑ دوں؟ کان کھول کر سن لے ﴿لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا﴾ اگر تو اس دعوت سے باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا۔

اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے اللہ کی توحید کا مسئلہ بھی ہے اور والد کے ادب کا مسئلہ بھی ہے، اللہ کی توحید بھی نہیں چھوڑتے اور والد کا ادب بھی نہیں چھوڑ رہے، اپنے والد سے کہتے ہیں "سَلٰمٌ عَلَیْكَ" اچھا ابا جی! اللہ کے حوالے، میں آپ کو اللہ کے حوالے کرتا ہوں، جتنا میں آپ کو سمجھا سکتا تھا اس حد تک تو میں نے آپ کو سمجھایا ہے۔

﴿سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِیْ حَفِیًّا ﴿۴۷﴾﴾

میں آپ کو چھوڑ کر چلا جاتا ہوں لیکن میں آپ سے الگ ہو کر بھی اللہ سے آپ کے لیے معافی مانگتا رہوں گا کہ اے اللہ! میرے ابا جی کو معاف فرما، اللہ! میرے ابا جی کو سمجھ عطا فرما، میں آپ کے بتوں کو چھوڑتا ہوں اور مجھے اپنے رب سے امید ہے کہ اللہ مجھے محروم نہیں کرے گا۔ یہ ابراہیم علیہ السلام کی پہلی دعوت ہے جو آپ نے اپنے والد کو دی ہے اور والد نے اس دعوت کو قبول نہیں کیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنی قوم کو دعوت:

اب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے گھر سے نکلے اور اپنی قوم کو سمجھانا شروع کیا۔ نبی کا دل دیکھیں! کتنا بڑا ظرف ہوتا ہے۔ اکیلے ہیں، گھر کا ماحول مخالف ہے، خاندان مخالف ہے اور اپنی قوم سے دلائل کے ساتھ بات کی ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَ اتۡلُ عَلَیۡهِمۡ نَبَاَ اِبۡرٰهِیۡمَ ﴿۶۹﴾ اِذۡ قَالَ لِاَبِیۡهِ وَ قَوۡمِهٖ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۷۰﴾ قَالُوۡا نَعۡبُدُ اَصۡنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰکِفِیۡنَ ﴿۷۱﴾﴾

اے میرے پیغمبر! ان کو ابراہیم کا واقعہ سناؤ جب انہوں نے اپنی قوم سے اور اپنے والد سے بھی کہا تھا کہ تم کس کی عبادت کرتے ہو؟ اللہ کو چھوڑ کر سجدے کسے کر تے ہو؟ تو قوم نے کہا تھا: ہم ہمیشہ ان بتوں کی پوجا کریں گے جن کی ہم ہمیشہ سے پوجا کرتے چلے آرہے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا:

﴿قَالَ هَلۡ یَسۡمَعُوۡنَکُمۡ اِذۡ تَدۡعُوۡنَ ﴿۷۲﴾ اَوۡ یَنۡفَعُوۡنَکُمۡ اَوۡ یَضُرُّوۡنَ ﴿۷۳﴾﴾ [121]

جب تم ان کو بلاتے ہو تو کیا یہ تمہاری بات کو سنتے ہیں؟ اور اگر تم کہیں پھنس جاؤ تو تمہیں نفع دیتے ہیں؟ تمہیں خوشی ملے تو تمہیں تکلیف دے سکتے ہیں؟

انہوں نے کہا: اے ابراہیم! یہ ساری باتیں چھوڑو، ﴿بَلۡ وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا کَذٰلِکَ یَفۡعَلُوۡنَ﴾ ہمارے باپ دادا ایسے کرتے تھے تو ہم نے بھی ایسے ہی کرنا ہے، بس یہ نہ پوچھو کہ یہ نفع دیتے ہیں یا نقصان دیتے ہیں؟ سنتے ہیں یا نہیں؟ ہمارے آباء واجداد اسی طرح کرتے تھے تو ہم بھی اسی طرح کریں گے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام فرمانے لگے: پھر یہ بات سن لو کہ تم اور تمہارے آباء واجداد جو مشرک ہوں ﴿فَاِنَّهُمۡ عَدُوٌّ لِّیۡۤ اِلَّا رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۷۷﴾﴾ رب العالمین کے علاوہ ہر مشرک میرا دشمن ہے، میں نہ تمہیں مانتا ہوں اور نہ تمہارے آباء واجداد کو مانتا ہوں۔

ابراہیم علیہ السلام کے دلائلِ توحید:

121۔ الشعراء26:69تا73

پھر ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو ایک اللہ کو ماننے پر دلائل دینا شروع کیے۔ فرمایا:

﴿الَّذِیۡ خَلَقَنِیۡ فَھُوَ یَھۡدِیۡنِ ﴿۷۸﴾﴾

میرا اللہ وہ ہے جس نے مجھے پیدا بھی کیا ہے اور پھر وہ ہر موقع پر میری رہنمائی بھی فرماتا ہے۔ یہ کیسی عجیب گفتگو ہے! بچہ چھوٹا سا ہوتا ہے، اس کو یہ پتا نہیں ہوتا کہ میری خوراک کہاں ہے؟ اللہ اس کے دل میں ڈالتے ہیں کہ تیری خوراک تیری ماں کا دودھ ہے، اللہ اس کے دل میں ڈالتے ہیں تو یہ دائیں بائیں نہیں جاتا بلکہ سیدھا اپنی ماں کے دودھ پر جاتا ہے۔ تو اللہ یوں رہنمائی فرماتے ہیں۔

﴿وَ الَّذِیۡ ھُوَ یُطۡعِمُنِیۡ وَ یَسۡقِیۡنِ ﴿۷۹﴾﴾

میرا رب وہ ہے جو مجھے کھلاتا ہے اور مجھے پلاتا ہے۔

﴿وَ اِذَا مَرِضۡتُ فَھُوَ یَشۡفِیۡنِ ﴿۸۰﴾ وَ الَّذِیۡ یُمِیۡتُنِیۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡنِ ﴿۸۱﴾﴾

جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفا بھی دیتا ہے۔ موت بھی وہی دیتا ہے اور زندگی بھی وہی دیتا ہے۔

﴿وَ الَّذِیۡۤ اَطۡمَعُ اَنۡ یَّغۡفِرَ لِیۡ خَطِیۡٓـَٔتِیۡ یَوۡمَ الدِّیۡنِ ﴿۸۲﴾﴾

اور مجھے امید ہے کہ میرا رب مجھے قیامت کے دن معاف بھی فرمائے گا۔

اسلوب کی تبدیلی کی وجہ:

ابراہیم علیہ السلام نے جب یہ ساری باتیں فرمائی ہیں تو دو مقامات پر طرز بالکل بدل دیا ہے۔ پہلے فرمایا: اللہ نے مجھے پیدا بھی کیا ہے، اللہ میری رہنمائی بھی فرماتے ہیں، اللہ مجھے کھلاتے بھی ہیں، اللہ مجھے پلاتے بھی ہیں... آگے ایک جملہ چھوڑ کر فرمایا کہ اللہ مجھے موت بھی دیں گے، اللہ مجھے زندگی بھی دیں گے۔ اب اس سے پہلے

ایک بات فرمائی:

[۱]: ﴿وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴿٨٠﴾﴾

جب میں بیمار ہوتا ہوں تو شفا بھی دیتے ہیں۔

اور اس سے آگے ایک بات فرمائی:

[۲]: ﴿وَ الَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿٨٢﴾﴾

فرمایا اور مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن مجھے معاف بھی فرمائیں گے۔

اب یہ دو جملے آپ سمجھیں۔ جب پیدائش کی باری آئی تو فرمایا: اللہ پیدا بھی کرتے ہیں، اللہ ہدایت بھی دیتے ہیں، کھلاتے بھی ہیں، پلاتے بھی ہیں، موت بھی دیں گے، زندہ بھی کریں گے... اور جب بیماری کی باری آئی تو ابراہیم علیہ السلام نے لفظ بدل دیے ہیں۔ یہ نہیں فرمایا کہ اللہ بیماری بھی دیتا ہے اور اللہ شفا بھی دیتا ہے۔

بیماری کی نسبت اپنی طرف اور شفا کی نسبت اللہ کی طرف:

جیسے ہم کسی کے پاس جائیں تو یہی لفظ کہتے ہیں کہ بھائی! گھبراؤ نہیں، جس خدا نے بیماری دی ہے تو وہی خدا صحت بھی دے گا! یہی بات ہم لوگ کہتے ہیں جبکہ ابراہیم علیہ السلام کہہ رہے ہیں ﴿وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴿٨٠﴾﴾ کہ جب میں بیمار ہوتا ہوں تو شفا اللہ دیتا ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا کہ جو اللہ بیماری دیتا ہے وہی صحت بھی دیتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے بیماری کی نسبت اپنی طرف کی ہے، اللہ کی طرف نہیں کی اور صحت اور شفا کی نسبت اللہ کی طرف کی۔ یہ جملے کہہ کر ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات سمجھائی ہے کہ ادب کا تقاضا یہ ہے کہ بیماری کی نسبت اللہ کی طرف نہ کریں، صحت کی نسبت اللہ کی طرف کریں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عموماً بندے جب بیمار ہوتے ہیں تو ان میں سے ننانوے

فیصد وہ ہوتے ہیں جن کی بیماری میں ان کی بد پرہیزی کا دخل ہوتا ہے۔ ایک فیصد ایسے ہوتے ہیں جو بالکل ترتیب سے چل رہے ہوں اور پھر بھی بیماری آئے۔ جیسے اب مجھے بھی گلے میں ہلکی سی خراش محسوس ہو رہی ہے زکام کی وجہ سے، چونکہ موسم بدل رہا ہے۔ اب بدلتے موسم میں ہم موسم کا خیال نہیں کرتے۔ ابھی کھانا کھایا اور میزبان نے پوچھا: مولانا صاحب! بوتل پییں گے؟ اب دل تو نہیں کر رہا لیکن چونکہ آگئی ہے تھوڑی سی پی بھی لیتے ہیں۔ میں بھی ایسے کرتا ہوں اور آپ بھی ایسے کرتے ہیں۔ اب بتاؤ اس موسم میں بوتل پینے کا کوئی جواز بنتا ہے؟ لیکن بس پی لی۔ اب جب انسان نے بد پرہیزی کی ہے تو بتاؤ کہ بیماری آنی ہے یا نہیں؟ کیونکہ اللہ پاک نے ہر چیز میں تاثیر رکھی ہے۔ تو اس تاثیر نے اس کے مطابق عمل بھی کرنا ہے۔

شہد میں شفا؛ لیکن کیسے؟

ہم بہت ساری باتیں نہیں سمجھتے تو غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ شہد میں اللہ نے شفا رکھی ہے اس میں کوئی اشکال نہیں لیکن شفا کیسے رکھی ہے اور اس کو کھانا کیسے ہے؟ یہ طبیب کو پتا ہے۔ اب گرمی میں شہد پانی میں ملا کر پییں تو شہد کی تاثیر ٹھنڈی ہو جائے گی تو گرمی میں شفا ہو گی۔ سردی میں شہد کو ویسے چاٹ لیں بغیر پانی ملائے تو اب اس میں شفا ہے۔

کوئی شخص کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پانی میں شہد ملا کر پیتے تھے تو یہ دسمبر میں صبح کو اٹھے اور ایک جگ شہد کا پانی بنا کر پی لے اور پھر بیمار ہو اور کہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے تو بندہ بیمار نہیں ہوتا، یہ کیسے ہوا؟ بھائی! حضور صلی اللہ علیہ وسلم شہد پیتے تو تھے لیکن کب پیتے تھے یہ بھی تو سمجھنا ضروری ہے۔

ہر روز گوشت نہ کھائیں:

میں ایک بار لاہور گیا-یہ بہت پرانی بات ہے-ہمارے ایک قاری صاحب

دوست تھے تو وہ مجھے فرمانے لگے: مولانا صاحب! کیا پسند کرتے ہیں، کیا کھائیں گے؟ میں نے جیسے دوست سے کہتے ہیں انہیں کہا کہ بکرا کھائیں گے۔ مجھے وہ کہنے لگے: سبزی ہو جائے؟ میں نے کہا: جو بھی ہو جائے، میں نے تو اپنی پسند بتادی ہے۔ وہ مجھے کہنے لگے کہ اس پسند کی کوئی خاص وجہ ہے؟ میں نے کہا کہ بکرے کا گوشت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھا، اس لیے ہمیں بھی پسند ہے۔ مجھے انہوں نے کہا: مولانا صاحب! پسند تو تھا لیکن اس کا یہ معنی تو نہیں کہ ہر روز کھائیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ کبھی کبھی کھائیں، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند تھا تو کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر روز کھاتے تھے؟ تو یہ حضور پاک صلی اللہ کی سنت ہے لیکن یہ بھی دیکھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم استعمال کب فرماتے تھے۔

رات کو دودھ پییں لیکن بکری کا:

ملتان میں ہمارے ایک حکیم صاحب ہیں، مجھے جسم میں کوئی تکلیف ہوئی تو میں نے علاج ان سے کروایا۔ مجھے انہوں نے میری بیماری نہیں بتائی بس علاج کرتے رہے۔ جب علاج ہو گیا تو پھر انہوں نے بتایا کہ آپ کی بیماری یہ تھی۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں پہلے بتاتا تو آپ پریشان ہو جاتے، دراصل آپ کا خون اور پیپ آپس میں ملنا شروع ہو گیا تھا، اس وجہ سے جسم میں خارش شروع ہو گئی تھی، علاج کرتا رہا اب ٹھیک ہو گیا تو اب آپ کو بتادیا کہ بیماری یہ تھی۔ تو وہ حکیم صاحب مجھے کہنے لگے کہ جب تک آپ دوا کھاتے ہیں یا تو آپ دودھ نہ پییں، اگر پینا بھی ہے تو صبح صبح گرم پییں، رات کو سوتے وقت نہ پییں۔ اب چونکہ میں مولوی تھا اور مولوی دلیل بھی دیتے ہیں تو میں نے انہیں کہا کہ سوتے وقت دودھ پینا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، حکیم صاحب! سنت سے بیماری کیسے پھیل سکتی ہے؟ سنت میں تو شفا ہی شفا ہے۔ تو حکیم صاحب فرمانے لگے: حضور صلی اللہ علیہ وسلم رات کو جو دودھ پیتے تھے وہ بکری کا ہوتا

تھا اور آپ کے ہاں تو بھینس کا ہوتا ہے، بکری کا ملے تو آپ بھی پی لیں، کچھ نہیں ہو گا، بھینس کا ہو تو پھر نہیں پینا!

اب جس کے سامنے یہ پوری بات نہیں ہے وہ کیا سمجھے گا کہ سوتے وقت دودھ پینا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور حکیم کہتا ہے کہ نہ پیو! لہٰذا حکیم پاگل ہے، اس کو پتا ہی نہیں ہے شریعت کا، یہ اسلام کو جانتا ہی نہیں ہے، اس پر بس حکمت چڑھی ہوئی ہے۔ اب حکیم کو برا کہیں گے حالانکہ حکیم تو بات ٹھیک کہہ رہا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ادب:

ابراہیم علیہ السلام کی بات کو اس تناظر میں سمجھیں ﴿وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴿٨٠﴾﴾ کہ جب بیمار میں ہوتا ہوں تو اللہ ایسے کریم ہیں کہ مجھے شفا دیتے ہیں۔

تو مرض کی نسبت اپنی طرف کی ہے اور شفا کی نسبت اللہ کی طرف کی ہے۔

یہ ادب ہے اور ہمیں ادب سمجھانا نہیں آتا تو پھر امت تباہی کے دہانے پر پہنچ جاتی ہے۔

ادب بڑی بنیادی چیز ہے۔

معصوم ہیں تو مغفرت کے یقین کے بجائے امید کیوں فرمایا؟

اب دوسری بات سمجھیں کہ نبی تو معصوم ہے، نبی سے اللہ گناہ نہیں ہونے دیتے، جب گناہ نہیں ہوتا تو یقیناً نبی بخشا ہوا ہے لیکن ابراہیم علیہ السلام فرما رہے ہیں:

﴿وَ الَّذِيْۤ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿٨٢﴾﴾

کہ مجھے امید ہے کہ قیامت کو اللہ مجھے معاف بھی فرما دیں گے۔ امید نہیں بلکہ پورا یقین ہے تو پھر یقین کو امید سے کیوں تعبیر کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ پر یقین ہونے کے باوجود پھر بھی اللہ سے ڈرتے ہیں کہ میں ایسی بات کیسے کہہ دوں۔ یہ ابراہیم علیہ السلام جیسے نبی کا معاملہ ہے۔

ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے:

اس لیے علماء کہتے ہیں: "اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ" کہ ایمان امید اور خوف کے درمیان ہوتا ہے، کیا مطلب کہ اللہ سے ڈرتے بھی رہیں اور امید بھی رہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر قیامت کے دن اعلان ہو جائے کہ سارے لوگ جہنم میں جائیں گے اور ایک بندہ جنت میں جائے گا تو مجھے امید ہے کہ وہ میں ہوں گا اور اگر قیامت کو اعلان ہو جائے کہ سارے جنت میں جائیں گے اور صرف ایک جہنم میں جائے گا تو میں ڈرتا ہوں کہ وہ کہیں میں ہی نہ ہوں۔ [122]

اب دیکھیں! امید بھی کتنی ہے اور خوف بھی کتنا ہے؟! آدمی ڈرتا بھی رہے اور اللہ سے امید بھی ہو تو اس کو ایمان کہتے ہیں۔ آدمی کبھی بھی بے خوف نہ ہو۔

اب ابراہیم علیہ السلام کے ایک ایک لفظ سے کیسا خوف نکل رہا ہے آپ کو خود اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ تو اپنی قوم کو وہ دلیل دی ہے جو عام سنجیدہ طبقہ سمجھتا ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کی ایک اور دلیل:

اب ایک اور دلیل ابراہیم علیہ السلام نے قوم کو دی کہ تم جو اللہ کے علاوہ بتوں کی عبادت کرتے ہو، اللہ کے علاوہ اور بڑی بڑی چیزیں کیا ہو سکتی ہیں؟ آسمان پر ستارہ ہو سکتا ہے، چاند ہو سکتا ہے، سورج ہو سکتا ہے، یہ بھی اللہ کی بڑی مخلوق ہیں، تو بتوں کی تو حیثیت ہی کوئی نہیں، یہ تو چل بھی نہیں سکتے، اندھیرے میں روشنی نہیں دے سکتے تو ان پر کیا توقع رکھیں؟

122۔ العرف الشذی للشیخ انور الکشمیری: ج2 ص407

﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيۡهِ الَّيۡلُ رَاٰ كَوۡكَبًا﴾[123]

جب رات چھا گئی، ستارہ طلوع ہوا تو ابراہیم علیہ السلام فرمانے لگے: ﴿هٰذَا رَبِّيۡ﴾ کہ یہ میرا رب ہے؟ اس کو رب مانوں؟ ﴿فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الۡاٰفِلِيۡنَ﴾ جب ستارہ غروب ہو گیا تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: میں غروب ہونے والے سے پیار نہیں کرتا۔ یہ نہیں فرمایا کہ جو ڈوبتا ہے میں اس کو خدا نہیں مانتا بلکہ فرمایا کہ جو ڈوبتا ہے میں اس سے پیار نہیں کرتا، اس سے محبت نہیں کرتا، عبادت تو دور کی بات ہے میں ڈوبنے والوں سے پیار بھی نہیں کرتا۔ اس کی وجہ بھی ہے، قرآن کریم میں ہے:

﴿وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾[124]

جو ایمان والے ہیں ان سے زیادہ اللہ سے کوئی پیار نہیں کرتا۔

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جو ڈوبے اس سے محبت نہیں ہوتی، جب اس سے محبت نہیں تو وہ خدا کیسے بنے گا؟

﴿فَلَمَّا رَاَ الۡقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيۡ﴾

جب چمکتا ہوا چاند دیکھا تو فرمایا: یہ میرا رب ہے؟ اور ایک وقت آیا کہ چاند بھی ڈوب گیا تو فرمانے لگے:

﴿لَئِنۡ لَّمۡ يَهۡدِنِيۡ رَبِّيۡ لَاَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡقَوۡمِ الضَّآلِّيۡنَ﴾

کہ اگر خدا نے میری راہنمائی نہ کی تو تمہاری طرح میں بھی گمراہ ہو جاؤں گا،

123۔ الانعام 76:6

124۔ البقرۃ 165:2

اس چاند کو بھی میں خدا نہیں مان سکتا۔

پھر اس کے بعد سورج اس سے بھی زیادہ روشن ہو گیا، ﴿فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ﴾ فرمایا: یہ رب ہے؟ یہ جو بڑا ہے اس کو خدا مان لوں؟ ﴿فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۸﴾﴾ جب وہ بھی ڈوب گیا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تمہارے شرک سے بری ہوں۔ یہ سب نفع نہیں دے سکتے، نقصان نہیں دے سکتے، سن نہیں سکتے، بات نہیں کر سکتے تو میں ان کو خدا کیسے مانوں؟ ابراہیم علیہ السلام کتنی محنت کے ساتھ اپنی قوم کو آہستہ آہستہ سمجھاتے رہے۔ جب یہ سارے راستے پورے ہو گئے اور آپ نے سمجھا کہ قوم کو دلیل سے بات سمجھ نہیں آرہی، اب ان کے ساتھ کوئی اور ہاتھ کرنا چاہیے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام فرمانے لگے:

﴿وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾﴾[125]

مجھے لگتا ہے کہ تمہیں تب سمجھ آنی ہے جب میں نے تمہارے خداؤں سے دو دو ہاتھ کرنے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے یہ جملہ کہہ دیا۔ اب یہ قوم ایک میلہ لگتا تھا اس پر جانے لگی۔ ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ تم بھی چلو! قرآن کریم میں ہے:

﴿فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ ﴿۸۸﴾ فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴿۸۹﴾﴾[126]

ستاروں کو دیکھا اور فرمایا: میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں نہیں جا سکتا۔ قوم نے سمجھا کہ ابراہیم علیہ السلام اب کچھ ٹھیک ہو گئے ہیں، انہوں نے بھی ستاروں کے اثر کو ماننا شروع کر دیا ہے جبکہ ابراہیم علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ میں تمہارے

125۔ الانبیاء 57:21

126۔ الصافات 89،88:37

شرک سے بیزار ہوں، تمہارے شرک کو دیکھ کر مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔

قوم میلے پر چلی گئی۔ ابراہیم علیہ السلام ان کے جانے کے بعد بت خانے میں داخل ہوئے، کسی بت کا ناک کاٹ دیا، کسی کا کان کاٹ دیا، کسی کا ہاتھ کاٹ دیا، کسی کا پاؤں کاٹ دیا اور کلہاڑا بڑے بت کے کندھے پر رکھ دیا۔ جب وہ میلے سے واپس آئے تو دیکھا کہ کوئی بت لنگڑا ہے، کوئی سر کٹا ہے، سارے بت یوں پڑے تھے۔ اب انہوں نے کہا کہ یہ کام کس نے کیا ہے؟ تلاش کرو اسے! بعض لوگ کہنے لگے: ﴿سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗۤ اِبْرٰهِيْمُ﴾ ہم نے ابراہیم کے بارے میں سنا ہے کہ وہ ہمارے بتوں کے بارے میں کچھ ایسی باتیں کرتا تھا، کہنے لگے: ﴿فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰۤى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ﴾ لاؤ ان کو سب کے سامنے تاکہ ہم ان سے پوچھیں۔

جب ان کو لایا گیا تو قوم نے پوچھا: ﴿ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰۤاِبْرٰهِيْمُ﴾ اے ابراہیم! ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ کام آپ نے کیا ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: یہ میں نے نہیں کیا، ﴿بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا﴾ یہ جو بڑا ہے نا اس نے کیا ہے۔ تو وہ فوراً کہنے لگے: ابراہیم! آپ بھی عجیب ہیں، یہ بات نہیں کر سکتا، چل نہیں سکتا تو یہ کلہاڑا مارے گا؟ ابراہیم علیہ السلام فرمانے لگے: یہی بات تو میں تمہیں کہتا ہوں، ﴿اُفٍّ لَّكُمْ وَ لِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ تف ہے تمہاری عبادت پر، تم اتنی موٹی سی بات کو بھی نہیں سمجھ سکتے، یہی بات تو میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں، تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔ ﴿ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰۤؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ﴾ پھر وہ شرمندہ ہو کر کہنے لگے کہ تجھے پتا ہے کہ یہ باتیں نہیں کر سکتے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام فرمانے لگے کہ مجھے پتا ہے تبھی تو تمہیں کہتا ہوں کہ ان کی عبادت نہ کرو۔

کیا بتوں کو بڑے بت نے مارا تھا؟

یہاں ایک چھوٹا سا سوال سمجھیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

﴿بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا﴾

بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جو کہا ہے کہ بڑے نے یہ کیا ہے، یہ بظاہر سچ اور درست نہیں کہا۔ اس کا جواب سمجھیں؛ بسا اوقات گفتگو میں اپنے مخالف کے مسلَّمات کو لے کر گفتگو کی جاتی ہے۔ مسلَّمات کا معنی کہ جس بات کو مخالف بھی مانتا ہو اس کو فرض کر لیتے ہیں کہ تم ٹھیک کہتے ہو، اب بتاؤ اب کیا کریں؟ نتیجہ پھر اس کے خلاف نکلتا ہے۔ ابرہیم علیہ السلام نے کہا کہ جب تم یہ کہتے ہو کہ یہ ہمارے مدد گار ہیں، نفع دیتے ہیں، نقصان دیتے ہیں، چلو مان لیتے ہیں، اس لیے تو میں کہتا ہوں کہ اس بڑے نے کیا ہے۔ اب انہوں نے کہا: یہ تو نہیں کر سکتے۔ فرمایا: یہی بات تو میں بھی کہتا ہوں۔ یہ مقصد تھا اس بات کے کہنے کا، ایسا نہیں تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کی بات میں جھوٹ تھا العیاذ باللہ۔ اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

حضرت ابراہیم کی نمرود کو دعوت:

جب قوم کی بس ہو گئی تو ابراہیم علیہ السلام نے براہ راست نمرود کو دعوت دی۔ جب نمرود کو پتا چلا کہ ہمارے ملک میں کوئی نوجوان لڑکا ہے جو دعوت دیتا ہے، ہماری عبادت کے خلاف بولتا ہے اور ہمیں بھی خدا نہیں مانتا تو اس نے کہا کہ جاؤ! ان کو بلا کر لاؤ۔ ابراہیم علیہ السلام اب نمرود کے دربار میں آئے۔ نمرود نے ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا: تو ہمیں خدا نہیں مانتا؟ فرمایا: نہیں۔ پوچھا کہ ان بتوں کو خدا نہیں مانتا؟ آپ نے فرمایا کہ ان کو بھی نہیں مانتا۔ اس نے پوچھا: پھر کس کو مانتا ہے؟

فرمایا: میں خدا اس کو مانتا ہوں ﴿رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيِ وَ يُمِيْتُ﴾ جو زندہ بھی کرتا ہے اور موت بھی دیتا ہے۔ اس نے کہا: یہ کون سی بڑی بات ہے؟ سزائے موت کے ایک قیدی کو لیا اور کہا: چلو تم بری ہو اور کہنے گا کہ میں نے اسے زندہ کیا اور ایک اس قیدی کو لیا جس کے لیے فیصلہ تھا بری ہونے کا، کہا کہ اس کو سزائے موت دے دو، اسے سولی پر لٹکا دو! کہنے لگا کہ ہم نے اس کو مار دیا۔ تو دیکھو! ہم نے زندہ بھی کیا اور ہم نے مار بھی دیا، تم کہتے تھے کہ اللہ مارتا ہے اور اللہ ہی زندہ کرتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ نمرود موت وحیات کا معنی نہیں سمجھتا۔

اس پر میں بات کروں گا تو بات لمبی ہو جائے گی۔ بعض باتیں جلدی سمجھ میں نہیں آتیں، ان پر تھوڑی سی بات کرنی پڑتی ہے پھر جا کر بات سمجھ آتی ہے۔ اگر میں نے بات شروع کی تو آپ کو میری بات پر تعجب ہو گا اور آپ لوگ کہیں گے کہ مولانا صاحب! اس مسئلہ کی کیا ضرورت ہے؟

میں ملائشیا گیا، وہاں لوگوں نے یہ حیات ممات کا مسئلہ چھیڑا ہوا ہے۔ تو مجھے شافعی المذہب لوگوں نے کہا جو ہماری اردو زبان بھی نہیں سمجھتے کہ مولانا صاحب! حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مسئلہ سمجھائیں! اور یہ کہنے والے بھی تبلیغی جماعت کے لوگ ہیں کہ ہمارے بچوں کو اِن لوگوں نے خراب کرنا شروع کر دیا ہے، ہمیں مسئلہ سمجھائیں! تو میں نے کہا: بھائی اس کے لیے وقت زیادہ چاہیے، انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔

عذاب قبر پر اشکالات کے جوابات:

میں صرف یہ بتا رہا تھا کہ بسا اوقات مسئلہ سمجھانے کے لیے لمبی بات سمجھانی پڑتی ہے تو مجھے صرف موت کا معنی سمجھانے کے لیے پانچ گھنٹے سبق پڑھانا پڑھا، صرف یہ سمجھانے کے لیے کہ موت کیا ہے! جب ان کو بات سمجھ میں آگئی تو میں نے کہا کہ

اب تمہیں سمجھ آئے گا کہ برزخ کیا ہے۔ مجھے اچھا خاصا وقت لگانا پڑا کہ برزخ کسے کہتے ہیں؟ اب اگر برزخ کا مسئلہ نہ سمجھائیں تو بہت سارے اعتراضات ہوتے ہیں۔

مثلاً یہ لوگ کہتے ہیں کہ فرعون جو مصر میں ہے وہ قبر میں نہیں پڑا ہوا بلکہ قبر سے باہر پڑا ہوا ہے اور آپ لوگ کہتے ہیں کہ عذابِ قبر ہوتا ہے۔ جب فرعون قبر میں ہے ہی نہیں تو اس کو عذابِ قبر کیسے ہو گا؟ اس طرح ایک شبہہ یہ بھی کرتے ہیں کہ ایک آدمی کو جانور کھا گیا ہے، وہ تو دفن ہوا ہی نہیں تو اس کو عذابِ قبر کہاں ہو گا؟ ایک کافر ہے اس کو شیر نے کھا لیا ہے، اگر اس کو عذاب ہو رہا ہے تو اس سے شیر کو بھی تکلیف ہو رہی ہو گی۔ تو بتاؤ اس جانور کو کس بات کی سزا ہے؟ اس بنا پر یہ لوگ کہتے ہیں کہ جسم کو عذاب ہی نہیں ہوتا۔ ایسے شبہات وہاں کے لوگوں کے ذہنوں میں ڈالے ہوئے ہیں۔ اس لیے لوگوں کے لیے سمجھنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے پھر سمجھانا پڑتا ہے کہ برزخ کیا ہے!

جب میں نے سارے سوالات چھیڑے تو ان کو بڑا تعجب ہوا کہ سارے سوالات تو یہی ہیں۔ پھر میں نے مسئلہ سمجھانا تھا، بتاؤ پانچ گھنٹے لگنے ہیں یا نہیں؟ ایک ایک اعتراض میں نقل کرتا رہا اور ان کو سمجھاتا رہا۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ایک بات کو سمجھانے میں کافی دیر چاہیے تب جا کے بات سمجھ آتی ہے۔

برزخ کسے کہتے ہیں؟

چھوٹی سی بات آپ بھی سمجھ لیں، میں لمبی بات نہیں کرتا۔ آپ یہ بات ذہن میں رکھ لیں کہ برزخ کسے کہتے ہیں؟ برزخ دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہے:

1: زمان 2: مکان

زمان؛ وقت کو کہتے ہیں اور مکان؛ جگہ کو کہتے ہیں۔ برزخ کا زمان یہ ہے کہ موت سے لے کر حشر تک یہ سارا وقت زمان ہے اور سجین سے لے کر علیین تک یہ سارا

مکانِ برزخ ہے۔ سجین ساتوں زمینوں سے نیچے ایک جگہ ہے اور علیین آسمان پر ایک جگہ ہے، یہ سارا برزخ ہے۔

اب آپ بات سمجھ سکتے ہیں کہ ایک آدمی فوت ہو جاتا ہے اور اس کی لاش باہر پڑی ہوتی ہے لیکن وہ پھر بھی برزخ میں ہے۔ کوئی بندہ کہے گا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ لاش برزخ میں ہے اور ہم برزخ میں نہیں ہیں، جبکہ ہیں تو دونوں عثمانیہ مسجد میں! تو آپ اسے سمجھائیں گے کہ برزخ دو چیزوں کا نام ہے؛ سجین سے علیین تک مکان اور موت سے لے کر حشر تک زمان، اس میت کو دونوں چیزیں مل رہی ہیں، اس کو مکان بھی مل گیا اور زمان بھی اور ہمیں مکان تو مل گیا کہ سجین اور علیین کے درمیان ہیں لیکن ہمیں زمان نہیں ملا۔ یہ بات کب سمجھ میں آئے گی جب آپ کو برزخ کا معنی سمجھ میں آئے گا اور جب برزخ کا معنی سمجھ میں نہیں آئے گا تو سوالات پیدا ہوتے رہیں گے۔

لاش کو جانور کھالے تو عذاب کیسے ہو گا؟

یہ جو اعتراض تھا کہ بندہ شیر کے پیٹ میں ہے اس کو تکلیف ہوتی ہے تو شیر کو تکلیف کیوں نہیں ہوتی؟ میں نے کہا: یہ تو بہت آسان ہے، انگلی میں ہڈی کو تکلیف ہو تو چمڑے کو بھی تکلیف ہوتی ہے؟ (نہیں ہوتی۔ سامعین) کبھی نہیں ہوتی۔ ہڈی کی حیثیت الگ ہے اور چمڑے کی حیثیت الگ ہے۔ سر میں درد ہو تو اوپر بھی تکلیف ہوتی ہے؟ اوپر تو نہیں ہوتی۔ پیٹ میں معدے میں درد ہو تو چمڑے کو بھی تکلیف ہوتی ہے؟ چمڑے کو تو نہیں ہوتی۔ تو کافر کو تکلیف ہوتی ہے لیکن شیر کو نہیں ہوتی۔ میں نے کہا کہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی آدمی کے پیٹ میں کیڑے پڑ جائیں، اس کو دوا کھلائی تو اندر کیڑے مر رہے ہیں اور آدمی کو کچھ بھی نہیں ہو رہا، وہ چیز جو کیڑے نے کھائی ہے اس کو تکلیف ہوئی ہے کہ نہیں؟ ہوئی ہے۔ اب دیکھو! باقی معدے کو تکلیف نہیں ہو رہی، جسم میں

معدہ ہے اور معدے میں کیڑا ہے، وہ کیڑا مر جاتا ہے، کیڑے کو تو تکلیف ہوتی ہے لیکن معدے کو تکلیف نہیں ہوتی۔

اس لیے اگر کافر کسی شیر کی غذا بن جائے اور اس کی غذا کو تکلیف ہو اور شیر کو تکلیف نہ ہو یہ تو عقل میں آنے والی بات ہے۔ جب ہم نے یہ مسئلہ چھیڑا تو انہوں نے کہا: مولانا صاحب! ہم پر ایک اور احسان کریں۔ میں نے کہا: وہ کیا؟ کہا کہ آپ دوبارہ دس دن آئیں، اس دفعہ آپ نے سفر کیا ہے کبھی صوبہ گڈا، کبھی صوبہ پنگی، کبھی صوبہ کلنتن وغیرہ جب آپ دوبارہ آئیں گے تو ملائیشیاء کے علماء ایک جگہ جمع ہوں گے، اُس بار آپ سفر نہیں کریں گے بلکہ ہم سفر کریں گے، ہمیں پتا نہیں تھا کہ ہمارے ملک میں کون ہے۔ اب ہمیں پتا چلا ہے۔ آئندہ آپ ایک جگہ بیٹھیں گے اور ہم آپ کے پاس آئیں گے۔ تو اب ان کو احساس ہوا کہ دلائل کسے کہتے ہیں اور دلیل کی طاقت کتنی ہوتی ہے۔

اس لیے میں کبھی سرگودھا والوں سے کہتا ہوں کہ مزے کی نیند سو جاؤ! ہمارے ہوتے ہوئے آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہے ان شاء اللہ۔ بس یہ شرط ہے کہ تم تھوڑا سا اعتماد تو کرو! تم یہاں سے لاہور جاتے ہو تمہیں تکلیف نہیں ہوتی اور تمہیں 87 جاتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے، اب اس کا علاج تو ہمارے پاس نہیں ہے۔

نمرود سے مناظرہ:

تو خیر میں عرض کر رہا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کو سمجھایا۔ اب وہ موت وحیات سمجھتا نہیں تھا، وہ بد دماغ آدمی تھا، اس کو اب کیسے سمجھائیں؟ اس کے لیے وقت چاہیے تھا۔ تو ابراہیم علیہ السلام نے فوراً رخ بدل کر کہا کہ میرا اللہ وہ ہے جو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، اگر تو خدا ہے تو سورج کو مغرب سے نکال کر دکھا!

﴿فَبُهِتَ الَّذِیْ کَفَرَ﴾

نمرود چپ ہو گیا، اس کی بس ہو گئی۔ بادشاہوں اور حکومتوں کا مزاج ہوتا ہے کہ وہ دلیل سے بات نہیں کرتے، طاقت سے بات کرتے ہیں۔ جب یہ سارے حربے ناکام ہو گئے تو نمرود نے کہا:

﴿حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿٦٨﴾﴾ [127]

کہ اپنے خداؤں کی مدد کرو اور ابراہیم کو آگ میں ڈالو۔

آگ جلادی۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ مجھے کوئی ڈر نہیں، پھینک دو، اللہ میری مدد کرے گا۔ انہوں نے جلتی آگ میں ڈالا، آگ ایسی تھی کہ اوپر سے پرندہ گزرتا تو جل جاتا۔ جب ابراہیم علیہ السلام آگ میں گئے تو اللہ رب العزت نے فرشتے کو بھیجا کہ جاؤ آگ کو میری طرف سے کہہ دو!

﴿يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿٦٩﴾﴾ [128]

اے آگ! ٹھنڈی ہو جا لیکن زیادہ ٹھنڈی نہیں کہ ہمارے ابراہیم کو تکلیف ہو، بلکہ ایسے ہو جا کہ گل وگلزار میں پڑے ہوں۔ ابراہیم علیہ السلام وہاں سے بھی فارغ ہوئے۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔

ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت:

جب یہ سارے مرحلے ختم ہوئے تو ابراہیم علیہ السلام نے سوچا کہ اب بہتر یہ ہے کہ میں اس شہر کو چھوڑ دوں۔ اب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ، لوط علیہ السلام اور ان کی بیوی کو ساتھ لیا اور وہاں سے چل پڑے۔ پہلے فرات پہنچے، وہاں سے فلسطین، وہاں سے مصر پہنچے تو وہاں ایک نئی مصیبت کھڑی ہو گئی۔ مصر کا

127۔الانبیاء21:68

128۔الانبیاء21:69

بادشاہ تھا فرعون۔

یہ وہ فرعون نہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں آیا تھا بلکہ جیسے ہمارے ہاں صدر ہوتا ہے، وزیر اعظم ہوتا ہے، ہمارے ہاں بادشاہ صدر ہے اور اس دور کا مزاج یہ تھا کہ مصر کا جو بھی بادشاہ تھا اس کو فرعون کہتے تھے، فرعون نام نہیں ہے یہ فرعون وہاں کا ایک خاص لقب تھا، اس دور کا جو فرعون تھا اس کا ایک عجیب گندہ مزاج تھا کہ اگر کوئی شخص وہاں سے گزرتا تھا اور اس کے ساتھ اس کی عورت بھی ہوتی اور خوب صورت ہوتی تو بادشاہ اس کے خاوند کو قتل کر دیتا تھا اور اس کی بیوی کو رکھ لیتا اور اگر شوہر ساتھ نہ ہوتا کوئی اور ہوتا بھائی وغیرہ تو پھر وہ کچھ نہیں کہتا تھا۔

ابراہیم علیہ السلام وہاں سے گزرے۔ اس مصیبت کا ان کو بھی سامنا کرنا پڑا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ سارہ کو اللہ نے ظاہری حسن بہت عطا کیا ہوا تھا۔ تو سرکاری کارندے آ گئے پکڑنے کے لیے۔ ابراہیم علیہ السلام نے بیوی سے کہا کہ جب وہ تجھ سے کہے کہ یہ کون ہے؟ تو کہنا کہ یہ بھائی میرے ساتھ ہے اور میں تیرا مذہبی بھائی ہوں۔ مسلمان سارے بہن بھائی ہیں۔ اسلامی رشتے کے لحاظ سے بہن تھی۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت سارہ؛ ابراہیم علیہ السلام کی چچازاد بہن تھی تو فرمایا کہ میں تیرا چچازاد اور اسلامی بھائی ہوں۔

حضرت سارہ جب فرعون کے پاس پہنچیں تو اس نے پوچھا: ساتھ کون ہے؟ کہا کہ بھائی ہے۔ وہ بد بخت پھر بھی باز نہ آیا۔ ہاتھ بڑھانا چاہا تو خدا نے اس کا ہاتھ شل کر دیا۔ اس نے سمجھا کہ یہ کوئی نیک عورت ہے۔ کہا کہ دعا کرو، اللہ مجھے ٹھیک کر دیں، میں تجھے کچھ نہیں کہوں گا۔ حضرت سارہ نے دعا کی تو وہ ٹھیک ہو گیا۔ پھر ہاتھ ڈالا تو پھر شل ہو گیا۔ اس نے پھر کہا کہ دعا کرو کہ اللہ مجھے ٹھیک کر دیں، میں تجھے کچھ نہیں کہوں گا۔ تیسری بار ٹھیک ہوا تو پھر ہاتھ ڈالا، پھر شل ہوا، پھر اس نے کہا کہ آخری بار تجھ سے

کہتا ہوں، مجھے معاف کر دو۔ حضرت سارہ نے دعا مانگی تو وہ ٹھیک ہو گیا۔ پھر اس فرعون نے اپنی بیٹی ہاجرہ حضرت سارہ کو دی کہ یہ تیری خدمت گزار ہے تم اس کو بھی ساتھ لے جاؤ۔

کیا حضرت ہاجرہ باندی تھیں؟

ابراہیم علیہ السلام مصر میں داخل ہوئے تو ایک بیوی ہے اور نکلے تو دو بیویاں ہیں۔ اس نے امتحان لینا چاہا خدا نے ساتھ بیوی دے دی۔ اس ہاجرہ سے پھر عرب کی نسل چلی ہے۔ اب آپ کے ذہن میں ایک سوال آئے گا اور عموماً مشہور ہے کہ ہاجرہ فرعون مصر کی لونڈی اور خادمہ تھی، وہی اس نے حضرت سارہ کو دی تھی اور وہ حضرت ابراہیم کی خادمہ تھی تو ان کی نسل سے جو لوگ چلے ہیں ان میں سے قریش بھی ہیں اور قریش سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں تو کیا پیغمبر کے خاندان میں کوئی ایسی عورت بھی ہے جو باندی ہو؟

اس کا بہترین جواب جو علماء نے دیا ہے وہ یہ ہے کہ جب ایک آدمی ایک شادی کے بعد دوسری شادی کرتا تو دوسری شادی کے لیے یہ شرط تھی کہ وہ پہلی بیوی کے لیے خادمہ بن کر رہتی۔ جب فرعون مصر نے اپنی بیٹی دی تو کسی نے کہا کہ آپ تو شہزادی کو خادمہ بنوا رہے ہیں تو نمرود نے کہا کہ سارہ اتنی نیک عورت ہے کہ میری بیٹی میرے پاس شہزادی بن کر رہے اس سے بہتر ہے کہ سارہ کی نوکرانی بن کر رہے۔ تو خادمہ نہیں تھی شہزادی تھی وہ اس نے دی تھی۔ اس سے پھر اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تھے۔ آگے جو اسماعیل علیہ السلام کا واقعہ چلتا ہے تو میں نے صرف خلاصہ عرض کیا ہے۔

تو ابراہیم علیہ السلام جد امجد ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور ان کی ملت کی اتباع کرنے کا اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے اور یہاں سے پھر آگے وہ سلسلہ چلا

ہے۔

حضرت ابراہیم پر اشکال کا جواب (ثلاث کذبات):

اس میں صرف ایک بات یاد رکھ لیں۔ یہ صحیح بخاری کی روایت ہے اور بڑا مشہور اعتراض ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَمْ يَكْذِبْ إِبْرَاهِيمُ إِلَّا ثَلَاثَ كَذَبَاتٍ." [129]

ابراہیم علیہ السلام نے زندگی میں صرف تین جھوٹ بولے ہیں۔

اس پر اعتراض ہوتا ہے کہ یہ روایت ٹھیک نہیں ہے۔ جو لوگ صحیح بخاری پر اعتراض کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ روایت صحیح نہیں۔ اعتراض کیا ہے؟ کہ یہ حدیث آیت کے خلاف ہے، قرآن کریم میں ہے: ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِبْرٰهِيْمَ ۬ إِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا﴾ قرآن ابراہیم علیہ السلام کو صدیق کہتا ہے اور بخاری کہتا ہے کہ انہوں نے تین جھوٹ بولے تھے۔

علماء نے لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اس کو کذب اور جھوٹ کہا ہے تو دراصل یہ جھوٹ نہیں تھا، یہ ایسے الفاظ تھے جو دیکھنے میں جھوٹ لگ رہے تھے، در حقیقت سچ تھے، اس کو بلاغت اور علم المعانی کی زبان میں "توریہ" کہتے ہیں۔ توریہ کا معنی یہ ہے کہ مخاطب معنی کوئی اور سمجھے اور بولنے والا مراد کوئی اور معنی لے۔

یہ تین واقعات ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ پیش آئے ہیں جو میں نے ابھی درس کے دوران بیان کر دیے ہیں لیکن صرف سمجھانے کے لیے میں کہہ رہا ہوں۔ ایک واقعہ یہی ہے کہ بیوی سے فرمایا کہ جب فرعون آپ سے پوچھے کہ یہ شخص کون ہے؟ تو آپ نے کہنا ہے کہ یہ میرا بھائی ہے، وہ کچھ اور سمجھا اور ابراہیم علیہ السلام کا

129۔ صحیح البخاری، رقم 5084

مقصد تھا کہ اسلامی بھائی ہوں۔ یہ جھوٹ تو نہیں ہے۔ دوسرا واقعہ جب بتوں کو مارا تو کلہاڑا بڑے کے کندھے پر رکھا اور کہا: ﴿بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا﴾ کہ یہ کام ان کے بڑے نے کیا ہے حالانکہ بڑے نے تو نہیں کیا تھا تو چونکہ وہ کہتے تھے کہ بت سب کچھ کرتے ہیں تو ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات ان کے دعوے کے مطابق کہی تھی کہ اس نے کیا ہے، حالانکہ مراد ان کی یہ نہیں تھی۔ ﴿بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا﴾

اور بعض نے اور جواب دیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے ﴿بَلْ فَعَلَهٗ﴾ کو الگ کہا، پھر ﴿كَبِيْرُهُمْ هٰذَا﴾ کو الگ کہا۔ سانس توڑ کر دو جملے بولے ہیں۔ قوم نے کہا: ابراہیم! تو نے یہ کیا ہے؟ فرمایا: نہیں، ﴿بَلْ فَعَلَهٗ﴾ اِس کو اُس نے کیا ہے، ﴿كَبِيْرُهُمْ هٰذَا﴾ بڑا یہ ہے۔ اب یہ کام کس نے کیا ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے اس کے متعلق کچھ نہیں فرمایا۔ تو دیکھو بات بالکل الگ فرمائی ہے۔

تیسرا واقعہ کہ جب ستاروں کو دیکھا تو کہا کہ ﴿هٰذَا رَبِّيْ﴾ یہ میرا رب ہے؟ اب تو بالکل عنوان ہی بالکل بدل گیا، یہ تو استفہام ہو رہا ہے۔ اس لیے اس میں اعتراض کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ تو ابراہیم علیہ السلام کا طرز یہ تھا کہ سننے والا اور سمجھے اور کہنے والے کی مراد کچھ اور ہو۔

یہ شخص مجھے راستہ دکھا رہا ہے:

اس کو سمجھنا ہو تو آخر میں ایک مثال سمجھو! حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کی تنہائی میں مکہ سے مدینہ لے جا رہے تھے تو راستے میں ایک کافر ملا۔ اس نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پہچان لیا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پہچانا۔ تو اس نے پوچھا کہ یہ ساتھ کون ہے؟ اب صدیق اکبر پریشان ہو گئے کہ اگر بتاتا ہوں تو یہ ظالم ہمیں چھوڑے گا نہیں، مخبری کر دے گا اور

اگر جھوٹ بولوں گا تو صدیق نہیں رہوں گا۔ اب میں کیا کروں؟ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"هٰذَا الرَّجُلُ يَهْدِيْنِي السَّبِيْلَ." [130]

یہ میرے ساتھ بندہ ہے جو مجھے راستہ دکھا رہا ہے۔

وہ کافر سمجھا کہ جہاں جانا ہے تو راستے کا پتا نہیں ہے یہ شخص وہ راستہ دکھا رہا ہے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرما رہے تھے کہ یہ مجھے جنت کا راستہ دکھا رہے ہیں۔ وہ کچھ اور سمجھا اور انہوں نے کچھ اور فرمایا۔ یہ بڑی عقل کی باتیں ہیں اور جب انسان خود کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے تو اللہ ایسی باتیں انسان کو سمجھا دیتے ہیں۔ اللہ مجھے اور آپ سب کو توفیق عطا فرمائیں کہ ہم بھی اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ:

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى ۡ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۱﴾﴾

اس آیت کریمہ میں دو لفظ ہیں جو ہم نے سمجھنے ہیں۔ اپنی زبان پر ہم اس کو لاتے بھی ہیں لیکن عموماً اس کے مضمون کو ہم سمجھ نہیں پاتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا" موسیٰ علیہ السلام رسول بھی تھے اور نبی بھی تھے۔ ہم عموماً کہتے ہیں کہ ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم ... ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم ... تو کیا نبی اور رسول کا معنی ایک ہے یا الگ الگ ہے؟ ذرا اس بات کو سمجھیں۔

کئی بار آپ نے سنا ہو گا کہ سوا لاکھ کم و بیش انبیاء علیہم السلام اللہ نے مبعوث فرمائے ہیں اور تین سو تیرہ ان میں رسول ہیں، تو رسولوں کی تعداد کم ہے اور نبیوں کی

130۔ صحیح البخاری، رقم:3911

تعداد زیادہ ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ نبی اور رسول میں فرق ہے۔

نبی اور رسول میں فرق:

رسول اسے کہتے ہیں جو نئی اور مستقل شریعت لے کر آئے اور اس کی دو صورتیں ہیں؛ ایک صورت یہ ہے کہ رسول اپنی قوم کے پاس اپنی مستقل شریعت لے کر آئے جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ کی طرف سے تورات دی، یہ مستقل شریعت ہے، عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو انجیل دی، یہ مستقل شریعت ہے، داؤد علیہ السلام نے زبور دی یہ مستقل شریعت ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے تھے یہ مستقل شریعت ہے، حضرت ادریس علیہ السلام کے تیس صحیفے تھے یہ مستقل شریعت ہے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ایک نبی جس قوم کی طرف مبعوث ہے تو وہ گزشتہ نبی کی شریعت اس قوم کو دے۔ تو وہ شریعت تو نئی نہیں ہے لیکن اس قوم کے لیے وہ نئی شریعت ہے۔ اس کی مثال سمجھیں! حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے ہیں؛ ایک حضرت اسحاق اور ایک حضرت اسماعیل علیہما السلام۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے اسحاق تھے، ان کے بیٹے یعقوب تھے، ان کے بیٹے یوسف... علیہم السلام۔ یہ انبیاء کی لڑی ہے، اور حضرت اسماعیل؛ ابراہیم علیہ السلام کے وہ بیٹے ہیں کہ جن کی نسل سے ایک ہی نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔

تو حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسل سے بہت سارے انبیاء آئے ہیں جبکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے صرف حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں۔ آپ نے کئی بار سنا ہے کہ حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو بنو اسرائیل کہتے ہیں۔ ”اسرائیل“ یہ دو لفظ ہیں؛ ایک ”اسرا“ اور دوسرا ”ئیل“۔ اسرا کا معنی ہوتا ہے عبد اور ”ئیل“ کا معنی ہوتا ہے اللہ۔ تو اسرائیل کا معنی ہے عبد اللہ، یہ

حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب تھا۔ نام آپ کا یعقوب تھا اور لقب آپ کا اسرائیل تھا یعنی عبد اللہ۔ ان کے پھر بارہ بیٹے تھے جن میں بڑے کا نام یہودا اور سب سے چھوٹے کا نام بنیامین تھا۔ دو بیویاں تھیں۔ ایک سے دس بیٹے تھے اور دوسری سے بنیامین اور یوسف علیہ السلام دو بیٹے تھے۔

اب حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد تھی ان کا لقب تھا "بنو اسرائیل" اسرائیل کا معنی تو ہے عبد اللہ اور ابن کی عربی میں جمع "بنون" آتی ہے۔ تو بنو اسرائیل کا معنی ہے یعقوب علیہ السلام کی اولاد۔ تو یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے بہت سے نبی آئے ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام قوم جرہم کے نبی تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ ہجرت کر کے مکہ مکرمہ گئے تو اپنی بیوی ہاجرہ اور بیٹے اسماعیل کو وہاں چھوڑا۔ وہاں پر کھانے کا انتظام بھی نہیں تھا۔ تو جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی برکت سے اللہ نے زم زم کا چشمہ جاری کیا تو پانی کا انتظام بھی ہو گیا جس کی وجہ سے آبادی شروع ہو گئی اور قافلے آنا شروع ہو گئے۔ جہاں پانی ہو وہاں آبادیاں ہوتی ہیں۔ آبادیوں کے لیے پانی شرط ہے ورنہ آبادی ہوتی ہی نہیں ہے۔ وہ قبیلہ جو آباد ہوا وہ قبیلہ جرہم تھا۔ اسماعیل علیہ السلام اس قبیلے کے نبی تھے۔

اسماعیل علیہ السلام کی شریعت حضرت ابراہیم علیہ السلام والی تھی۔ اب ابراہیم علیہ السلام قبیلہ جرہم کے نبی نہیں ہیں لیکن شریعت حضرت ابراہیم علیہ السلام والی تھی۔ اب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جو شریعت ہے وہ نئی شریعت نہیں بلکہ پرانی شریعت ہے لیکن جس قوم کے لیے یہ آئی اس کے پاس ابراہیم علیہ السلام کی شریعت نہیں آئی۔ تو اگرچہ شریعت پرانی تھی مگر ان لوگوں کے لیے نئی تھی۔ اس لیے اسماعیل علیہ السلام بھی رسول ہیں۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ رسول اسے کہتے ہیں جو نئی شریعت لے کر آئے

اور نبی اسے کہتے ہیں جو خواہ نئی شریعت لے کر آئے یا پرانی شریعت کے مطابق چلے۔ اب ہم یہ کہیں گے کہ ایک نبی ہے اور ایک رسول ہے، نبی عام ہوتا ہے اور رسول خاص ہوتا ہے، نبی ہر صاحبِ وحی کو کہتے ہیں اور رسول ہر صاحبِ وحی کو نہیں کہتے، رسول اسے کہتے ہیں جس پر وحی بھی آئے اور مستقل نئی شریعت بھی آئے۔

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی بھی تھے اور رسول بھی تھے۔ نبی تھے کہ ان کے پاس اللہ کی وحی آتی تھی اور رسول بھی تھے کہ ان پر اللہ نے تورات کو نازل کیا تھا۔ میں نے صرف یہ بات سمجھائی ہے کہ نبی اور رسول کا معنی کیا ہے۔

رسول کا لغوی معنی:

اس سے ایک چھوٹی سی بات اور سمجھیں۔ میں چھوٹی چھوٹی باتیں آپ کو سمجھاتا ہوں۔ اگر وہ آپ کو سمجھ آ جائیں تو اس سے عقائد درست ہوتے ہیں، نظریات ٹھیک ہوتے ہیں، کل کو الجھن اور پریشانی نہیں ہوتی۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ نبی اور رسول کا یہ معنی ہے یہ شریعت کی مخصوص اصطلاح ہے ورنہ عربی لغت میں رسول کا معنی صرف ''قاصد'' ہے، نبی بھی رسول ہے اور غیر نبی بھی رسول ہے۔ عربی زبان میں معنی یہ ہے کہ میں کسی کو کوئی پیغام دے کر کسی کے پاس بھیجتا ہوں تو یہ میرے رسول ہیں، ہم اسے قاصد کہتے ہیں اور عربی میں اسی قاصد کو ''رسول'' کہتے ہیں۔ نبی اللہ کا رسول ہے، اللہ کا قاصد ہے، اللہ کا نمائندہ ہے، اللہ کا سفیر ہے۔

میں یہ بات سمجھا رہا ہوں کہ جہاں بھی قرآن میں لفظ رسول آئے تو اس رسول کا معنی یہ نہ سمجھنا کہ اس پر وحی آ رہی ہے، کبھی قرآن رسول کا لفظ اصطلاحی معنی میں استعمال کرتا ہے جسے ہم پیغمبر کہتے ہیں اور کبھی قرآن رسول کا لفظ اصطلاحی معنی میں استعمال نہیں کرتا بلکہ عربی زبان کا معنی استعمال کرتا ہے جس کا معنی صرف پیغام لانے والا اور نمائندہ ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿اَللّٰهُ يَصۡطَفِىۡ مِنَ الۡمَلٰٓـئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ﴾ [131]

اللہ پاک فرشتوں میں سے بھی رسول بناتے ہیں اور انسانوں میں سے بھی بناتے ہیں۔

بتاؤ! کبھی کوئی فرشتہ نبی ہوا ہے؟ (نہیں۔ سامعین) تو جب فرشتہ نبی نہیں ہے تو رسول کیسے ہو گا؟ لیکن قرآن کہہ رہا ہے کہ ہم رسول بناتے ہیں فرشتوں میں سے بھی اور انسانوں میں سے بھی۔ اب جب آپ یہ بات سمجھ لیں گے کہ "رسول" کا معنی عربی لغت میں قاصد ہے تو کوئی بندہ آپ کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ تو ایک ہے رسول کا شریعت کی اصطلاح میں معنی جسے ہم پیغمبر کہتے ہیں وہ رسول صرف انسان ہوتا ہے اور ایک ہے رسول کا عربی زبان میں معنی جس کا معنی قاصد ہے وہ انسان بھی ہوتا ہے اور وہ اللہ کا فرشتہ بھی ہوتا ہے۔ تو رسول کے دو معنی الگ الگ ذہن میں رکھ لیں۔

نبی نمائندہ خدا اور صحابی نمائندہ مصطفیٰ

اللہ نے قرآن کریم میں فرشتے کو بھی رسول کہا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو بھی رسول کہا ہے۔ صحابہ کے لیے بھی لفظ رسول آیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے چلے عمرہ ادا کرنے کے لیے تو کفارِ مکہ نے حدیبیہ کے مقام پر روک لیا۔ وہ واقعہ آپ نے سنا ہو گا صلح حدیبیہ والا، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مذاکرات کے لیے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو مکہ مکرمہ بھیجا۔ کفارِ مکہ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو گرفتار کر لیا اور مشہور کر دیا کہ ہم نے ان کو قتل کر دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے بیعت لی کہ ہم

131۔ الحج 75:22

عثمان کا بدلہ لیں گے، بدلہ لیے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ اب اس کے لیے جو لفظ جامع ترمذی میں آیا ہے وہ ہے:

"كَانَ عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ رَسُوْلَ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلٰى أَهْلِ مَكَّةَ." [132]

یہاں لفظ "رسول" دو بار آیا ہے، موٹی موٹی عربی تو سب سمجھتے ہیں نا؟ یہاں لفظ "رسول اللہ" سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور پہلے لفظ رسول سے مراد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان بن عفان مکہ میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول تھے، حضور پاک رسولِ خدا ہیں اور حضرت عثمان رسولِ مصطفی ہیں۔ تو یہاں رسول کا معنی ہے قاصد اور نمائندہ۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ نبی نمائندۂ خدا ہوتا ہے اور صحابی نمائندۂ مصطفیٰ ہوتا ہے۔

جتنے نمائندے میرے اُتنے نمائندے آپ کے:

ایک بات آپ نے سنی ہوئی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد بھی ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ دونوں کی تعداد سوا لاکھ کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی؛ نمائندۂ خدا ہوتا ہے اور صحابی؛ نمائندۂ مصطفیٰ ہوتا ہے۔ اللہ نے اپنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ میرے محمد! یہ آپ کا اعزاز ہے کہ جتنے نمائندے میرے ہیں اتنے نمائندے آپ کے ہیں، میری بات جن سے سمجھ آتی ہے وہ نمائندۂ خدا ہیں اور جن سے آپ کی بات سمجھ آتی ہے وہ نمائندۂ مصطفیٰ ہیں، اِن پہ نمائندگی میری ختم اُن پہ نمائندگی آپ کی

132۔ سنن الترمذی، رقم:3702

ختم، آپ کے بعد اگر کوئی نمائندۂ خدا ہونے کا دعوی کرے وہ بھی بے ایمان ہے اوراُن کے بعد کوئی نمائندۂ مصطفیٰ ہونے کا دعوٰی کرے تو وہ بھی بے ایمان ہے، حضور آئے ہیں نبوت ختم ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم گئے ہیں صحابیت ختم ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

تو میں نبی اور رسول کا معنی سمجھا رہا تھا کہ رسول مستقل شریعت والا ہوتا ہے اور نبی صاحبِ وحی ہوتا ہے خواہ مستقل شریعت ہو یا پچھلے رسول کی شریعت کو لے کر چلے۔ تو موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں چونکہ اللہ نے دونوں لفظ استعمال فرمائے ہیں اس لیے میں نے دونوں لفظوں کا معنی بتا دیا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام سے خطابِ خداوندی:

﴿وَ نَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿۵۲﴾﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے دائیں جانب کوہِ طور تھا وہاں سے ہم نے انہیں آواز دی۔

یہ دائیں جانب کس کی ہے، بس اس بات کو سمجھیں۔ میں وہ باتیں بتاتا رہتا ہوں جو آپ نے سنی ہوں گی لیکن آپ کے ذہن میں نہیں ہوتیں۔ میں وہ آپ کو سمجھا دیتا ہوں تاکہ الجھنیں پیدا نہ ہوں۔ پہاڑ کی نہ دائیں جانب ہوتی ہے نہ بائیں جانب ہوتی ہے، پہاڑ تو برابر ہوتا ہے تو یہ دائیں جانب کس کی ہے؟ علامہ نسفی نے تفسیر مدارک میں لکھا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جب مدین سے چلے اور مصر جا رہے تھے تو راستے میں پہاڑ طورِ سینا ہے اور یہ موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب ہے۔ تو طورِ سینا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب تھا اور وہاں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہوئے۔ موسیٰ علیہ السلام سے اللہ کے ہم کلام ہونے کا تفصیلی واقعہ آگے ہم عرض کریں گے ان شاء اللہ۔

منصور حلاج کے نعرۂ انا الحق کی توجیہہ:

آج صرف ایک بات سمجھ لیں۔ ہماری تاریخ میں ایک بزرگ گزرے ہیں جنہیں منصور حلاج کہتے ہیں اور وہ کہتے تھے "انا الحق... انا الحق... انا الحق..." اس وقت علماء نے فتویٰ دیا کہ ان کو قتل کرو، "حق" اللہ کی ذات ہے... لیکن ہمارے مشائخ کہتے ہیں کہ وہ ولی تھے، ہم ان کے بارے میں یہ کلمہ نہیں کہتے ہیں کہ وہ کافر تھے۔ جن کو اشکال تھا وہ اس بات پر تھا کہ "حق" تو اللہ کی ذات ہے اور یہ کہتے ہیں "انا الحق" تو گویا یہ کفر کہہ رہے ہیں، خود کو العیاذ باللہ اللہ کہہ رہے ہیں۔

جو حضرات کہتے ہیں کہ یہ کفر نہیں تھا یہ اسلام تھا ان کی دلیل یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو جو آواز آئی اللہ کی طرف سے وہ یوں آئی کہ طورِ سینا پر درخت تھا اور درخت کے پتے سے آواز آئی: ﴿إِنَّنِيٓ أَنَا ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّآ أَنَا۠ فَٱعۡبُدۡنِي﴾[133] کہ میں خدا ہوں، میرے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے، میری عبادت کرو۔

ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ تجلیاتِ الٰہی کوہِ طور کے درخت پر پڑیں تو پتا بولا، ادھر منصور کی ذات پر پڑیں تو منصور کی ذات بولی اور یہ الفاظ استعمال ہوئے۔ منصور کا دعویٰ یہ نہیں تھا کہ میں حق ہوں۔ ان کی زبان سے الٰہی آواز تھی کہ میں حق ہوں۔ یہ اب کفر تو نہیں رہتا لیکن اتنی باریکی سمجھنا ہر بندے کے بس کی بات نہیں ہے اور جب یہ باریک باتیں سمجھ میں نہیں آتیں تو پھر ہم فتویٰ بہت زیادہ دیتے ہیں حالانکہ فتویٰ کی زیادہ ضرورت نہیں ہے بلکہ امت کو سمجھانے کی زیادہ ضرورت ہے۔

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کے مرید تھے اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی

133۔ طٰہٰ 14:20

بہت بڑے آدمی ہیں۔ حکیم الامت اشرف علی تھانوی فرماتے تھے: اگر میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ کا مرید نہ ہوتا تو میں فتوے باز مولوی بنتا، میں بچا اس لیے ہوں کہ میری لگام کسی پیر کے ہاتھ میں تھی۔

بیعت کی ضرورت واہمیت:

میں اس لیے کہتا ہوں کہ عالم جتنا بڑا ہو اس کے لیے مرید بننا اتنا ہی ضروری ہے، جتنا بڑا ڈاکٹر ہو اس کے لیے مرید ہونا اتنا ہی زیادہ ضروری ہے، تبلیغ میں جتنا زیادہ وقت لگاتا ہو اس کے لیے پیر کا ہونا بھی اتنا ہی زیادہ ضروری ہے۔ میں یہ باتیں کھل کر اس لیے کہتا ہوں کہ ہمارے ہاں جو آدمی ڈاڑھی منڈاتا ہو، نماز نہ پڑھتا ہو تو لوگ اسے کہتے ہیں کہ کسی پیر صاحب سے بیعت کر لے تو نیک ہو جائے گا اور نیک کو کوئی نہیں کہے گا کہ تو بیعت ہو جا۔ میں کہتا ہوں کہ بے نمازی کے لیے مرید بننا اتنا ضروری نہیں ہے جتنا نمازی کے لیے ضروری ہے۔

شاید آپ کو میری بات اتنی جلدی سمجھ میں نہ آئے، میں اس لیے کہتا ہوں کہ اس بات کو اچھی طرح سمجھیں۔ نیک آدمی کا مرید ہونا زیادہ ضروری ہے، جس آدمی میں شریعت کا شوق نہیں ہے تو اس میں بلاشبہ شوق پیدا کرنے کی ضرورت ہے لیکن جس میں شریعت کا شوق موجود ہے تو ضرورت ہے کہ اس کو شریعت سمجھاؤ! بسا اوقات آدمی شریعت سمجھا ہوا نہیں ہوتا اور کبھی سمجھتا ہے لیکن عمل نہیں کرتا۔ تو دونوں چیزیں ضروری ہیں۔

میں اس کی ایک مثال دے کر بات سمجھاتا ہوں۔ اگر گھوڑا طاقت ور ہو خوراک اس کی اچھی ہو تو گھوڑا جتنا طاقت ور ہو اتنا ہی اس کا کوچوان اچھا ہونا چاہیے۔ گھوڑا مضبوط ہو اور اس کی لگام کسی کے ہاتھ میں نہ ہو وہ خود بھی مرتا ہے اور ساری سواریوں کو بھی مارتا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ جب گھوڑا طاقت ور ہے تو اب لگام کی کیا

ضرورت ہے؟ مجھے آپ بتائیں! گھوڑا کمزور ہو اور لگام کسی کمزور کے ہاتھ میں ہو تو کام چل جاتا ہے اور اگر گھوڑا مضبوط ہو اور لگام کسی کمزور بندے کے ہاتھ میں ہو تو برباد ہوتا ہے کہ نہیں؟ (برباد ہوتا ہے۔ سامعین) تو آدمی جتنا زیادہ دین پر عمل کرے تو یہ مضبوط گھوڑا ہے، اس کی لگام کسی مضبوط آدمی کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ میں بعض باتیں کہتا ہوں لیکن اتنی جلدی وہ لوگوں کو سمجھ نہیں آتیں، تھوڑی دیر لگتی ہے۔

فساد کی وجہ:

میں اپنے مشاہدے کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ ہماری مساجد میں زیادہ تر فساد بے نمازیوں کی وجہ سے نہیں ہوتے بلکہ مسجد میں نماز پڑھنے والوں کی وجہ سے ہوتے ہیں، بے نمازی آکر لڑتے ہیں یا نمازی لڑتے ہیں؟ (نمازی لڑتے ہیں۔ سامعین) امام کے خلاف فساد نمازی کرتے ہیں یا بے نمازی کرتے ہیں؟ (بے نمازی۔ سامعین) تو اصلاح کس کی زیادہ ضروری ہے؟ (نمازیوں کی۔ سامعین) لیکن پھر آپ کہتے ہیں کہ مولانا صاحب! بے نمازیوں کو بیعت کرو، فساد آپ کرتے ہیں اور بیعت بے نمازیوں کی کرواتے ہیں۔ ہم دین دار ہیں، ہم ٹھیک ہیں تو لوگ مزید جلدی ٹھیک ہو سکتے ہیں، میں ٹھیک نہ ہوا تو میرا گاؤں جلدی ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ میرا ٹھیک ہونا میری عوام کے ٹھیک ہونے سے زیادہ ضروری ہے، میرے عقیدے کا ٹھیک ہونا میرے مقتدی کے عقیدے کے ٹھیک ہونے سے زیادہ ضروری ہے، میرے عمل کا ٹھیک ہونا میرے مقتدیوں کے عمل کے ٹھیک ہونے سے زیادہ ضروری ہے۔

بیعت کی تین اقسام:

حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تین طرح کی بیعت ہوتی تھی؛ ایک بیعت علی الایمان کہ بندہ پہلے کافر تھا، بیعت کرتا اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتا۔ دوسری بیعت علی الموت اور

بیعت علی الجہاد تھی جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر حدیبیہ کے مقام پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بیعت کی تھی کہ حضور! ہم مر جائیں گے لیکن عثمان غنی کا انتقام لیے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ تیسری بیعت تھی علی ارکان الاسلام کہ اللہ کے نبی! ہم شریعت پر عمل کریں گے۔

اب بات سمجھنا! یہ بیعت علی ارکان الاسلام کون کر رہے ہیں، جو پہلے ایمان لا چکے تھے، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے تھے، انہیں صحابہ کہتے ہیں رضی اللہ عنہم، اب یہ مزید بیعت کر رہے ہیں کہ ہم شریعت پر عمل کریں گے، صحابی سے زیادہ کوئی نیک ہو سکتا ہے؟ نہیں، تو صحابی بھی سمجھتا ہے کہ بیعت کی ضرورت ہے۔ تو آپ کو ضرورت کیوں نہیں ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ مجھے ضرورت نہیں ہے کیونکہ میرے چہرے پر تو ڈاڑھی پہلے سے ہے، میں تو نماز پہلے سے پڑھتا ہوں۔

اس لیے ہمارا تو معمول ہے کہ ہم تو اپنا ہاتھ شیخ کے ہاتھ میں دیتے ہیں، جہاں پھنستے ہیں وہاں پوچھتے ہیں، اصلاحی خط بھی لکھتے ہیں، اپنے گناہ کی اصلاح کے لیے شیخ سے پوچھتے بھی ہیں۔ اللہ ہم سب کو توفیق عطا فرمائیں۔

میں نے آپ سے کہا تھا کہ ایک ایک لفظ پر اگر ایسے نکتے بیان کرتے جائیں تو آپ اندازہ فرمائیں کہ کتنے سالوں میں قرآن ختم ہو گا۔

حضرت ادریس علیہ السلام کا تذکرہ:

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿٥٦﴾﴾

ایک نبی حضرت ادریس علیہ السلام ہیں، ان کا تذکرہ آگے قرآن کریم میں تفصیل کے ساتھ شاید نہ ہو سکے تو خلاصہ ذہن میں رکھ لیں۔ حضرت ادریس علیہ السلام کی بعض خصوصیات ہیں جو مفسرین حضرات نے ذکر کی ہیں۔ ان کے بارے میں

ہے "وَهُوَ أَوَّلُ مَنْ خَطَّ بِالْقَلَمِ" کہ آپ پہلا وہ شخص ہیں جنہوں نے قلم سے لکھنا شروع کیا، "وَ أَوَّلُ مَنْ خَاطَ الثِّيَابَ وَلَبِسَ الْمَخِيْطَ" آپ پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے کپڑا سی کر لباس پہنا ہے، آپ سے پہلے لوگ جانوروں کے چمڑے کا لباس پہنتے تھے، "وَهُوَ أَوَّلُ مَنِ اتَّخَذَ السِّلَاحَ وَقَاتَلَ الْكُفَّارَ" آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسلحہ بنایا اور کفار سے جہاد کیا، "وَ أَوَّلُ مَنْ نَظَرَ فِيْ عِلْمِ الْحِسَابِ" آپ ہی پہلے شخص ہیں کہ جو حساب کتاب میں ماہر تھے۔ یہ ادریس علیہ السلام ہیں۔[134]

اب یوں سمجھو کہ آج دنیا جتنی بھی ترقی کر رہی ہے اس ترقی کے بانی حضرت ادریس علیہ السلام ہیں، یہ مسلمان ہیں اور کوئی نہیں ہے۔ ہم نے چھوڑ دیا تو کسی اور نے لے لیا۔ وراثت ہماری ہے لیکن اوروں نے لے لی ہے۔ اس لیے مادیات میں ترقی کرنا شریعت کے خلاف نہیں ہے۔ ہاں ترقی کرتے ہوئے شریعت کو چھوڑ دینا یہ شریعت کے خلاف ہے۔ دائرۂ شریعت میں رہ کر ترقی کریں تو کون ہے جو مسلمان کا مقابلہ کر سکے، کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ اللہ ہمیں یہ میراث حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

انبیاء علیہم السلام اور خشیتِ الٰہیہ:

میں بات سمیٹتا ہوں۔ اللہ رب العزت نے سورت کے شروع میں حضرت زکریا علیہ السلام کا تذکرہ کیا، حضرت یحییٰ علیہ السلام کا تذکرہ کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ کیا، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ کیا، حضرت ادریس علیہ السلام کا تذکرہ کیا، پھر حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ کیا۔ آخر میں فرماتے ہیں کہ یہ سب لوگ وہ تھے کہ جب ان کے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی تھیں تو یہ سجدہ بھی کرتے تھے، روتے بھی تھے اور گڑگڑاتے بھی تھے۔ یہ انبیاء علیہم السلام کا معمول تھا۔

134۔ تفسیر الخازن: ج3 ص238

نالائق جانشین کی بیماریاں:

﴿فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿٥٩﴾﴾

انبیاء علیہم السلام تو بڑے تھے ان کی اولاد بھی نیک تھی لیکن ایک وقت آیا کہ ان کے بعد نالائق قسم کے جانشین پیدا ہوئے، انہوں نے سب سے پہلے کام یہ کیا کہ نمازیں برباد کیں اور دوسرا کام شہوات اور خواہشات کے اندر پڑے۔ معلوم ہوا کہ جو نالائق قسم کے جانشین ہوتے ہیں ان کی دو بیماریاں ہیں:

1: نماز میں کوتاہی کرتے ہیں۔

2: ناجائز خواہشات کو پورا کرتے ہیں۔

جائز خواہش پر عمل کرنا گناہ نہیں ہے البتہ ناجائز خواہش پر عمل کرنا گناہ ہے اور جائز خواہش میں اتنا مبتلا ہونا کہ آدمی اگلے جائز کے بھی قابل نہ رہے تو پھر جائز خواہشات کو کنٹرول کرنا چاہیے کہ آدمی اتنا آگے نہ نکل جائے۔

"خَلَف" اور "خَلْف" میں فرق:

یہاں عربی زبان کے دو لفظ سمجھ لیں۔ ایک لفظ "خَلَف" ہے اور ایک لفظ "خَلْف" ہے۔ عربی کتنی عجیب زبان ہے۔ اگر خلَف پڑھیں لام کے زبر کے ساتھ تو اس کا معنی ہے لائق جانشین اور اگر خَلْف پڑھیں لام کے سکون کے ساتھ تو اس کا معنی ہے نالائق جانشین۔ لفظ کی حرکت کے بدلنے سے معنی بدل جاتا ہے۔

یہاں قرآن کہتا ہے "فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ" لام کے سکون کے ساتھ ہے، اللہ فرماتے ہیں کہ جانشین نالائق ہو گئے تھے، انہوں نے نمازیں بھی برباد کیں اور خود خواہشات میں بھی پڑ گئے تھے۔

اللہ تعالیٰ کی ترتیب ہے کہ پہلے لائق کا ذکر کرتے ہیں، پھر نالائق کا ذکر کرتے ہیں، نیک کام کا ذکر کرتے ہیں پھر برے کام کا ذکر کرتے ہیں، جنت کا کرتے ہیں پھر جہنم کا کرتے ہیں۔

توبہ کا دروازہ کھلا ہے:

﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓىِٕكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَ لَا یُظْلَمُوْنَ شَیْــٴًـا ﴿٦٠﴾ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِیْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَیْبِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِیًّا ﴿٦١﴾﴾

یہاں اللہ نے جنت کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ نالائق جانشین ہیں اور اللہ کا نظام دیکھیں۔ فرمایا: بندہ نالائق ہو، مجرم ہو، گناہ گار ہو میں اللہ پھر بھی دروازے کھلے رکھتا ہوں اور وہ کھلا دروازہ یہ ہے کہ یہ نالائق توبہ کریں، نیک عمل کریں تو میں انہیں پھر جنت میں بھیج دوں گا۔

اللہ رب العزت ہم نالائقوں کے لیے بھی راستے رکھتے ہیں، ہمارے لیے ہمیشہ گنجائش رہتی ہے۔

اللہ کے نام اور صفات جیسا کوئی نہیں!

﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَ اصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ؕ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِیًّا ﴿٦٥﴾﴾

آگے عام بندوں کو خطاب کیا ہے کہ اللہ آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے ان سب کا رب ہے، اللہ کی عبادت میں جمے رہو۔

ایک جملہ یہ ارشاد فرمایا: "هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِیًّا" اللہ کو چھوڑ کر تم اوروں کی عبادت کرتے ہو! کیا تم نے خدا جیسا کوئی دنیا میں سنا ہے یا دیکھا ہے؟

یہاں "سَمِيًّا" کے دو معنی ہیں:

[۱]: ایک معنی یہ ہے کہ جو صفت اللہ کی ہو وہ صفت کسی اور کی ہو۔ یعنی صفات میں اللہ جیسا تم نے کسی کو دیکھا ہے یا سنا ہے؟

[۲]: اور ایک معنی یہ ہے کہ جس طرح اللہ کا نام ہے اسی طرح کسی معبود باطل کا نام اللہ ہو ایسا نہیں۔ بعض علماء نے عجیب بات یہ لکھی ہے یہ "سَمِيًّا" اسم سے ہے اور اسم کا معنی نام ہوتا ہے۔ اللہ پاک کا نظام عجیب دیکھیں کہ دنیا میں لوگوں نے جتنے غلط، ناجائز اور باطل خدا بنائے ہوئے تھے ہر خدا کا کوئی نام بھی رکھا لیکن آج تک کسی باطل کا نام "اللہ" نہیں رکھا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "هَلۡ تَعۡلَمُ لَهٗ سَمِيًّا" کہ کیا تم نے کبھی سنا ہے کہ معبود باطل بھی ہو اور نام اللہ بھی ہو؟ نہیں سنا۔ تو یہ دنیا میں ایک ہی ہے جس کا نام اللہ ہے۔ نہ کوئی اللہ کے نام جیسا ہے، نہ کوئی اللہ کی صفات جیسا ہے، اللہ پاک کا نام بھی جدا ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات بھی جدا ہیں۔

بعث بعد الموت برحق ہے:

﴿وَ يَقُوۡلُ الۡاِنۡسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوۡفَ اُخۡرَجُ حَيًّا ﴿۶۶﴾ اَوَ لَا يَذۡكُرُ الۡاِنۡسَانُ اَنَّا خَلَقۡنٰهُ مِنۡ قَبۡلُ وَلَمۡ يَكُ شَيۡـًٔا ﴿۶۷﴾﴾

اگلی بات اللہ پاک نے یہ بھی فرمائی ہے کہ تعجب اس بات پر ہے کہ بندہ پھر بھی کہتا ہے کہ اگر میں مر گیا تو کیا میں دوبارہ زندہ ہوں گا؟ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بھول گیا ہے کہ ہم نے اس کو پیدا کیا جب یہ کچھ بھی نہیں تھا، جب کچھ ہے تو پھر دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہے؟ اللہ تو "بدیع السماوات والارض" ذات ہے۔ بدیع کہتے ہیں کہ جس کے پاس کوئی ماڈل نہ ہو پھر بنائے۔ اگر کوئی ماڈل پہلے سے موجود ہو تو پھر بنانا آسان ہوتا ہے۔ اللہ فرماتے ہیں کہ تم کچھ نہ تھے ہم نے پھر بنا دیا، اب ان کو تعجب ہوتا ہے کہ اللہ

ہمیں دوبارہ کیسے بنائے گا؟

﴿فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿٦٨﴾﴾

فرمایا: تم سن لو کہ ہم تمہیں بھی اٹھائیں گے اور شیطان کو بھی اٹھائیں گے۔ قیامت کے دن وہ بھی آئے گا، قیامت کے دن تم بھی آؤ گے، سارے انسان چاہے وہ نیک ہیں یا برے ہیں یہ سب کے سب قیامت کے دن آئیں گے، اور یہاں اللہ نے اپنا فیصلہ فرما دیا ہے کہ تم یاد رکھ لو، برا ہو یا اچھا ﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾ اللہ کا وعدہ ہے کہ ہر بندے نے جہنم کے اوپر سے گزرنا ہے، میدان محشر اور جنت کے درمیان جہنم ہے، ہاں فرق اتنا ہو گا کہ کوئی ایسے گزرے گا جس طرح ابراہیم علیہ السلام نمرود کی آگ سے گزرے اور کوئی اس میں گرے گا اپنے گناہوں کی سزا بھگتے گا اور پھر جنت میں جائے گا اور کوئی ایسے گزرے گا کہ گرے گا پھر وہیں رہ جائے گا اور جنت میں جانے کی اس کو توفیق نہیں ہو گی۔

پل صراط سے گزرنے والوں کی تین اقسام:

اب یوں سمجھو کہ تین قسم کے لوگ ہوں گے:

[۱]: بعض لوگ ایسے ہوں گے کہ جنہوں نے جہنم سے گزرنا ہے اپنے اعمال کے حساب سے۔ کوئی بہت زیادہ رفتار سے، کوئی آہستہ، لیکن گزرنا ضرور ہے۔ لیکن جو صلحاء ہوں گے وہ جہنم کے اوپر سے گزر رہے ہوں گے تو ٹھنڈک محسوس کریں گے اور جہنم کی گرمی انہیں محسوس تک نہیں ہو گی۔ صرف جہنم کا مشاہدہ کر کے جانا ہے۔

[۲]: اور جو مسلمان ہیں اور فاسق ہیں وہ جہنم میں جائیں گے، وہاں کچھ عرصہ رہیں گے اور نکل جائیں گے۔ اللہ ہمیں کچھ عرصے کے لیے جانے سے بھی محفوظ فرمائے۔

[۳]: کافر جہنم میں جائیں گے اور ہمیشہ کے لیے جائیں گے اور پھر کبھی بھی اس

جہنم سے نکل نہیں سکیں گے۔

ایمان کی قدر کیجیے!

اللہ کی قسم ایمان جیسا بھی ہو بہت بڑی نعمت ہے، مسلمان جیسا بھی ہو دنیا کے اربوں کافروں سے اچھا ہے، کبھی بھی کافر کو مسلمان سے اچھا نہ کہنا! قیامت کے دن جب کافر جہنم میں جائیں گے تو ایک وقت آئے گا کہ مسلمان فاسق بھی جہنم میں اور کافر بھی جہنم میں ہوں گے۔ کافر مسلمانوں کو یہ طعنہ دیں گے کہ تم ہمیں کہتے تھے کہ تم کافر ہو اس لیے جہنم میں جلو گے لیکن یہاں جہنم میں تو تم بھی پڑے ہو، تمہارے کلمہ کا تمہیں کیا فائدہ ہوا؟ اس وقت اللہ کی غیرت کو جوش آئے گا، اللہ فرشتے کو حکم دیں گے کہ جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان موجود ہو گا اس کو جہنم سے نکال کر جنت میں لے آؤ۔ قرآن کہتا ہے: ﴿رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ ۝﴾[135] اس وقت کافر کہیں گے کہ اے کاش! ہم بھی دنیا میں مسلمان ہوتے، لیکن آج کاش کہنے سے کچھ نہیں بنے گا۔ دنیا میں انسان کلمہ پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے اور جو شخص مسلمان ہو -میں اکثر کہا کرتا ہوں- کہ اس کی حوصلہ شکنی نہ کیا کرو، اس کی حوصلہ افزائی کرو، مسلمان جیسا بھی ہو اس کو سینے سے لگاؤ، اس کو دور نہ کرو، مسلمانوں کی کمزوریوں پر پردہ ڈالو، کمزوریوں کو ظاہر نہ کرو، کوئی عیب نظر آ جائے تو اس کو چھپانے کی کوشش کرو اور اپنے بارے میں ذہن بناؤ کہ اس کا ایک عیب مجھے پتا چلا ہے لیکن میرے دس ہیں جو اللہ نے چھپا کر رکھے ہیں۔ اگر میرے عیب کھل گئے تو بتاؤ میرا کیا بنے گا؟ یہ بات ہمیں ضرور سوچنی چاہیے۔ اللہ ہمیں بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

135۔ الحجر 2:15

مسلمان اور کافر کے جہنم میں جانے میں فرق:

ایک چھوٹی سی بات سمجھ لیں کہ جہنم میں کافر بھی جائے گا اور اگر مسلمان فاسق ہو تو وہ بھی جائے گا۔ تو دونوں میں کیا فرق ہے؟ فرق یہ ہے کہ کافر کو اللہ جہنم کا میں بھیجیں گے ذلیل کرنے کے لیے اور مسلمان کو اللہ بھیجیں گے لیکن پاک کرنے کے لیے۔ ذلیل کرنا اور ہے اور پاک کرنا اور ہے۔ یہ جو اس پر گناہوں کی نجاست تھی یہ توبہ کرکے اس کو پاک نہیں کرسکا تو اس کے لیے خدا نے جہنم کی آگ رکھی ہے کہ اس سے پاک کرکے پھر جنت میں بھیج دیں گے۔ لیکن کفر کی نجاست ایسی ہے کہ وہ جہنم کی آگ سے بھی پاک نہیں ہوگی۔

تو میں سمجھا یہ رہا تھا کہ جہنم میں تو فاسق مؤمن بھی جائے گا لیکن وہ پاک ہو گا تو نکل جائے گا اور کافر نے جو منہ سے کفر کی نجاست نکالی ہے یہ اتنی گندی نجاست ہے کہ اس کو پوری جہنم بھی پاک نہیں کرسکتی۔ عام طور پر اگر نجاست آگ میں گرے تو آگ نجاست کو ختم کردیتی ہے لیکن کفر اور شرک ایسی نجاست ہے کہ اس کو جہنم کی آگ بھی پاک نہیں کرسکتی۔ یہ ناپاک اسی میں پڑا رہے گا۔ مسلمان جیسا بھی ہے یہ پھر بھی مسلمان ہے، اس نے ان شاء اللہ جنت میں جانا ہے۔ اللہ ہم سب کو جنت میں لے جائیں۔

شرک کی قباحت:

آگے اللہ رب العزت نے فرمایا کہ بعض لوگ شرک کرتے ہیں اور شرک اتنا بڑا جرم ہے کہ ﴿تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝٩٠ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝٩١﴾ جب یہ مشرک اپنی زبان سے خدا کے لیے بیٹا کہتا ہے، خدا کی بیٹیاں کہتا ہے، خدا کے ساتھ شرک کرتا ہے تو آسمان پھٹنے

لگتا ہے، زمین ٹوٹنے لگتی ہے، پہاڑ گرنے لگتے ہیں میں اللہ ان کو تھام لیتا ہوں۔

اور کمال یہ ہے کہ مشرک ایک مرتبہ کہتا ہے کہ اللہ! میری توبہ، میں اب شرک نہیں کروں گا تو اللہ سب صاف فرما دیتے ہیں۔ جرم اتنا بڑا ہے اور عنایت اتنی بڑی ہے تو بندہ سوچ سکتا ہے! بس ہمارے آنے کی دیر ہے، اللہ کے ہاں معافی میں کوئی دیر نہیں ہے۔

اہلِ ایمان کے لیے محبوبیت عامہ:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا ﴿٩٦﴾﴾

جو آدمی ایمان لائے، عقیدہ اس کا ٹھیک ہو، اعمال سنت کے مطابق ہوں تو اللہ اس کے لیے محبت کی ہوائیں چلا دیتے ہیں۔ میں اس سے آسان اور عام فہم ترجمہ نہیں کر سکتا۔ حدیث پاک میں ہے کہ جب اللہ اس سے پیار کرتے ہیں تو جبرائیل امین علیہ السلام سے فرماتے ہیں کہ فلاں بندے سے مجھے بہت پیار ہے، جبرائیل فرشتوں سے کہتے ہیں کہ اللہ کو اس بندے سے بہت پیار ہے۔ فرشتے آگے اعلان کرتے ہیں۔ وہ اعلان چلتے چلتے زمین والوں تک آتا ہے۔ پھر اس نیک بندے سے سارے زمین والے پیار کرتے ہیں۔

اور حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعا بھی مانگی ہے- ہمیں بھی چاہیے کہ ہم بھی اس دعا کو مانگا کریں، عربی یاد نہ ہو سکے تو اردو ترجمہ سے مانگیں، اردو میں بھی نہ ہو سکے تو پنجابی میں مانگ لیا کریں، وہ دعا یہ ہے:

"اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ شَكُوْرًا وَاجْعَلْنِيْ صَبُوْرًا وَاجْعَلْنِيْ فِيْ عَيْنِيْ صَغِيْرًا وَفِيْ أَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيْرًا." [136]

136۔ جامع الاحادیث للسیوطی: ج6 ص103 رقم الحدیث 4801

اے اللہ! مجھے اپنی نعمتوں پر شکر کرنے والا بنا دے، اے اللہ! مجھے صبر کرنے والا بنا دے، مجھے میری آنکھ میں چھوٹا کر دے اور لوگوں کی آنکھ میں بڑا کر دے۔ بندہ خود کو بڑا سمجھے تو یہ جرم ہے اور خود کو چھوٹا سمجھے اور دوسرے اس کو بڑا سمجھیں تو یہ اللہ کی نعمت ہے۔ اللہ ہم سب کو ایسا ہی بنا دیں، یہ اللہ کی نعمت ہے۔

آیت پر ایک شبہ اور اس کا جواب:

میں آخری بات سنا کر اپنی بات کو ختم کرتا ہوں۔ یہ جو ہم نے آیت پڑھی ہے کہ جس کا عقیدہ ٹھیک ہو اور اعمال بھی اس کے سنت کے مطابق ہوں تو اللہ لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت پیدا فرما دیتے ہیں۔ بعض کو اس آیت پر شبہ ہو سکتا ہے کہ ہم نے کتنے لوگ دیکھے ہیں کہ ان کا عقیدہ بھی ٹھیک ہے، عمل بھی سنت کے مطابق ہیں لیکن اس کے باوجود لوگ ان سے پیار نہیں کرتے، تو کیا یہ آیت غلط ہے؟

جواب یہ ہے کہ آیت تو ٹھیک ہے لیکن ہمیں سمجھنے میں غلطی لگی ہے۔ اس کا ایک معنی علامہ نسفی رحمہ اللہ نے تفسیر مدارک میں لکھا ہے کہ ایسا ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت مؤمن کے لیے ترتیب یوں بنا دیتے ہیں کہ مؤمن کی نیک لوگوں کے دلوں میں محبت پیدا فرما دیتے ہیں تو وہ اس سے پیار کرتے ہیں اور جو فجار اور نیک نہیں ہوتے ان کے دلوں میں محبت نہیں ہوتی بلکہ اس نیک آدمی کا رعب بٹھا دیتے ہیں، وہ اس کو چھیڑتے نہیں ہیں۔ اگر چھیڑیں تو بھی ڈرتے ہیں، ان کو پتا ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ کچھ ہونا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کافر چھیڑتے تھے لیکن کافروں کو پتا تھا کہ اس چھیڑ کا کچھ نتیجہ نکلنا ہے۔ اللہ ہم سب کو ایسا بنا دیں، اللہ ہم سب کو نیک بنا دیں، اللہ ہمارے عقائد کو درست بنا دیں اور اللہ ہم سب کو قرآن کریم کی خدمت کے لیے قبول فرمالیں۔ (آمین)

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

سورۃ طٰہٰ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿طٰهٰ ۚ﴿۱﴾ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى ۙ﴿۲﴾ اِلَّا تَذۡكِرَةً لِّمَنۡ
يَّخۡشٰى ۙ﴿۳﴾ تَنۡزِيۡلًا مِّمَّنۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ وَ السَّمٰوٰتِ الۡعُلٰى ؕ﴿۴﴾ اَلرَّحۡمٰنُ عَلَى الۡعَرۡشِ
اسۡتَوٰى ﴿۵﴾ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا وَمَا تَحۡتَ الثَّرٰى
﴿۶﴾ وَاِنۡ تَجۡهَرۡ بِالۡقَوۡلِ فَاِنَّهٗ يَعۡلَمُ السِّرَّ وَاَخۡفٰى ﴿۷﴾ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الۡاَسۡمَآءُ
الۡحُسۡنٰى ﴿۸﴾﴾

حروفِ مقطعات:

﴿طٰهٰ﴾ حروفِ مقطعات میں سے ہے۔ حروف؛ حرف کی جمع ہے، مقطعات؛ قطع سے بنا ہے۔ حروفِ مقطعات کا معنی ہے وہ حروف جن کو کاٹ کر الگ الگ پڑھا جائے جیسے ﴿الٓمّٓ﴾ کو الف... لام... میم... الگ پڑھتے ہیں، ﴿طٰهٰ﴾ کو بھی طا... ھا... الگ الگ پڑھتے ہیں اس لیے ان کو حروف مقطعات کہتے ہیں۔ ان حروف کا معنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں ہے۔ اگر اللہ رب العزت نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ان الفاظ کا معنی بتایا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو نہیں بتایا۔ قرآن مجید کے جن حروف کا معنی اللہ اور اس کے رسول صلی

اللہ علیہ وسلم نہ بتائیں ان کی کھود کرید میں نہیں پڑنا چاہیے۔

میں مختصراً کہتا ہوں کہ بہت سارے مفسرین حضرات یہ بات فرماتے ہیں کہ طا سے مراد یہ ہے اور ھا سے مراد یہ ہے اور بالآخر وہ بھی یہی فرماتے ہیں کہ اس کا معنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہے۔ جب اصل معنی ہی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں تو بہت سارے معانی آپ حضرات کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

جب ﴿طٰہٰ﴾ اور ان جیسے حروفِ مقطعات کے معنی معلوم نہیں تو پھر ان کو قرآن مجید میں ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ تو یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ افراد دو قسم کے ہیں: ایک قسم اہل علم کی ہے اور ایک قسم غیر اہل علم کی ہے۔ علماء کا امتحان الگ ہوتا ہے اور غیر علماء کا امتحان الگ ہوتا ہے۔ ہر آدمی کا امتحان اس کی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے۔ غیر عالم کا امتحان اور ابتلاء یہ ہے کہ تم پڑھو! اس کی پڑھنے سے جان جاتی ہے، یہ مشکل ہے اس کے لیے اور علماء جو پڑھنے سے خوش ہوتے ہیں تو ان کی اس سے جان جاتی ہے کہ تم فلاں چیز نہ پڑھو! تو اللہ تعالیٰ نے غیر عالم کا امتحان اس میں رکھا ہے کہ یہ قرآن کے معنی سیکھتے ہیں یا نہیں اور عالم کا امتحان اس میں ہے کہ جن الفاظ کے معنی میں نے نہیں بتائے تو یہ ان کی تلاش میں پڑتے ہیں یا نہیں؟ اس لیے فرمایا: ﴿طٰہٰ﴾ کہ عالم رک جائے، یہی اس کی شان ہے کہ جن آیات کے معانی غیر واضح ہیں اور انسانی عقل وہاں تک نہیں پہنچ سکتی ان آیات میں کھود کرید کیے بغیر ان کا معنی اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دے۔

قرآن مجید میں ہے کہ آیات دو قسم کی ہیں: ایک محکمات اور دوسری متشابہات۔ متشابہات کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ

الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَأْوِيْلِهٖ ۚ وَ مَا يَعْلَمُ تَأْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ

يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۷﴾ [137]

کہ جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ پن ہے وہ فتنہ پھیلانے کے لیے ان متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کی تاویلات کرنے میں لگے رہتے ہیں حالانکہ ان آیتوں کا صحیح صحیح مطلب اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور جو پختہ کار اہلِ علم ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لاتے ہیں۔

تو ہم بھی ایمان لاتے ہیں کہ ﴿طٰہٰ﴾ کا معنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ لہٰذا ہم اس میں کوئی بحث و کرید نہیں کرتے۔

آیات کا شان نزول:

﴿مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ﴿۲﴾﴾

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مکہ میں جب قرآن مجید کا نزول شروع ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو تہجد میں قرآن مجید کی تلاوت اتنی فرماتے کہ بسا اوقات مسلسل قیام کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک پر ورم آجاتا۔ حدیث مبارک میں ہے:

حَتّٰى تَوَرَّمَتْ قَدَمَاهُ. [138]

کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک پر ورم آجاتا اور سوج جاتے۔

مشرکین نے اس پر جملے کسنا شروع کر دیے۔ انہوں نے کہا کہ ان پر قرآن کیا اترا پوری مصیبت آگئی، اچھا خاصا رات کو سوتے تھے اب پوری رات جاگتے ہیں۔ تو

137۔ الاعراف 7:7

138۔ صحیح البخاری، رقم: 4836

اللہ نے فرمایا:

﴿مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝٢ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝٣﴾

اے میرے پیغمبر! ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نہیں اتارا کہ آپ مشقت میں مبتلا ہو جائیں اور مشقت میں پڑ جائیں۔ تمام رات بیدار رہنے اور تلاوت میں مشغول رہنے کی ضرورت نہیں۔ اور ان کو کیا پتا کہ مشقت کیا ہوتی ہے، یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری مشقت کو دیکھتے ہیں کہ آپ آنسو بہا رہے ہیں، آپ کے پاؤں مبارک سوج رہے ہیں، پوری پوری رات آپ قیام کر رہے ہیں لیکن جو راحت ہم آپ کے قلب کو دیتے ہیں اس راحت کا انہیں اندازہ ہی نہیں اور ان کو پتا ہی نہیں کہ اس میں کیا مزہ آرہا ہے!

میں آپ کو آسان مثال دیتا ہوں کہ گرمی کا موسم ہے، حاجی نے صرف دو چادریں پہنی ہوئی ہیں، اس کے علاوہ کوئی دوسرا کپڑا انہیں ہے، نہ تیل لگا سکتا ہے اور نہ خوشبو لگا سکتا ہے، جسم میں جوئیں پڑیں تو ان کو باہر نہیں نکال سکتا اور کھلے میدان میں پڑا ہوا ہو تو لوگ دیکھ کر تو یہی سمجھیں گے کہ یہ شخص کتنی مشقت میں ہے لیکن اس حاجی سے پوچھو کہ اس کو مزہ کتنا آرہا ہے، اس کو کیا لطف آرہا ہے۔ تو قرآن کریم رات کو پڑھنے میں کیا مزہ آتا ہے یہ تو اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی جانتے ہیں۔

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى﴾ یہ قرآن کریم تو نصیحت ہے ان کے لیے جو اللہ سے ڈریں، یہ مشرکین نہ تو اللہ سے ڈرتے ہیں اور نہ قرآن کریم کے قریب آتے ہیں تو ان کو کیسے سمجھ میں آئے گا کہ قرآن کریم میں کیا ہے۔

حضور علیہ السلام کی رات کی عبادت:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابتدا میں بڑا لمبا قیام فرماتے، بالآخر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی آیت نازل فرمائی:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝١ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝٢ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝٣﴾[139]

میرے نبی! آپ پوری رات قیام نہ فرمایا کریں، آدھی رات کر لیں یا اس سے بھی کچھ کم کر لیں، آپ تھوڑا قیام فرمایا کریں۔ تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معمول مبارک یہ بنالیا کہ عشاء کی نماز کے بعد آپ گھر تشریف لے جاتے۔ ہاں اگر آپ کا کوئی مخصوص مشورہ ہوتا تو اس میں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو شریک فرماتے، ان کے علاوہ بھی اگر چاہتے تو کسی کو بلا لیتے، کچھ وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشاورت فرماتے۔ اس کے بعد گھر والوں کے ساتھ آرام کرتے اور رات کے آخری پہر میں اٹھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے قیام فرماتے۔

جو میرے طریقے سے روگردانی کرے وہ مجھ سے نہیں:

بلکہ ایک حدیث میں ہے کہ تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آئے۔ انہوں نے دروازے پر دستک دی اور ازواج مطہرات سے پوچھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول کیا ہے؟ ازواج مطہرات نے جواب دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قیام بھی فرماتے ہیں اور سوتے بھی ہیں، روزہ بھی رکھتے ہیں اور افطار بھی فرماتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح بھی فرمائے ہیں۔ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو بہت بڑے آدمی ہیں اور ہم چھوٹے لوگ ہیں، ہم آپ کا مقابلہ کہاں کر سکتے ہیں! تو ان میں سے ایک نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں پوری رات قیام کروں گا اور نہیں سوؤں گا، دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزے رکھوں گا اور کبھی افطار نہیں کروں گا اور تیسرے نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں کبھی نکاح نہیں کروں گا۔

139۔ المزمل 73:1 تا 3

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بات سنی تو ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں تمہاری بنسبت اللہ سے زیادہ ڈرتا ہوں لیکن میری حالت یہ ہے کہ میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں اور شادی بھی کرتا ہوں۔ لہذا جو شخص میرے اس طریقے سے روگردانی کرے تو اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔[140]

اصل زندگی راہِ اعتدال ہے:

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ بات سمجھائی کہ اس کا معنی یہ نہیں کہ جو چھوٹا ہے وہ مسلسل روزے رکھے، بلکہ فرمایا کہ اعتدال کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرو، نفل بھی پڑھو اور آرام بھی کرو، روزے بھی رکھو اور افطار بھی کرو، جو انسان اعتدال کی زندگی گزارتا ہے تو وہ کبھی پریشان نہیں ہوتا اور ٹینشن کا شکار بھی نہیں ہوتا۔ اگر کبھی پریشان ہو بھی جائے تو کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دیا ہو، کسی کو مستقل اپنا شیخ بنایا ہوا ہو اور اس سے رابطہ بھی رکھا ہو تو ان کو بتائے کہ میرے گھر میں یہ مسئلہ ہے، وہ اس کو کوئی آیت بتائے یا ترتیب بتائے تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور اگر اس سے مسئلہ حل نہ بھی ہو تب بھی آدمی کو ذہنی سکون ہوتا ہے کہ اللہ کا شکر ہے کہ میں اپنے کام میں لگا ہوا ہوں، ورنہ آدمی پریشانیوں کا شکار رہتا ہے۔

خیر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے قرآن مجید مشقت کے لیے نازل نہیں کیا، نصیحت کے لیے نازل کیا ہے۔

آسمان وزمین کی اشیاء کا علم اللہ ہی کے پاس ہے:

﴿تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَ السَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۝۴﴾

140۔ صحیح البخاری، رقم:5063

یہ قرآن مجید اس ذات کی طرف سے نازل کردہ ہے جس نے زمین اور بلند و بالا آسمان پیدا کیے۔

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝﴾

اور رحمٰن عرش پر مستوی ہے۔ اس مسئلہ پر میں بعد میں بات کروں گا۔

﴿لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝﴾

جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے یہ سب اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اور جو کچھ زمین کی تہہ کے نیچے ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کا ہے۔ لوگ نہ آسمانوں کی بلندی کو معلوم کر سکتے ہیں اور نہ زمین کے نیچے کے حالات کو معلوم کر سکتے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن میں لکھا ہے کہ لوگوں نے تحقیقات کی ہیں کہ زمین کے نیچے کیا ہے، انہوں نے نیچے جانے کی کوشش کی ہے، چھ میل تک گئے ہیں اس سے آگے ان کے آلات کام نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے نیچے مستقل چٹان ہے جو ٹوٹتی نہیں ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کے نیچے کیا ہے وہ تم نہیں جانتے، میں جانتا ہوں، میرے علم کا تمہیں اندازہ نہیں ہے۔

جامع الترمذی کی روایت میں ہے - میں ان شاء اللہ آگے چل کر اسے دلیل کے طور پر بھی پیش کروں گا- کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَوْ اَنَّكُمْ دَلَّيْتُمْ بِحَبْلٍ اِلَى الْاَرْضِ السُّفْلٰى لَهَبَطَ عَلَى اللهِ.[141]

اگر تم ایک ڈول رسی سے باندھ کر نیچے لٹکاؤ اور وہ رسی نچلی زمین یعنی تحت الثریٰ تک جائے تو وہ بھی ایسے ہو گی جیسے اللہ کے بالکل پاس پڑی ہو، اللہ سے وہ رسی

141۔ سنن الترمذی، رقم:3298

بھی دور نہ ہو گی جو ساتویں زمین تک چلی گئی ہے۔

سِرّ اور اخفیٰ میں فرق:

﴿وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۝٧﴾

اللہ کو بہت اونچا پکارنے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تو آہستہ بات بھی سنتے ہیں اور مزید آہستہ بھی سنتے ہیں۔ یہاں دو لفظ استعمال فرمائے ہیں ایک ہے لفظ "سِرّ" اور دوسرا ہے لفظ "اَخْفٰى"۔ سِر کا معنی ہے خفی، پوشیدہ اور اخفی کا معنی ہے بہت زیادہ پوشیدہ۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ "سِرّ" اس پوشیدہ کو کہتے ہیں جو بندے کے دل میں ہو اور "اَخْفٰى" اس پوشیدہ کو کہتے ہیں جو بندے کے دل میں آنا ہے لیکن ابھی تک نہیں آیا۔ ایک تو ہمارے دل میں ہے نا مثلاً جب ہم درسِ قرآن سے فارغ ہوں گے تو میں نے کہاں جانا ہے، آپ نے کہاں جانا ہے یہ ہمارے دماغ و سوچ میں ہے، اس کو سر کہتے ہیں اور اخفی کہتے ہیں کہ کل ہم نے مزید دل میں کیا سوچنا ہے یہ ہمیں پتہ نہیں، تو آج جو تمہارے دل میں ہے اللہ تعالیٰ اس راز کو بھی جانتے ہیں اور آئندہ تمہارے دل نے جو راز سوچنا ہے اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتے ہیں۔

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۝٨﴾

اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور اللہ کے لیے بہت اچھے، پیارے پیارے نام ہیں۔

استواء علی العرش متشابہات میں سے ہے:

میں ان آیات میں سے آج آپ کی خدمت میں دو آیتیں پیش کروں گا۔ یہ دو اہم آیتیں ہیں اور ان کا تعلق عقائد سے ہے۔ پہلی آیت ہے:

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝٥﴾

اھل السنۃ والجماعۃ کا مسلک اور مذہب یہ ہے کہ یہ آیت متشابہات میں سے ہے۔متشابہات کی دو قسمیں ہیں:

ایک قسم یہ ہے کہ جو لفظ قرآن میں استعمال ہوا ہے اس کا معنی بھی معلوم نہ ہو اور مراد بھی معلوم نہ ہو۔ جیسے لفظ "طٰہٰ"۔ اب حرف "طا" کا عربی میں کوئی معنی نہیں اور حرف "ھا" کا بھی کوئی معنی نہیں۔ جب حروف کو آپس میں جوڑا جاتا ہے تب ان کا معنی بنتا ہے۔ آپ کہتے ہیں: الف... ب... ت... ث...۔ الف کا کوئی معنی نہیں لیکن جب الف کو لام اور ہ سے جوڑیں گے تو لفظ "اللہ" بنے گا۔ اب اس کا معنی بھی ہوگا۔ تو "طٰہٰ" کا معنی بھی معلوم نہیں اور مراد بھی معلوم نہیں۔

متشابہات کی دوسری قسم یہ ہے کہ اس لفظ کا عربی میں معنی تو معلوم ہے لیکن قرآن میں اس کا مطلب کیا ہے یہ معلوم نہیں، جیسے ﴿اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی﴾ ہے کہ رحمٰن عرش پر مستوی ہے۔ اب رحمن کا معنی ہے بڑا مہربان، "علی" کا معنی ہے پر، عرش کا معنی ہے "تخت"، استویٰ کا معنی ہے مستقر بنانا، لیکن یہاں قرآن مجید میں ﴿اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی﴾ کی مراد معلوم نہیں ہے۔ تو پھر ان آیات کا مطلب کیا ہے؟

اھل السنۃ والجماعۃ کا موقف:

اس کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات موجود بلا مکان ہے، اب موجود بلا مکان کو سمجھانے کے لیے ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر ہے"۔ اللہ تعالیٰ جگہ سے پاک بھی ہیں اور ہر جگہ پر بھی ہیں۔ جیسے ہم کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ چھ جہات سے پاک بھی ہیں اور چھ جہات کو محیط بھی ہیں۔ کیا معنی؟ ایک اوپر کی جہت ہے فوق، ایک نیچے کی جہت ہے تحت، آگے کی جہت ہے قُدَّام، پیچھے کی

جہت ہے خَلف، دائیں کی ہے جہت یمین اور بائیں کی جہت ہے شِمال۔ اللہ تعالیٰ ان چھ جہات سے پاک بھی ہیں اور ان جہات کو محیط بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عجیب شان ہے۔

اب اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق بعض باتیں ایسی ہیں کہ اگر میں وہ آپ کے سامنے ذکر بھی کروں گا تو آپ سمجھ نہیں پائیں گے، ان کو سمجھنا آپ کے بس میں نہیں ہے۔ وہ اتنی اوپر کی باتیں ہوتی ہیں کہ عام عالم نہیں سمجھ سکتا تو عوام ان کو کیسے سمجھیں گے۔ بڑا مشکل کام ہے۔ میں ان موضوعات کو نہیں چھیڑتا۔ میں موٹی موٹی باتیں عرض کرتا ہوں۔

”اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر ہے“ کی وضاحت:

ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر ہے اور ہر جگہ سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ جگہ سے پاک ہیں، موجود بلا مکان ہیں، اللہ تعالیٰ کو اپنے وجود کے لیے کسی جگہ کو اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ دیکھتے ہیں ہم بھی دیکھتے ہیں لیکن ہم میں سے کوئی ایسا بندہ ہے جس کی آنکھ نہ ہو پھر بھی دیکھے؟ کوئی ایسا بندہ نہیں ہے۔ اللہ پاک دیکھتے ہیں لیکن آنکھ سے پاک ہیں، اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کے لیے آنکھ کی ضرورت نہیں ہے، ہم پکڑتے ہیں لیکن پکڑیں گے تب جب ہاتھ ہو گا، ہاتھ نہیں ہو گا تو کیسے پکڑیں گے؟ اللہ تعالیٰ بندے کو پکڑتے ہیں: ﴿اِنَّ بَطۡشَ رَبِّكَ لَشَدِيۡدٌ ؕ﴾ لیکن اللہ تعالیٰ ہاتھ سے پاک ہے، اللہ کی پکڑ بہت سخت ہے۔ ہم سنتے ہیں کان سے، کسی بندے کے کان ہی نہ ہوں پھر سنے ایسا نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ سننے میں کان کے محتاج نہیں ہیں۔ ہم بولتے ہیں جب زبان ہو، کسی کی زبان کاٹ کر پھینک دو تو وہ بول نہیں سکتا، اللہ تعالیٰ بولنے میں زبان کے محتاج نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ صمد اور بے نیاز ذات ہے۔ صمد کہتے ہیں:

”اَلَّذِیۡ لَا یَحۡتَاجُ اِلٰی اَحَدٍ وَ یَحۡتَاجُ اِلَیۡہِ کُلُّ اَحَدٍ“

کہ کائنات میں وہ کسی چیز کا محتاج نہ ہو اور کائنات کا ہر ذرہ اس کا محتاج ہو۔ صمد

کا آسان ترجمہ ”بے نیاز“ کر دیا جاتا ہے تاکہ لوگ سمجھ جائیں، لمبا ترجمہ عام بندہ سنبھال نہیں سکتا۔ تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہر جگہ موجود ہے، یہ ہمارا عقیدہ ہے۔

بعض لوگوں کا نظریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر نہیں بلکہ عرش پر ہیں اور ان کی دلیل یہی آیت ﴿اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی﴾ اور اس جیسی دیگر آیات ہیں۔ تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ دیکھو جی! اللہ تعالی کہہ رہے ہیں کہ میں عرش پر مستوی ہوں اور آپ کہتے ہو کہ اللہ تعالی عرش پر نہیں ہے؟

اللہ تعالی کے ہر جگہ ہونے کے دلائل:

ہمارا اہل السنۃ والجماعۃ کا مسلک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر ہے۔ پہلے اس کے دلائل ذہن نشین فرمالیں:

[1]: قرآن کریم میں ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الۡمَشۡرِقُ وَالۡمَغۡرِبُ ۚ فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ ؕ﴾[142]

مشرق بھی اللہ کا ہے اور مغرب بھی اللہ کا ہے، تم جدھر بھی رخ کرو گے ادھر اللہ کی ذات ہے۔

تو اللہ کی ذات ہر طرف ہے جیسا کہ قرآن کریم میں آگیا ہے۔

[2]: سورۃ المجادلۃ میں ہے:

﴿مَا یَكُوۡنُ مِنۡ نَّجۡوٰی ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمۡ وَلَا خَمۡسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمۡ وَلَاۤ اَدۡنٰی مِنۡ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكۡثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمۡ اَیۡنَ مَا كَانُوۡا﴾[143]

اگر تین آدمیوں میں کوئی سرگوشی ہوتی ہے تو چوتھا اللہ ہوتا ہے، پانچ

142۔ البقرۃ 115:2

143۔ المجادلۃ 7:58

آدمیوں میں ہو تو چھٹا اللہ ہوتا ہے، اور سرگوشی کرنے والے اس سے کم ہوں یا زیادہ ہوں، وہ جہاں کہیں بھی ہوں اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔

[3]: ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ﴾ [144]

اگر آپ سے میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں کہ اللہ کہاں ہے؟ تو آپ نے کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ قریب ہے، اور کتنا قریب ہے؟ فرمایا:

﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ﴾ [145]

ہم بندے کی شہ رگ سے زیادہ اس کے قریب ہیں۔

اس آیت کو سمجھانے کے لیے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ جب کاغذ؛ کاغذ کے ساتھ جڑتا ہے تو بیچ میں گوند کا واسطہ ہوتا ہے لیکن گوند کاغذ کے ساتھ جڑی ہے تو اس میں کوئی واسطہ نہیں ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ اسی طرح انسان اور اس کی شہ رگ اللہ تعالیٰ کے واسطے سے ملتے ہیں۔ بندہ اور اس کی شہ رگ کے درمیان واسطہ اللہ کی ذات کا ہے۔ تو گویا انسان اور اس کی شہ رگ واسطے سے ملے ہیں اور اللہ تعالیٰ انسان سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے کیونکہ درمیان میں کسی چیز کا واسطہ نہیں۔ [146]

[4]: ﴿ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ﴾ [147]

کیا تم اس اللہ سے نہیں ڈرتے جو آسمانوں میں ہے۔

144۔ البقرۃ 186:2

145۔ ق 16:50

146۔ خطباتِ حکیم الامت: ج17 ص431 عنوان: اقربیت کا مفہوم

147۔ الملک 16:67

[5]: ﴿وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ﴾[148]

اور وہی اللہ آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی ہے۔

تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر ہے۔

میں نے آپ کے سامنے پانچ آیتیں پیش کی ہیں کہ اللہ تعالیٰ مشرق میں بھی ہے، مغرب میں بھی ہے، اللہ تعالیٰ انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی ہے یعنی ہر جگہ پر ہے۔

اللہ کو صرف عرش پر ماننے والوں کی پہلی دلیل:

جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر نہیں، صرف عرش پر ہے وہ دلیل میں آیت ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ پیش کرتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے۔

اس دلیل کا جواب:

ہم کہتے ہیں کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ اس کا معنی یہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے تو یہ ہمارے خلاف نہیں ہے، اس لیے کہ ہم کہتے ہیں اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر ہے، عرش پر بھی ہے فرش پر بھی ہے۔ آپ کی پیش کردہ دلیل سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے لیکن یہ تو ثابت نہیں ہوا کہ اس کے علاوہ کہیں اور نہیں ہے۔ جب آپ ساری آیتیں ملائیں گے کہ اللہ تعالیٰ مشرق و مغرب میں بھی ہے، آسمانوں اور زمین میں بھی ہے، شہ رگ سے زیادہ قریب بھی ہے اور عرش پر بھی ہے تو یہ ہمارے حق میں ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ آپ کے عقیدے کے خلاف کئی آیتیں موجود ہیں جس میں

148۔ الانعام 3:6

ہے کہ اللہ آسمان میں ہے، زمین میں ہے، اللہ تعالیٰ شہ رگ سے زیادہ قریب بھی ہے، مشرق میں ہے، مغرب میں ہے وغیرہ لیکن ہمارے عقیدے کے خلاف پورے قرآن مجید میں کوئی آیت موجود نہیں ہے۔ میں اس لیے آپ سے عرض کرتا ہوں کہ آپ دل بڑا رکھا کریں، ہمارے مسلک کے خلاف قرآن مجید میں کوئی آیت بھی نہیں ہے، ہمارے مسلک کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث مبارک نہیں ہے، اس لیے آپ گھبرایا نہ کریں۔

اب یہ جو آیت ہے: ﴿اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی﴾ ہم کہتے ہیں کہ اس کا معنی اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے، اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ اللہ عرش پر ہے۔ اور اگر اس آیت کا معنی وہ کر بھی دیں جو یہ لوگ کرتے ہیں کہ "خدا عرش پر ہے" تو ہمارے خلاف پھر بھی نہیں ہوگی۔ اس لیے ہم یہ بات عرض کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر جگہ موجود ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ صرف عرش پر ہے تو وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ ﴿اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی﴾، آپ اس کا جواب سمجھ گئے ہیں؟ (جی ہاں، سامعین) دیکھیں! اگر اس آیت کا معنی یہ کریں کہ "اللہ تعالیٰ صرف عرش پر ہے" تو پھر اس معنی کے خلاف دوسری آیتیں بھی ہیں مثلاً اللہ مشرق میں بھی ہے، مغرب میں بھی ہے، آسمانوں میں بھی ہے، تمہارے ساتھ بھی ہے، شہ رگ سے زیادہ قریب بھی ہے۔ تو یہ ساری آیات اس آیت ﴿اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی﴾ کے خلاف ہو جائیں گی نا؟ حالانکہ قرآن میں اختلاف نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلَوۡ کَانَ مِنۡ عِنۡدِ غَیۡرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوۡا فِیۡہِ اخۡتِلَافًا کَثِیۡرًا ﴿۸۲﴾﴾ [149]

149۔ النساء4:82

کہ اگر قرآن کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں کئی اختلاف ہوتے۔

یعنی اگر قرآن میں اختلاف آ جائے تو سمجھو کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، دلیل اس کی یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اس لیے آپ ساری آیتیں ملائیں گے تو نتیجہ نکلے گا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر جگہ پر ہے۔ اس لیے اس آیت کا یہ معنی کرنا کہ صرف عرش پر ہے، بالکل غلط ہے۔ اگر معنی "عرش پر" کر لیں تو پھر شاید کوئی بات بنے لیکن "صرف عرش پر" معنی کرنا تو بالکل غلط ہے۔

اللہ کو صرف عرش پر ماننے والوں کی دوسری دلیل:

ان لوگوں کی دوسری دلیل مسلم شریف کی حدیث ہے۔ اس کا نام حدیث جاریہ ہے۔ "جاریہ" باندی کو کہتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک صحابی حضرت معاویہ بن الحکم السلمی رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میری ایک باندی تھی جو احد اور جوانیہ کی طرف میری بکریاں چرایا کرتی تھی، ایک دن میں اس جگہ گیا اور دیکھا کہ ایک بھیڑیا آ گیا اور ایک بکری کو اٹھا کر لے گیا۔ میں بھی انسان ہوں، مجھے بھی غصہ آتا ہے۔ تو میں نے بہت زور سے اس کو تھپڑ مارا۔ صحابی خود فرماتے ہیں کہ جب یہ بات میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائی تو آپ کو بہت زیادہ ناگوار گزری۔ میں نے محسوس کیا تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اس کو آزاد کر دوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو لے آؤ۔ میں اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دو سوال کیے:

پہلا سوال یہ کیا: "أَيْنَ اللّٰهُ؟" کہ اللہ تعالیٰ کہاں ہیں؟ تو اس نے جواب دیا:

"فِي السَّمَاءِ" کہ وہ آسمان میں ہیں۔

دوسرا سوال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا: "مَنْ أَنَا؟" کہ میں کون ہوں؟ تو اس نے جواب دیا: "أَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ" آپ اللہ کے رسول ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أَعْتِقْهَا فَإِنَّهَا مُؤْمِنَةٌ کہ اس کو آزاد کردو، یہ مؤمنہ ہے۔[150]

تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ ہر جگہ پر نہیں کیونکہ اس باندی نے یہ نہیں کہا کہ اللہ ہر جگہ پر ہے بلکہ اس نے کہا کہ اللہ آسمان میں ہے۔

اس دلیل کا جواب:

پہلی بات یہ ہے کہ یہ آپ کی دلیل نہیں بنتی کیونکہ یہ آپ کے دعویٰ کے مطابق نہیں، آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے اور باندی نے کہا کہ اللہ آسمان میں ہے، تو آسمان بہت نیچے ہے، پھر اس کے اوپر سدرۃ المنتہیٰ ہے، پھر کرسی ہے، پھر سمندر ہے، پھر عرش ہے۔ تو تمہارے دعوے کے مطابق یہ دلیل کیسے ہوئی؟ یہ دلیل تو ہماری بنتی ہے، کیوں کہ ہمارا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر ہے اور ہر جگہ میں آسمان بھی ہے۔ تو یہ ہماری دلیل ہے، تمہاری نہیں۔

انسان مکلف بقدرِ عقل:

دوسری بات یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ ہے اس کو ہر بندہ سمجھ نہیں سکتا اور نہ ہر بندہ سمجھا سکتا ہے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ انسان مکلف بقدر عقل ہوتا ہے، جتنی اس کی عقل ہوتی ہے اللہ اتنا اس کو پابند کرتے ہیں، اس سے زیادہ اس کو پابند نہیں کرتے۔ اس پر حضرت تھانوی رحمۃ

150۔ صحیح مسلم، رقم:537

اللہ علیہ نے دو مثالیں دی ہیں:

ایک مثال بنی اسرائیل کی دی ہے اور ایک مثال اب کے دور کی دی ہے اور دونوں مثالیں بڑی عجیب ہیں۔

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ ایک شخص کے مرنے کا وقت قریب آ گیا۔ جب اس کو اندازہ ہوا کہ اب میں زندہ نہیں رہ سکتا تو اس نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ جب میں مر جاؤں تو بہت سی لکڑیاں جمع کر کے آگ جلانا اور مجھے اس میں ڈال دینا، میری لاش جلانے کے بعد ہڈیوں کو پیس لینا اور اس راکھ کو کسی گرم یا کسی تیز ہوا چلنے والے دن میں پانی میں بہا دینا۔ جب وہ فوت ہو گیا تو اس کے گھر والوں نے اس کی وصیت کے مطابق یہ کام کیا اور اس کی راکھ کو پانی میں بہا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بندے کے اعضاء کو جمع کیا اور اس سے پوچھا کہ تو نے ایسا کیوں کیا تھا؟ اس بندے نے کہا:

مِنۡ خَشۡیَتِكَ اے اللہ! تیرے ڈر کی وجہ سے ایسا کیا۔ تو خدا نے اس کو بخش دیا۔[151]

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تو کفر ہے کہ کوئی بندہ یہ کہے کہ میرا جسم ہو گا تو اللہ عذاب دے گا اور اگر جسم نہیں ہو گا تو اللہ عذاب ہی نہیں دے گا۔ کیا اللہ عذاب دینے میں جسم کے پابند ہیں کہ جسم سالم ہے تو عذاب ہو گا، اگر جسم سالم نہیں ہے تو اللہ عذاب نہیں دے سکتا؟! اب یہ جو اس بندے نے کہا کہ مِنۡ خَشۡیَتِكَ اے اللہ! تیرے ڈر کی وجہ سے ایسا کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس شخص میں عقل ہی اتنی تھی، وہ سمجھتا تھا کہ جسم ہو تو اللہ عذاب دیتے ہیں، نہ ہو تو دیتے ہی نہیں اس

151۔ صحیح البخاری، رقم: 3479

لیے اس کو ختم کر دو تا کہ اللہ مجھے عذاب ہی نہ دیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کی عقل کے مطابق فیصلہ فرمایا اور فرمایا کہ میں نے تجھے بخش دیا۔

حضرت تھانوی کی پیش کردہ مثال:

دوسری مثال حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی عجیب دی۔ فرمایا کہ ایک مولوی صاحب نے ایک دیہات میں تقریر کی۔ اس نے کہا کہ اللہ کا ہاتھ بھی نہیں ہے، اللہ کی آنکھ بھی نہیں ہے، اللہ کا ناک بھی نہیں ہے، اللہ کا کان بھی نہیں ہے۔ اصل یہ ہوتا ہے کہ کس موقع پر جملہ کہنا کیسا ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ اللہ دیکھتا ہے لیکن بغیر آنکھ کے، اللہ آنکھ سے پاک ہے۔ اللہ سنتا ہے لیکن بغیر کان کے، اللہ کان سے پاک ہے۔ ان جملوں کا مفہوم بالکل الگ ہوتا ہے لیکن وہاں عوام بھی دیہات کی تھی اور مولوی صاحب بھی دیہات کا تھا۔ تو اس نے تقریر کی اور یہ جملے کہے کہ اللہ کا ہاتھ بھی نہیں ہے، اللہ کی آنکھ بھی نہیں ہے، اللہ کا ناک بھی نہیں ہے، اللہ کا کان بھی نہیں ہے تو ایک دیہاتی اس کی تقریر سن رہا تھا۔ اس نے کہا کہ یہ اللہ ہے یا کوئی تربوز ہے-العیاذ باللہ- کہ نہ آنکھ ہے، نہ ناک ہے، نہ کان ہے کچھ بھی نہیں ہے، کیا یہ اللہ ہے؟

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس دیہاتی بندے کو کافر نہیں کہنا، کیوں کہ اس بیچارے کی عقل ہی اتنی تھی۔ تو جتنی عقل ہو بندہ اتنا مکلف ہوتا ہے۔

حدیث جاریہ کا مطلب از حضرت تھانوی:

اب حدیث جاریہ کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس باندی سے پوچھا ''أَيْنَ اللهُ؟'' کہ اللہ تعالیٰ کہاں ہیں؟ اور اس نے جواب دیا: ''فِي السَّمَاءِ'' کہ اللہ آسمان میں ہیں۔ باندی کا یہ جواب واقع کے مطابق درست نہیں تھا لیکن وہ چونکہ باندی ہے، بدو عورت ہے، وہ اتنی بات کیسے سمجھائے کہ اللہ ہر جگہ پر ہے، اس پر وہ دلیل کہاں سے لائے؟ تو اس نے

اپنی عقل کے مطابق کہا کہ اللہ آسمان میں ہے، کیوں کہ جب ہر جگہ پر ہے تو آسمان میں بھی تو ہو گا نا!۔ یہ ایسے ہے جیسے آپ ایک چھوٹے بچے سے پوچھیں کہ اللہ تعالیٰ کدھر ہیں؟ وہ اوپر اشارہ کرتا ہے، کیونکہ بے چارہ سمجھ ہی اتنی رکھتا ہے۔ میں اس پر بھی ان شاء اللہ بات کروں گا کہ اوپر اشارہ کیوں کیے جاتے ہیں؟ تو اس باندی کا جواب اگرچہ واقع کے مطابق نہ تھا لیکن چونکہ اس کی عقل کے بقدر تھا اس لیے اس کا ایماندار ہونا تسلیم کر لیا گیا۔

یہ ان لوگوں کی دوسری دلیل تھی، ان کے پاس زیادہ دلائل نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو صرف عرش پر ماننے والوں کا ایک شبہ:

ان کے علاوہ یہ لوگ عقلی دلیلیں پیش کرتے ہیں، عقل سے ثابت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر نہیں ہے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟ میں نے کہا کہ ہر جگہ پر ہے۔ اس نے کہا کہ یہ بتائیے کہ اللہ تعالیٰ بیت الخلاء میں بھی ہے؟ -العیاذ باللہ- اب اگر میں اس سے کہتا کہ اللہ تعالیٰ وہاں نہیں ہے پھر تو اللہ تعالیٰ ہر جگہ پر نہ ہوئے، ہر جگہ ہونے کا دعوی ٹوٹ گیا اور اگر میں کہتا کہ -العیاذ باللہ- ہے تو یہ تو گستاخی ہے، ایک مسلمان کیسے کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بیت الخلاء میں ہے؟!

تو یہ لوگ ایسے سوال بناتے ہیں پھنسانے کے لیے تاکہ لوگ پھنس جائیں۔

اس شبہ کا جواب:

میں نے اس سے پوچھا کہ آپ کو کچھ قرآن بھی یاد ہے؟ اس نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے میں پورے قرآن کا حافظ ہوں۔ میں نے کہا: اب بات سمجھانی بہت آسان ہو گئی۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے سینے میں قرآن موجود ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ میں نے کہا کہ تیرے سینے میں قرآن محفوظ ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں۔ میں نے کہا: عقل مند

آدمی! جب تیرے سینے میں قرآن مجید موجود نہیں ہے تو محفوظ کیسے ہوا؟ میں نے سمجھانے کے لیے اسے کہا کہ میں کہتا ہوں کہ میری جیب میں پیسے موجود نہیں ہیں بلکہ محفوظ ہیں تو کیا یہ صحیح ہو گا؟ کہنے لگا: نہیں، کیونکہ موجود ہوں گے تو محفوظ ہوں گے۔ تو میں نے کہا: اب بتاؤ! تمہارے سینے میں قرآن موجود ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں موجود ہے۔ میں نے کہا: اب دوسرا مسئلہ بتاؤ کہ کوئی آدمی قرآن مجید کو بیت الخلاء میں لے کر جا سکتا ہے؟ کہنے لگا: نہیں۔ میں نے کہا کہ تیسری بات بتاؤ کہ کوئی آدمی قرآن پاک بیت الخلاء میں نہیں لے کر جا سکتا تو جب تو بیت الخلاء جاتا ہے تو اپنے سینے کو پھاڑ کر قرآن پاک کو باہر نکال کر جاتا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ میں نے کہا کہ پھر قرآن پاک کی بے ادبی کرتا ہے؟ اس نے کہا کہ میرے سینے میں قرآن موجود ہے لیکن جسم سے پاک ہے، تو میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ بھی ہر جگہ موجود ہے لیکن جسم سے پاک ہے۔

یہ جو قرآن ہمارے سامنے موجود ہے اس کو بیت الخلاء میں لے کر جانا بے ادبی ہے لیکن جو سینے میں ہے اس کو لے کر جانا بے ادبی نہیں ہے کیونکہ یہ جسم والا ہے اور وہ جسم سے پاک ہے۔ جس طرح سینے میں قرآن پاک بلا جسم ہے، بیت الخلاء میں جائیں تو اشکال نہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی بلا جسم ہے، ہر جگہ موجود ہے، اب کوئی اشکال نہیں۔

اتحاد اور حلول میں فرق:

مجھے ایک آدمی کہنے لگا کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے؟ -میں پوری دنیا میں جاتا ہوں، مجھے ہر قسم کے لوگ ملتے ہیں- میں نے اسے کہا: جی ہاں۔ تو اس نے کہا کہ دنیا میں جب بھی دو چیزیں ہر جگہ موجود ہوتی ہیں تو ان دونوں میں یا اتحاد ہوتا ہے یا حلول ہوتا ہے؟ تو اب آپ بتائیے کہ اللہ تعالیٰ جس جگہ موجود ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کا اس جگہ کے ساتھ اتحاد ہوتا ہے یا حلول ہوتا ہے؟

اتحاد اور حلول کا معنی یہ ہے کہ چار پانچ چیزیں آپ اکٹھی کر لیں اور ان میں سے ہر ایک کا اپنا وجود قائم رہے تو اسے "اتحاد" کہتے ہیں، جیسے ہم ناشتے میں آملیٹ کھاتے ہیں، اس میں کیا ہوتا ہے؟ انڈہ، گھی، ٹماٹر، ہری مرچ اور کالی مرچ۔ تو ہر چیز الگ الگ نظر آتی ہے، یہ اتحاد ہے، اور حلول کی مثال چائے ہے، اس میں دودھ، پتی، چینی اور پانی ہوتا ہے لیکن جب چائے تیار ہو جاتی ہے تو ہر چیز کا وجود فنا ہو جاتا ہے کسی چیز کا وجود الگ الگ نہیں رہتا۔ یہ حلول ہے۔

اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا دوسری چیزوں میں اتحاد ہے یا حلول ہے؟ میں نے کہا کہ نہ اتحاد ہے اور نہ حلول ہے، اس نے کہا: اتحاد بھی نہیں حلول بھی نہیں تو پھر اللہ کیسے موجود ہیں؟ میں نے کہا کہ اتحاد اور حلول ان کا ہوتا ہے جن کا جسم ہو، اللہ جسم سے پاک ہے اور ہر جگہ موجود بھی ہے اس لیے اتحاد بھی نہیں اور حلول بھی نہیں۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ صرف عرش پر ہے وہ اس قسم کی دلیلیں پیش کرتے ہیں لوگوں کو پھنسانے کے لیے۔

اجمالاً ادب، تفصیلاً بے ادبی:

ایک اور علمی جواب ذہن میں رکھیں۔ یہ جو اس بندے نے کہا کہ کیا اللہ بیت الخلاء میں بھی ہے؟ تو اس کے جواب میں ایک اہم بات یہ سمجھیں کہ بعض چیزیں دنیا میں ایسی ہیں کہ آدمی ان کو تفصیلاً بیان کرے تو بے ادبی ہے اور اجمالاً بیان کرے تو ادب ہے۔ میں اس کی دو مثالیں بیان کرتا ہوں:

1: آپ کسی شخص سے کہو کہ تیرا بال اللہ نے بنایا، ماتھا اللہ نے بنایا، تیری آنکھ اللہ نے بنائی، تیرا منہ اللہ نے بنایا، تیرا سینہ اللہ نے بنایا، اب پاؤں تک گنتے جاؤ تو ہر عضو کا نام لے کر کہہ سکتے ہو کہ اللہ نے بنایا؟ (نہیں۔ سامعین) اگر میں سر سے لے کر پاؤں تک ہر عضو کا نام لے کر کہوں کہ یہ یہ عضو اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے تو آپ کہو گے کہ

کیسا عجیب آدمی ہے، یہ بات بھلا کہنے کی تھی؟ لیکن اگر یوں کہوں کہ سر سے لے کر پاؤں تک پورا جسم اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے تو آپ کہو گے: سبحان اللہ۔

2: اگر کوئی شخص اپنی بیٹی کا نکاح کر کے کسی کو دے دے تو داماد کو یہ تو کہہ سکے گا کہ میری بیٹی کا خیال رکھنا، اس کے سارے حقوق ادا کرنا، میں نے بڑی محبت اور پیار سے پالی ہے، لیکن کیا وہ شخص سارے حقوق کا نام لے کر کہہ بھی سکتا ہے کہ فلاں فلاں حق کا خیال رکھنا؟ (نہیں۔ سامعین) اجمالاً کہے گا تو ادب ہے، تفصیلاً کہے گا تو یہ بے ادبی ہے۔ لوگ بھی کہیں گے کہ کیسا باپ ہے! شرم نہیں آتی کہ داماد سے ایسی باتیں کرتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نمونہ ادب:

اس بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک صحابی سے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مسئلہ پوچھو، میں نہیں پوچھ سکتا کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی میرے نکاح میں ہے۔ انہوں نے کہا: مسئلہ یہ ہے کہ "إِنِّیْ رَجُلٌ مَذَّاءٌ" مجھے مَذِی بہت آتی ہے۔[152]

منی، مذی اور ودی کی تعریف:

انسان کے عضوِ خاص سے پیشاب کے علاوہ تین قسم کا پانی نکلتا ہے: مَنِی، مَذِی اور وَدِی۔

جب آدمی پیشاب کے لیے بیٹھتا ہے تو کبھی کبھی ایک سفید سا پانی نکلتا ہے، بسا اوقات وزن اٹھانے سے بھی نکلتا ہے، اس کو ودی کہتے ہیں۔ یہ بیماری کی وجہ سے نکلتا

152۔ مسند احمد: ج17 ص139 رقم الحدیث 23715

ہے، اور جب کوئی انسان اپنی بیوی سے گپ شپ کرتا ہے تو اس وقت جو سفید سا پانی نکلتا ہے اسے مذی کہتے ہیں، اور جب انسان اپنی بیگم سے جماع کرتا ہے تو اس وقت جو مادہ نکلتا ہے اسے منی کہتے ہیں۔ مذی اور ودی کے نکلنے سے وضو ٹوٹتا ہے اور منی کے نکلنے سے غسل واجب ہو جاتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ " إِنِّيْ رَجُلٌ مَذَّاءٌ " مجھے مذی بہت آتی ہے لیکن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا داماد ہوں، میں حضور سے یہ مسئلہ نہیں پوچھ سکتا، اس لیے تم پوچھ کر بتاؤ۔

اب بتائیں! میرا اور آپ کا داماد اور سسر کا رشتہ تو نہیں ہے، میں بیان کرتے ہوئے جھجک رہا ہوں اور آپ کو سنتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی ہے۔ تو اس صحابی نے جا کر پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! ایسی صورت ہو تو غسل کرنا چاہیے یا وضو؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِنَّ كُلَّ فَحْلٍ يُمْذِيْ فَإِذَا كَانَ الْمَنِيُّ فَفِيْهِ الْغُسْلُ وَإِذَا كَانَ الْمَذْيُ فَفِيْهِ الْوُضُوْءُ." [153]

ہر مرد کے ساتھ ایسا معاملہ ہوتا ہے، اس لیے اگر منی ہو تو غسل واجب ہوتا ہے اور اگر مذی ہو تو اس پر وضو ہوتا ہے، غسل نہیں ہوتا۔

تو بعض مسئلے آدمی اجمالاً تو پوچھ سکتا ہے، تفصیلاً نہیں پوچھ سکتا۔

تو میں کہہ رہا تھا کہ اللہ تعالی ہر جگہ پر ہے۔ کہاں کہاں پر ہے؟ اس کو تفصیل سے بتائیں گے تو بے ادبی ہو گی اور وہ چونکہ پرلے درجے کے بے ادب ہیں اس لیے گستاخ سوال ہی ایسا کرتے ہیں کہ اللہ بیت الخلاء میں ہے؟ - العیاذ باللہ - کم از کم اس

153۔ مصنف ابن ابی شیبۃ: ج 1 ص 529 رقم الحدیث 972

شخص کو سوچنا چاہیے کہ میں کیا بات کہہ رہا ہوں؟! ہمارے ہاں ادب بہت زیادہ ہے۔ اللہ ہم سب کو باادب رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

دعا میں ہاتھ اوپر کی طرف اٹھانے کی وجہ:

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس قسم کے ان کے دلائل ہیں جن سے یہ لوگ اشکالات پیدا کرتے ہیں۔ ایک بات اور بھی سمجھیں کہ جب ہم دعا مانگتے ہیں تو ہاتھ اوپر کی طرف اٹھاتے ہیں۔ اس پر یہ لوگ کہتے ہیں دعا میں ہاتھ اوپر کی طرف اٹھانے سے پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالی اوپر ہے، اگر اللہ تعالی اوپر نہ ہوتے تو آپ ہمیشہ اوپر ہاتھ نہ اٹھاتے۔

یہ بات یاد رکھنا! میں شروع میں بتا چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ چھ جہتوں سے پاک ہے؛ آگے، پیچھے، اوپر، نیچے، دائیں، بائیں، اور چھ جہتوں کو محیط بھی ہے۔ ان چھ جہتوں میں سے عقل کے اعتبار سے جہت فوق یعنی اوپر کی جانب کو عظمت حاصل ہے۔ ہمارے معاشرے میں اوپر کی جہت کو عظمت حاصل ہے۔ آپ کسی کو عزت دیتے ہیں تو اوپر بٹھاتے ہیں یا نیچے؟ (اوپر۔ سامعین) اس لیے ہم دعا کرتے وقت ہاتھ اوپر اٹھاتے ہیں کہ جہت فوق کو ہمارے معاشرے میں عظمت حاصل ہے، اس کا معنی یہ نہیں کہ خدا اوپر ہے۔

دیکھو! میں بیان کر رہا ہوں، میری آواز چاروں طرف جا رہی ہے اور جو بندہ پیچھے بیٹھا ہوا ہے اس کو ہم کہیں گے کہ ایسے نہیں بیٹھتے، آگے بیٹھ جاؤ اور بیان سنو! وہ کہتا ہے کہ مجھے آواز آ رہی ہے۔ آپ سب کہیں گے کہ اس نے اچھی بات نہیں کہی، کیوں کہ اگرچہ آواز چاروں طرف جا رہی ہے لیکن جب کسی کے سبق میں یا بیان میں بیٹھو تو ادب کا تقاضا یہ ہے کہ سامنے بیٹھو۔ اب کوئی یہ کہے کہ آواز تو پیچھے بھی جا رہی ہے، آگے کیوں بٹھاتے ہو؟ تو ہم کہیں گے کہ یہ ادب کا تقاضا ہے۔ اللہ ہر طرف ہے تو

دعا مانگتے ہوئے ہاتھ اوپر کیوں اٹھاتے ہو؟ تو ہم کہیں گے کہ یہ ادب کا تقاضا ہے۔

میں نے اس پر بڑی مختصر سی بات کی ہے کہ ﴿اَلرَّحۡمٰنُ عَلَى الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰى﴾ رحمٰن عرش پر مستوی ہے سے کبھی اس دھوکے میں نہ آنا کہ اللہ تعالی صرف عرش پر ہے۔

فریق مخالف سے چند سوالات:

انہوں نے تو عقلی شبہات پیش کیے اور ہم نے جوابات دیے اور ہم عقلی دلائل پیش کریں گے تو ان کا جواب ان کے پاس نہیں ہے اور واقعتاً نہیں ہے، میں کئی سالوں سے سوال کر رہا ہوں ابھی تک ہمارے سوالات کا جواب نہ کسی نے سوشل میڈیا پر دیا ہے اور نہ پرنٹ میڈیا پر دیا ہے۔

:1 میں عقلی دلیل پیش کرتا ہوں - اس کو یاد رکھنا - اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ اللہ تعالی عرش پر ہے، تو اس سے پوچھو کہ اگر اللہ عرش پر ہے تو پھر عرش مکان ہوا اور اللہ تعالی مکین ہوئے۔ مکین کہتے ہیں رہنے والے کو اور مکان کہتے ہیں رہنے کی جگہ کو، مکان مکین سے بڑا ہوتا ہے، دنیا میں مجھے ایک بندے کا نام بتا دیں کہ رہنے والا بڑا ہو اور رہنے کی جگہ چھوٹی ہو، دنیا میں کوئی ایک مثال دے سکتے ہو؟ (نہیں۔ سامعین)

اگر اللہ تعالی عرش پر رہتا ہے تو اللہ مکین اور عرش مکان ہوا، اور ضابطہ ہے کہ مکان؛ مکین سے بڑا ہوتا ہے تو "اللہ اکبر" کا معنی کیا ہو گا؟ جب مکان؛ مکین سے بڑا ہو گا تو اللہ اکبر کا عقیدہ ٹوٹ جائے گا۔ میں نے کہا: اس کا جواب تم دے دو لیکن ابھی تک جواب نہیں آیا اور آئے گا بھی نہیں، ان شاء اللہ۔

:2 اگر اللہ عرش پر ہے تو عرش مخلوق ہے اور اللہ خالق ہے، خالق ہمیشہ سے ہے مخلوق ہمیشہ سے نہیں ہے۔ اگر اللہ عرش پر ہے تو جب عرش نہیں تھا پھر اس وقت اللہ کہاں پر تھے؟

ہم پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا، کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالی ہر جگہ ہیں، جب عرش نہیں تھا تب بھی تھے اور جب عرش ہے تب بھی ہیں لیکن وہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالی عرش پر ہے تو اب ہمارا سوال بنتا ہے کہ جب عرش نہیں تھا تو اللہ تعالی کہاں تھے؟

3: ہمارا تیسرا سوال یہ ہے کہ اگر اللہ عرش پر ہے تو اللہ خالق اور عرش مخلوق، اللہ محدود ہے یا غیر محدود؟ (غیر محدود۔ سامعین) عرش جتنا بھی بڑا ہو محدود ہی ہو گا! اللہ خالق غیر محدود ہے اور عرش مخلوق محدود ہے، اب بتاؤ غیر محدود؛ محدود پر کیسے آ سکتا ہے؟

یہ ہمارے تین سوالات آپ یاد رکھ لیں، اگر تین نہیں تو ایک بھی یاد رکھ لیں گے تو ان شاء اللہ ان سے یہ ایک بھی نہیں ٹوٹے گا، آپ آزما کر دیکھ لیں۔

میں بار بار کیوں کہتا ہوں کہ اس درس قرآن کی قدر کرو، اس درس میں لوگوں کو لاؤ کہ وہ اس کو سنیں۔ یہ ہماری عقیدے کی جنگ ہے پوری دنیا میں اور یقین کریں میں تو جاتا ہوں الحمد للہ بڑے بڑے اکابر کہتے ہیں کہ مولانا صاحب! ہم سمجھتے ہیں کہ تیرا وجود اللہ کی نعمت ہے، ہر دور میں اللہ کسی ایسے بندے کو پیدا فرماتے ہیں اور اس سے اپنے دین کا دفاع کرواتے ہیں۔ دیکھو! ہم پوری دنیا میں دفاع کر رہے ہیں، کوئی ٹینشین نہیں ہے، کوئی پریشانی نہیں ہے، اللہ کریم کا شکر ہے، ہمیں کوئی لالچ نہیں ہے، کتنے بے لوث طریقے سے لگے ہوئے ہیں۔ اللہ آپ کو بھی قبول فرمائے اور اللہ ہمیں بھی قبول فرمائے۔ (آمین۔ سامعین)

اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ:

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝۸﴾

اسمائے حسنی پر تھوڑی سی بات کر لیتے ہیں۔ حدیث پاک ہے، نبی کریم صلی

اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اِنَّ لِلّٰہِ تِسْعَۃً وَ تِسْعِیْنَ اسْمًا مِأَۃً اِلَّا وَاحِداً مَنْ اَحْصَاھَا دَخَلَ الْجَنَّۃَ." [154]

کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں، جو شخص ان کو یاد کر لے گا وہ جنت میں داخل ہو گا۔

ہمارے ہاں مرکز اھل السنۃ والجماعۃ میں تخصص کے لیے جو طلبہ آتے ہیں ہم ان کو یہ نام یاد کرواتے ہیں۔

اسمائے حسنیٰ کے متعلق چند باتیں:

اور اس کے متعلق دو تین باتیں یاد رکھیں!

[1]: پہلی بات... یہ جو حدیث میں ہے کہ جو شخص اللہ کے ننانوے نام یاد کرے اس کو جنت ملے گی، اس کا معنی ہر گز یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے صرف یہی ننانوے نام ہیں بلکہ ان کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے نام اور بھی ہیں۔ یہ فضیلت ننانوے ناموں کی ہے کہ جو ان کو یاد کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں جگہ عطا فرمائے گا۔

[2]: اسمائے حسنیٰ کو دو طرح پڑھنا جائز ہے:

پہلا طریقہ... "ھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ"

دوسرا طریقہ... "یَاھُوَ اللّٰہُ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ یَارَحْمٰنُ یَارَحِیْمُ یَامَلِكُ یَاقُدُّوْسُ یَاسَلَامُ یَامُؤْمِنُ"

یاء حرفِ ندا کے ساتھ بھی پڑھ سکتے ہیں اور بغیر یاء کے بھی پڑھ سکتے ہیں،

154۔ صحیح البخاری، رقم:2736

جب بغیر یاء کے پڑھیں گے تو الف لام کے ساتھ پڑھیں گے جیسے "اَلرَّحْمٰنُ" اور جب یا کے ساتھ پڑھیں گے تو الف لام کے بغیر پڑھیں گے جیسے "یَارَحْمٰنُ"۔

[3]: اللہ تعالیٰ کے وہ نام جو قرآن کریم یا احادیث مبارکہ سے ثابت ہیں ان ناموں سے اللہ تعالیٰ کو پکارنا بالکل جائز ہے اور جو نام قرآن کریم یا احادیث مبارکہ میں نہیں ہیں بلکہ بہت سارے لوگ اپنی اپنی زبان میں اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی لفظ استعمال کرتے ہیں تو اب اس لفظ کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لیے جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ اگر وہ لفظ ایسا ہے جو ان لوگوں کے ہاں اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے متعین ہے، اس لفظ کو بول کر اس سے صرف اللہ کی ذات مراد ہوتی ہے اگرچہ وہ عجمی زبان کا لفظ ہو تو بھی اللہ کے لیے استعمال کرنا جائز ہے۔

ذات باری تعالیٰ کے لیے لفظ "خدا" کا استعمال:

جیسے ہمارے ہاں لوگ لفظ "خدا" کو اللہ کی ذات کے لیے استعمال کرتے ہیں، جب ہم کہتے ہیں "خدائے پاک" تو اس سے مراد کیا ہوتا ہے؟ (اللہ۔ سامعین) اللہ تعالیٰ کی ذات مراد ہوتی ہے۔ یہ متعین ہے۔ لہذا ہماری زبان میں خدائے پاک کہنا جائز ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اور جو ہمارے بعض علماء فرماتے ہیں کہ ایسا کہنا ٹھیک نہیں ہے، تو میں آپ کی خدمت میں بارہا عرض کرتا ہوں کہ میں ان کا نام نہیں لیتا اور میرے سامنے نام لے کر تردید نہ کروایا کرو، یہ مناسب نہیں ہے، ہمارے بعض حضرات بڑے عالم ہوتے ہیں، مبلغ بڑے ہوتے ہیں، واعظ بڑے ہوتے ہیں لیکن ان کا تحقیقی مزاج نہیں ہوتا اس لیے وہ ایسی باتیں فرما دیتے ہیں جو ان کی شان کے مناسب نہیں ہوتیں۔ ہر بندے کو اپنے دائرے میں رہ کر کام کرنا چاہیے، اس کا فائدہ بہت زیادہ ہوتا ہے، قاری صاحب کو صرف قرآن پڑھ کر سنانا چاہیے، اس کا ترجمہ نہیں کرنا چاہیے، تبلیغ والوں کو دیکھو وہ

جب چھٹے نمبر بیان کریں تو کہتے ہیں کہ "حدیث پاک میں ہے جس کا مفہوم یہ ہے۔۔۔" اور یہ کہنا بھی چاہیے بہت اچھی بات ہے۔ آپ اس سے پوچھیں کہ ایسے کیوں کہتے ہو؟ تو جواب دے گا کہ بھائی! میں عالم تو ہوں نہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کا ترجمہ مجھ سے صحیح نہ ہو سکے اور میں قیامت کے دن پکڑا جاؤں۔ اب ہر بندہ سمجھتا ہے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ نہیں بیان کر رہا بلکہ مفہوم بیان کر رہا ہے، اب اس پر اعتراض کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے، اور یہ ہمارے اکابرین نے بہت اچھا رخ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس لیے "خدا" کا لفظ استعمال کرنا ناجائز نہیں ہے، میں آپ کو بتا چکا ہوں، آج دوبارہ بتا دیتا ہوں تاکہ آپ اچھی طرح سمجھیں۔

ایک شخص کی متکلمِ اسلام سے گفتگو:

مجھے ایک شخص کہنے لگا کہ "خدا" کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے کہا: کیوں؟ کہنے لگا: خدا کی جمع خدایان آتی ہے اور اللہ تعالیٰ ایک ہے، اللہ کئی نہیں ہو سکتے۔ میں نے کہا کہ اگر یہ مان لیا جائے تو پھر اللہ کو "رحیم" بھی نہیں کہنا چاہیے اس کی جمع قرآن میں "رُحَمَآء" آئی ہے، پھر اللہ تعالیٰ کو "رب" بھی نہیں کہنا چاہیے کیونکہ قرآن میں اس کی جمع "اَرْباب" آئی ہے، پھر اللہ تعالیٰ کو "اِلٰہ" بھی نہیں کہنا چاہیے کیونکہ اس کی جمع "اٰلِهَةٌ" آئی ہے، اس طرح تو پھر کچھ بھی نہیں کہنا چاہیے۔

وہ کہنے لگا: ہماری دلیل ایک اور بھی ہے۔ میں نے کہا: وہ بھی سنا دو۔ کہنے لگا: دین عربی میں ہے اور "خدا" عجمی لفظ ہے۔ تو میں نے اسے کہا کہ یہ بتاؤ کہ روزانہ کتنی نمازیں فرض ہیں؟ کہنے لگا: پانچ۔ میں نے کہا کہ سال میں کتنے روزے فرض ہیں؟ کہنے لگا: ایک ماہ۔ میں نے کہا آپ "اَلصَّلَوَاتُ الْخَمْسَةُ فَرْضٌ" اور "صِیَامُ شَهْرٍ فَرْضٌ"

کہا کرو، یوں نہ کہو کہ پانچ نمازیں فرض ہیں، ایک ماہ کے روزے فرض ہیں۔ وہ کہنے لگا: کیوں؟ میں نے کہا کہ دین عربی میں ہے، روزہ کیوں کہتے ہو؟ دین عربی میں ہے، نماز کیوں کہتے ہو؟ کہنے لگا کہ جب عربی میں بات کریں گے تو صوم وصلوٰۃ کہیں گے اور جب اردو میں کریں گے تو نماز روزہ کہیں گے، تو میں نے کہا کہ جب عربی میں بات کریں گے تو اللہ، محمد کہتے ہیں اور جب اردو میں بات کریں گے تو خدا اور پیغمبر کہیں گے، تم جو بات کرو تو ٹھیک ہے ہم کریں تو ٹھیک کیوں نہیں؟ میں نے کہا: کوئی اور دلیل ہے تو پیش کر سکتے ہو، لیکن اب خاموش ہو گیا۔

تفسیر تو پاک کر دی مفسر کا کیا ہو گا؟

ایک تفسیر ہے اس کا نام ہے ”احسن البیان“، مصنف کا نام ہے محمد جونا گڑھی۔ آج کل سعودیہ سے تقسیم ہوتی ہے اور چل رہی ہے۔ اس کے مقدمے میں صلاح الدین یوسف نے لکھا ہے کہ اس پوری تفسیر میں جہاں جہاں لفظ ”خدا“ لکھا تھا ہم نے اس کو کاٹ دیا ہے اور وہاں لفظ ”اللہ“ لکھ دیا ہے، کیوں؟ اس لیے کہ لفظ ”خدا“ سے شرک کی بو آتی ہے، ہم نے اس کو مٹا کر لفظ ”اللہ“ لکھ دیا ہے تاکہ اس سے شرک کی بو نہ آئے۔ محمد جونا گڑھی فوت ہو چکا ہے، میں نے کہا کہ لفظ ”خدا“ کو کاٹ کر تفسیر کو تو توحیدی بنا دیا اور مصنف تو آپ کے گمان کے مطابق مشرک مر گیا، کیوں کہ مصنف لفظ ”خدا“ لکھتا رہا اور آپ نے لفظ خدا کاٹ کر لفظ اللہ لکھ دیا، تو وہ خدا خدا لکھ کر مر گیا بعد والے اللہ اللہ پڑھیں گے تو پڑھنے والے توحیدی ہو جائیں گے اور لکھنے والا شرک میں فوت ہوا، میں نے کہا کہ تفسیر تو تم نے پاک کر دی اب اس کے مفسر کا کیا کرو گے؟

ہم کہتے ہیں کہ اللہ کہنا بھی ٹھیک ہے اور خدا کہنا بھی ٹھیک ہے۔ تو جب ہماری بات مانو گے تو مصنف موحد ہو گا اور ان کی بات مانو گے تو مشرک ہو گا۔ اس لیے

ایسی باتیں چھوڑو جس سے امت کا نقصان ہو، امت ٹوٹتی ہو، ایسے فتووں کی زد میں پھر اپنے اکابر آجاتے ہیں۔

اتحاد امت کے لیے چار نکاتی ایجنڈا:

امت میں اتحاد کے حوالے سے میں آپ کے سامنے چار باتیں پیش کرتا ہوں، باقی دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث اختلاف تو ختم ہو گا نہیں، کیوں کہ کسی نے اپنا مسلک تو چھوڑنا نہیں، اپنی مسجد چھوڑ کر آپ کی مسجد میں آنا نہیں، اس لیے چار کام کریں:

1: ایک دوسرے کو کافر نہ کہیں۔

2: ایک دوسرے کے اکابر کی پگڑیاں نہ اچھالیں۔

3: اپنی مسجد میں اپنا مسلک اور مسئلہ بیان کریں اور دوسرے کا نام لے کر تردید نہ کریں۔

4: کبھی قومی اور بین الاقوامی ایشوز پر اور کسی بڑے فورم پر اکٹھے ہونے کی ضرورت پڑے تو پھر سارے اکٹھے ہو جائیں۔

مثلاً ختم نبوت کا مسئلہ آئے تو سارے اکٹھے ہو جائیں، آئین کا مسئلہ آئے تو سارے اکٹھے ہو جائیں، پاکستان کے دفاع کا مسئلہ آئے تو سارے اکٹھے ہو جائیں، پاکستان کو بچانے کا مسئلہ آئے سارے اکٹھے ہو جائیں، دہشتگردی پر لعنت بھیجنی ہے تو سارے اکٹھے ہو جائیں، فرقہ واریت کو ختم کرنا ہے تو سارے اکٹھے ہو جائیں۔ اب بتاؤ! میں اتحاد کا درس دے رہا ہوں یا اختلاف کا درس دے رہا ہوں؟ (اتحاد کا۔ سامعین) کتنا آسان سانسخہ ہے اور میں لڑائی ختم کر رہا ہوں، لڑائی بڑھا نہیں رہا۔

تو خیر میں نے اسمائے حسنی کے حوالے سے بات کی ہے۔ ایسا لفظ جو عربی زبان کا نہ ہو اور یہ بھی پتا نہ ہو کہ اس کو کس معنی میں استعمال کیا جاتا ہے تو ایسے لفظ کا

استعمال اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے ناجائز ہے۔

[4]: اسمائے حسنیٰ کے حوالے سے چوتھی بات ذہن نشین فرمائیں۔ یہ بہت ہی اہم مسئلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وہ نام جو قرآن کریم یا احادیث مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی اور کے لیے استعمال ہوا ہے تو اس لفظ کو اللہ کے غیر کے لیے استعمال کر سکتے ہیں اور جو لفظ اللہ تعالیٰ کے غیر کے لیے استعمال نہیں ہوا تو اس کو اللہ کے غیر کے لیے استعمال نہیں کر سکتے۔ میں اس کی مثال دیتا ہوں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ [155]

اے لوگو! تمہارے پاس تمہی میں سے ایک رسول آیا ہے، جسے تمہاری تکلیف بہت گراں گزرتی ہے، اس نبی کو تو ہمیشہ تمہاری بھلائی کی فکر لگی رہتی ہے اور یہ نبی مؤمنوں کے لیے انتہائی شفیق اور بہت مہربان ہے۔

اس آیت میں "رؤف" اور "رحیم" صفات ہیں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حالانکہ رؤف اور رحیم؛ اللہ تعالیٰ کے نام بھی ہیں۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ رؤف اور رحیم کا لفظ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ نبی پاک صلی اللہ علیہ سلم کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ تو آپ کسی بندے کو جس کا نام عبد الرؤف ہو "رؤف" کہنا چاہیں اور عبد الرحیم نامی بندے کو "رحیم" کہنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں لیکن پورے قرآن میں اور احادیث مبارکہ میں "الرحمٰن" کا نام اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کے لیے استعمال نہیں ہوا، اس لیے عبد الرحمٰن کو "رحمٰن بھائی" نہیں کہہ سکتے۔ "علی" یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام بھی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ

155۔ التوبۃ128:9

نہیں فرمایا کہ اس نام کو ختم کر دو۔ معلوم ہوا کہ اس نام کو رکھ سکتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿اَلَیۡسَ مِنۡکُمۡ رَجُلٌ رَّشِیۡدٌ ﴿۷۸﴾﴾ [156]

"رشید" عام آدمی کے لیے استعمال ہوا ہے اس لیے آپ عبد الرشید کو "رشید بھائی" کہہ سکتے ہیں۔

اسمائے حسنیٰ کے ذریعے دعائے مستجاب کا مجرّب طریقہ:

اور آخر میں ایک بات عرض کر دیتا ہوں۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ بھائی ہم دعا مانگتے ہیں لیکن ہماری دعا قبول نہیں ہوتی، ہمیں دعا کرنے کا کوئی طریقہ بتا دو۔ تو دعا کرنے کا طریقہ یاد رکھیں! پہلے گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھیں، پھر سورہ حشر کے آخری رکوع ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ لۡتَنۡظُرۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ لِغَدٍ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ کی تلاوت شروع کریں اور جب ﴿لَوۡ اَنۡزَلۡنَا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیۡتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنۡ خَشۡیَةِ اللّٰهِ﴾ تک پہنچیں تو تلاوت روک دیں۔ اس وقت یہ دعا کریں کہ اے اللہ! میری یہ ضرورت، میری یہ مصیبت، میری یہ تکلیف میرے لیے پہاڑ کی طرح ہے، آپ کی قدرت و طاقت کے سامنے اس کی کیا حیثیت ہے؟! اے اللہ! میری اس حاجت کو پورا فرما دیں۔ اس کے بعد پھر آگے تلاوت شروع کر دیں۔ پھر جب ﴿لَهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی﴾ پر پہنچیں تو اللہ تعالیٰ کے ان ننانوے اسمائے حسنیٰ کو پڑھ لیں، اسمائے حسنیٰ پڑھتے ہوئے دل میں اپنی مراد کا تصور کریں اور رکوع کے اختتام پر گیارہ بار درود شریف پڑھ لیں اور آخر میں اپنی مراد مانگیں۔ اس

156۔ ھود 78:11

طرح دعا مانگیں تو ان شاء اللہ دعائیں قبول ہوں گی۔

اللہ تعالیٰ تکلفات سے محفوظ رکھے:

میں اکثر یہ بات مزاح میں کہتا ہوں کہ آپ قبول اس لیے نہیں فرماتے کہ میں پیروں کے روپ میں آکر نسخہ نہیں بتاتا۔ ہمارے ہاں بہت عجیب سا مسئلہ ہے کہ جب تک آپ مخصوص اسٹائل اختیار نہ کریں لوگ آپ کو بزرگ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے۔ وہ اسٹائل یہ ہیں: قاری صاحب! نماز پانچ منٹ لیٹ کرو حضرت تشریف لارہے ہیں۔ اب آپ سمجھیں گے کہ مولانا گھمن بہت بڑے آدمی ہیں کیونکہ ان کی وجہ سے نماز لیٹ ہوگئی اور آپ کو انتظار کرنا پڑ گیا۔ اچھا! نماز پڑھ لی اور میں کہتا ہوں کہ آپ ذرا تھوڑی دیر بیٹھیں، میں تازہ وضو کر کے آتا ہوں، آپ سب کہیں گے کہ جی بہت بڑا آدمی ہے۔ درس ہو گیا، اعلان ہو گا کہ بھائی! آپ ابھی مصافحہ نہ کریں حضرت نے چائے پینی ہے، اور چائے بھی آپ خود ڈال کر دیں، بسکٹ بھی آپ دیں، چینی بھی آپ ڈال کر دیں تو سب سمجھیں گے کہ بڑا آدمی ہے۔ اور ہماری ترتیب یہ نہیں ہے بلکہ ہم تو وقت پر آتے ہیں اور وقت پر جاتے ہیں، ہم چائے میں چینی بھی خود ڈالتے ہیں اور خود اٹھا کر پی لیتے ہیں اس لیے ہمیں کوئی ولی نہیں سمجھتا۔

اللہ گواہ ہے مجھے لوگ کہتے ہیں کہ مولانا صاحب! اگر آپ پیر بننا چاہتے ہیں تو ہم آپ کو طریقہ بتا دیتے ہیں۔ میں کراچی گیا- آپ یقین فرمائیں- مجھے کراچی کے لوگوں نے کہا: اگر آپ نے بڑے لوگوں کے ہاں مقبول ہونا ہے تو سب سے پہلا کام یہ کریں کہ آپ کراچی والوں کا فون سننا چھوڑ دیں، کسی لڑکے کو فون دیں اور وہ کہے کہ حضرت مصروف ہیں، دو گھنٹے کے بعد فون کرنا، وہ پھر فون کریں تو لڑکا کہے کہ حضرت سبق میں ہیں، پھر فون کرے تو کہے کہ حضرت آرام میں ہیں، فلاں کام میں مصروف ہیں تو اب لوگ کہیں گے کہ مولانا صاحب بہت بڑے آدمی ہیں اور آپ تو بذات خود

فون اٹھاتے ہیں کہ مولانا الیاس گھمن بات کر رہا ہوں تو اس طرح آپ کو کون بڑا سمجھے گا؟ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان تکلفات سے محفوظ رکھے، اللہ کے ہاں بندے کی قیمت بن جائے بہت بڑی بات ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کو عطائے نبوت:

﴿وَهَلۡ اَتٰىكَ حَدِيۡثُ مُوۡسٰى ۘ‏ ﴿۹﴾ اِذۡ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهۡلِهِ امۡكُثُوۡۤا اِنِّىۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا لَّعَلِّىۡۤ اٰتِيۡكُمۡ مِّنۡهَا بِقَبَسٍ اَوۡ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ﴿۱۰﴾﴾

کیا آپ کے پاس موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ پہنچا ہے، جب انہوں نے آگ دیکھی تو اپنے گھر والوں سے کہا کہ یہیں ٹھہرو، میں نے آگ دیکھی ہے، شاید میں اس آگ میں سے کوئی شعلہ تمہارے پاس لے آؤں یا آگ کے پاس جا کر مجھے راستے کا پتہ چل جائے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین سے واپس تشریف لائے تو ان کے گھر والے بھی ساتھ تھے، گھر والے امید سے تھے۔ اس سفر میں کچھ بکریاں بھی آپ کے ساتھ تھیں۔ آپ راستہ بھول گئے۔ آپ کے گھر والوں کو ولادت کی تکلیف شروع ہو گئی، سردی بہت تھی، انتظامات نہیں تھے، آپ کے پاس چقماق تھا کہ پتھر کو پتھر پر مارتے تو آگ نکلتی لیکن کوشش کے باوجود اس سے آگ نہ نکلی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دور سے ایک درخت کو جلتا ہوا دیکھا تو اپنے گھر والوں سے کہا کہ یہاں ٹھہرو، میں وہاں سے آگ لے کر آتا ہوں۔ آپ جب اس درخت کے قریب پہنچے تو عجیب منظر دیکھا کہ اس درخت کی کوئی شاخ یا پتا جلتا نہیں ہے بلکہ آگ نے درخت کے حسن اور خوبصورتی کو مزید بڑھا دیا ہے۔ یہ منظر کچھ دیر تو دیکھتے رہے اور انتظار میں رہے کہ شاید کوئی آگ کی چنگاری زمین پر گرے، کوئی ٹہنی نیچے گرے تو میں اٹھا کر لے جاؤں گا۔ جب کافی دیر تک ایسا نہ ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے کچھ گھاس یا سوکھی

لکڑی لی کہ درخت کے قریب کرتا ہوں تاکہ اسے آگ لگ جائے۔ جب آپ وہ گھاس یا سوکھی لکڑی آگ کے قریب کرتے تو آگ پیچھے ہٹ جاتی اور جب آپ پیچھے ہٹ جاتے تو آگ آپ کی طرف آجاتی۔ اس سے موسیٰ علیہ السلام کو بہت تعجب ہوا کہ یہ کیاماجرا ہے؟

درخت سے آواز آنا:

اسی دوران اس درخت سے موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالی کی طرف سے یہ آواز آئی:

﴿اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی ﴿۱۲﴾﴾

اے موسیٰ! میں تمہارا رب ہوں، اپنے جوتے اتار دو کیونکہ تم اس وقت طوی کی مقدس وادی میں ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب "یٰمُوْسٰی" کے لفظ سے پکارا گیا تو آپ نے لبیک کہا اور عرض کیا کہ نے کہا کہ یہ تو میں پہچان گیا ہوں کہ یہ میرے اللہ کی آواز ہے لیکن آواز کس طرف سے آرہی ہے اور اللہ کس طرف ہیں؟ یہ مجھے سمجھ نہیں آرہی۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمہارے اوپر، سامنے، پیچھے اور تمہارے ساتھ ہوں، میں ہر طرف ہوں۔ یہ وضاحت روایات میں موجود ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہاں پر اللہ تعالیٰ نے نبوت کی بشارت دی اور آپ سے فرمایا:

﴿وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی ﴿۱۳﴾ اِنَّنِیْۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ﴿۱۴﴾﴾

میں نے تمہیں نبوت دینے کے لیے منتخب کر لیا ہے اس لیے جو وحی تم پر

بھیجی جارہی ہے اسے غور سے سنو۔ میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اس لیے میری عبادت کرو اور مجھے یاد رکھنے کے لیے نماز قائم کرو!

حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے۔ اپنی اہلیہ کو بتایا کہ مجھے نبوت ملی ہے۔ تو اس کا تذکرہ اللہ نے ان آیات میں کیا ہے۔

مقدس مقامات میں جوتے اتارنا ادب ہے:

﴿يٰمُوْسٰى ﴿١١﴾ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿١٢﴾﴾

آپ جب وہاں پہنچے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز آئی کہ اے موسیٰ! میں تمہارا رب ہوں، اپنے جوتے اتار دو کیونکہ تم اس وقت طوی کی مقدس وادی میں ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جوتے کیوں اتروائے گئے؟ بعض مفسرین فرماتے ہیں تاکہ پاؤں براہ راست اس وادی کے ساتھ لگ جائیں اور برکت حاصل ہو جائے یا وجہ یہ تھی کہ وہ جگہ پاک تھی اور موسیٰ علیہ السلام کے جوتے مردار کی کھال کے بنے ہوئے تھے۔ خیر جو بھی وجہ تھی فرمایا کہ جوتے اتار دو۔

اس آیت کے تحت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے معارف القرآن میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بشیر بن خصاصیہ رضی اللہ عنہ کو قبروں کے درمیان جوتا پہن کر چلتے ہوئے دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اِذَا كُنْتَ فِيْ مِثْلِ هٰذَا الْمَكَانِ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ"

کہ جب تم اس جیسی جگہ پر چل رہے ہو تو اپنے جوتے اتار لیا کرو۔ [157]

اس سے معلوم ہوا کہ اکابرین کی قبور کے پاس جو جوتے اتارے جاتے ہیں وہ ناجائز نہیں ہے۔ اس لیے میں گزارش کرتا ہوں کہ اپنے اکابر کا کوئی واقعہ بظاہر خلاف

157۔ تفسیر معارف القرآن: ج6 ص70، تفسیر الجامع لاحکام القرآن: ج2 ص1994

شریعت نظر آرہا ہو تو اس میں جلد بازی سے کام نہ لیا کریں بلکہ اپنے علم کی کوتاہی کا اعتراف کریں اور اس کے متعلق دلائل تلاش کرتے رہیں۔

میں بھی جب اپنے مشائخ کی قبور پر جاتا اور بعض لوگوں کو دیکھتا کہ وہ جوتے باہر اتارتے اور ننگے پاؤں اندر جاتے تو میں بسااوقات جوتے اتار دیتا اور جہاں چٹائی وغیرہ نہ ہوتی تو جوتے پہن کر جاتا مگر تردد میں رہتا کہ قبروں کے درمیان چلتے ہوئے لوگ جوتے کیوں اتار دیتے ہیں؟ لیکن میں نے کبھی اعتراض نہیں کیا، نہ ہی ساتھ والوں کے سامنے کسی اعتراض کا اظہار کیا، کیونکہ جب مجھے اضطراب ہے تو ساتھ والے بھی ظاہری بات ہے پریشان ہوں گے اور جواب ہمارے پاس ہے نہیں تو خاموشی بہتر ہے۔ جب درس قرآن کے لیے ان آیات کا میں نے مطالعہ کیا اور معارف القرآن کو دیکھا تو اشکال ختم ہو گیا۔ اس سے میرے اوپر اپنی جہالت کھلی کہ ہمارا علم کتنا تھوڑا سا ہوتا ہے اور کتنی جلدی اعتراض شروع کر دیتے ہیں۔ اس لیے اپنے علم اور اپنی کوتاہی کو دیکھنا چاہیے اور اعتراض میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔

نماز ایک اہم عبادت ہے:

﴿اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ ﴿۱۴﴾﴾

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اس لیے میری عبادت کرو اور مجھے یاد رکھنے کے لیے نماز قائم کرو!

﴿فَاعۡبُدۡنِیۡ﴾ میں تمام عبادات حتیٰ کہ نماز بھی آ گئی ہے، پھر دوبارہ نماز کا ذکر اس لیے فرمایا کہ نماز عام عبادات کی بنسبت بہت اہم ہے، تو بطورِ خاص پھر نماز کا ذکر فرمایا۔

قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے:

﴿إِنَّ السَّاعَةَ ءَاتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا لِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ ﴿١٥﴾﴾

قیامت آنے والی ہے، میں اس کے علم کو مخفی رکھنا چاہتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے قیامت کے وقت کو مخفی رکھا ہے، کسی کو اس کا علم نہیں ہے، نہ فرشتوں کو نہ ہی انبیاء علیہم السلام میں سے کسی کو علم ہے کہ قیامت کب آئے گی۔ قیامت کے دن ہر آدمی کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔

بری صحبت سے بچنا ضروری ہے:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نصیحت کی جارہی ہے ہمیں سمجھانے کے لیے کہ بری صحبت سے بچیں۔ فرمایا:

﴿فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ﴿١٦﴾﴾

تمہیں قیامت کے معاملے میں ایسا شخص غافل نہ کرنے پائے جو قیامت پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی خواہشات کے پیچھے پڑا ہوا ہے، ورنہ آپ ہلاکت میں پڑ جائیں گے۔

تو یہ ان کو بتایا جارہا ہے ہمیں سمجھانے کے لیے کہ ایسے لوگوں کی صحبت سے بچنا ضروری ہے جن کے عقائد اور اعمال خراب ہوں، ان کی صحبت کی وجہ سے انسان خود تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اَلرَّجُلُ عَلٰى دِيْنِ خَلِيْلِهٖ فَلْيَنْظُرْ أَحَدُكُمْ مَنْ يُخَالِلُ." [158]

آدمی اپنے دوست کے دین پر چلتا ہے، اس لیے تم میں سے ہر کسی کو دیکھنا چاہیے کہ میری دوستی کس کے ساتھ ہے۔

158۔ سنن ابی داؤد، رقم: 4833

سبعہ معلقہ میں ایک شعر ہے:

عَنِ الْمَرْءِ لَا تَسْأَلْ وَسَلْ عَنْ قَرِيْنِهٖ
فَإِنَّ الْقَرِيْنَ بِالْمُقَارِنِ يَقْتَدِيْ

کسی کے بارے میں دیکھنا ہو کہ بندہ کیسا ہے تو اس بندے کو نہ دیکھو بلکہ اس کے دوستوں کو دیکھو، ہم نشینوں کو دیکھو، اگر یہ اچھا ہو گا تو اچھے لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہو گا اور گندوں کے ساتھ بیٹھنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ بندہ ٹھیک نہیں ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے معجزات:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں عصا تھا تو اللہ تعالیٰ نے پوچھا:

﴿وَ مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿١٧﴾﴾

اے موسیٰ! یہ آپ کے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟

[1]: عصائے موسیٰ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں عرض کیا:

﴿هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَ اَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَ لِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿١٨﴾﴾

فرمایا کہ یہ میری لاٹھی ہے، میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں کے لیے درختوں سے پتے جھاڑتا ہوں اور ان کاموں کے علاوہ اس لاٹھی سے اور بھی کام لیتا ہوں۔

موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے یہ سوال کیوں فرمایا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ آئندہ چل کر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کی اس لاٹھی کو اژدھا اور سانپ بنانا تھا اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہلے متنبہ کر دیا کہ تسلی کر لیں اور

قلبی اطمینان کر لیں کہ یہ لکڑی کی لاٹھی ہے۔ جب انہوں نے دیکھ لیا کہ یہ لاٹھی ہے تب اللہ تعالیٰ نے اس کو سانپ بنانے کا معجزہ ظاہر کیا ورنہ موسیٰ علیہ السلام کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ شاید میں رات کے اندھیرے میں لاٹھی کی جگہ سانپ کو پکڑ کر لایا ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ اس لیے فرمایا تاکہ جب یہ لاٹھی پھینکیں اور وہ سانپ بن جائے تو پہلے سے موسیٰ علیہ السلام ذہن میں ہو کہ یہ لاٹھی ہی ہے جو میرے ہاتھ میں تھی اور وہی سانپ بنی ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ تو سمجھانے کے لیے پوچھا کہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟

یہاں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے جو باتیں فرمائی ہیں وہ مانوس کرنے کے لیے ہیں کیونکہ پہلے اچانک آگ کو دیکھا، پھر آواز کو سنا تو حیرانی ہوئی۔ اس لیے اب مانوس کرنے کے لیے اللہ نے آپ سے یہ باتیں ارشاد فرمائیں۔

بعض حضرات مفسرین یہ بات فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام سے جب پوچھا کہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ تو آپ نے جواب میں تین باتیں کیوں فرمائیں؟ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت تھی تو جس سے محبت ہوتی ہے آدمی بہانے تلاش کرتا ہے کہ میں اس سے زیادہ سے زیادہ بات کروں۔

﴿قَالَ اَلۡقِهَا يٰمُوۡسٰى ﴿۱۹﴾ فَاَلۡقٰهَا فَاِذَا هِىَ حَيَّةٌ تَسۡعٰى ﴿۲۰﴾ قَالَ خُذۡهَا وَلَا تَخَفۡ ۚ سَنُعِيۡدُهَا سِيۡرَتَهَا الۡاُوۡلٰى ﴿۲۱﴾﴾

اے موسیٰ! اس لاٹھی کو پھینکو۔ آپ نے پھینکا تو وہ ایک دوڑتا ہوا سانپ بن گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کو پکڑو اور خوف محسوس نہ کرو، ہم اس کو دوبارہ اس طرح کا عصا بنا دیں گے۔

ایک بات یہ سمجھیں کہ قرآن کریم میں یہاں لفظ "حَيَّةٌ" ہے، ایک اور مقام پر "ثُعۡبَانٌ" ہے۔ ثعبان کہتے ہیں بڑے اژدہا کو اور حیۃ کہتے ہیں باریک سانپ کو۔

تو دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ جب شروع میں تھا تو یہ سانپ باریک تھا آہستہ آہستہ بڑا ہوتے ہوتے اژدہا بن گیا اور یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تھا تو بہت بڑا اژدہا لیکن رفتار میں ایسا دوڑتا تھا جیسے باریک سانپ دوڑتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ بعض لوگ بدن میں بہت موٹے ہوتے ہیں لیکن ان کے بدن میں چستی اتنی ہوتی ہے کہ دبلے پتلے لوگوں سے بھی زیادہ تیز دوڑتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب عصا کو پھینکا اور وہ سانپ بنا تو موسیٰ علیہ السلام دوڑے اور دوسرے مقام پر ہے کہ واپس دوڑے تو اللہ نے فرمایا کہ ڈرو مت! ہم دوبارہ اس کو عصا بنا دیں گے۔

موسیٰ علیہ السلام کا ڈرنا یہ طبعی خوف تھا، بشری تقاضا تھا، یہ نہ نبوت کے خلاف ہے اور نہ ہی ایمان کے خلاف ہے، اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے، طبعی خوف ہوتا ہے۔

[2]: یدِ بیضاء

﴿وَ اضۡمُمۡ یَدَکَ اِلٰی جَنَاحِکَ تَخۡرُجۡ بَیۡضَآءَ مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ اٰیَۃً اُخۡرٰی ﴿۲۲﴾﴾

دوسرا معجزہ یہ تھا کہ اپنے ہاتھ کو اپنی بغل کے نیچے ڈال دو، جب باہر نکالا تو چمکتا تھا، اس میں بے عیب سفیدی تھی۔ یہ دو نشانیاں آپ کو دی ہیں۔ اب فرعون کے پاس جاؤ، اس کو دین کی دعوت دو۔ آگے آئے گا کہ کیا باتیں کرنی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے جب نبوت عطا فرمائی تو دو معجزے عطا فرمائے۔

داعی کی ضرورت تین چیزیں:

فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا تو موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے تین باتیں

دعا میں مانگیں اور تینوں چیزیں وہ ہیں جو ایک داعی اور مبلغ کی ضرورت ہوتی ہیں:

[1]: ﴿رَبِّ اشۡرَحۡ لِیۡ صَدۡرِیۡ﴾ اے اللہ! جو بات میں سمجھانا چاہتا ہوں میرے اوپر کھول دے، بات مجھے اچھی طرح سمجھ آئے تاکہ مجھے سمجھانے میں دقت نہ ہو۔

داعی کی ضرورت یہ ہے کہ جو بات دوسروں کو سمجھانا چاہتا ہے وہ خود اچھی طرح سمجھے، آپ عقیدہ سمجھانا چاہتے ہیں تو پہلے خود سمجھیں، درس قرآن دینا چاہتے ہیں تو پہلے خود سمجھیں، پھر آدمی کو سمجھانے کا لطف آتا ہے۔

[2]: ﴿وَ یَسِّرۡ لِیۡۤ اَمۡرِیۡ﴾ اے اللہ! مجھے اسباب عطا فرمادے۔

داعی کی دوسری ضرورت اسباب ہیں۔ اسباب ہوں تو کام کرنا بہت آسان ہوتا ہے، اسباب نہ ہوں تو کام کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اسباب میں بنیادی اسباب دو ہیں:

پہلا افراد اور دوسرا اموال۔ اس لیے موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو مانگا اور بطور وزیر مانگا کہ مجھے یہ دے دیں تو مجھے کام میں آسانی ہوگی۔

[3]: ﴿وَ احۡلُلۡ عُقۡدَۃً مِّنۡ لِّسَانِیۡ﴾ اے اللہ! مجھے فصیح زبان عطا فرمادیں، زبان کی لکنت ختم ہو جائے تاکہ میں بات کھل کر بتا سکوں۔ تو داعی کی یہ تین ضرورتیں ہیں۔

اور یہ بات میں بارہا کہہ چکا ہوں کہ فصیح زبان کا مطلب لفاظی نہیں ہے، فصیح زبان کا مطلب یہ ہے کہ اتنی عام فہم اور سادہ سی بات ہو کہ مخاطب کے دماغ میں اتر جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ تین چیزیں کیوں مانگی ہیں؟ اس کی وجہ یہ بیان فرمائی: ﴿یَفۡقَہُوۡا قَوۡلِیۡ﴾ تاکہ وہ میری بات سمجھ جائیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا نہیں مانگی کہ وہ میری بات کو مان لیں بلکہ فرمایا کہ وہ میری بات کو سمجھ جائیں۔

داعی کے ذمہ بات منوانا نہیں ہے، بات سمجھانا ہے۔ آج ہمارے ہاں لڑائی

اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ ہم بات سمجھانے کے بجائے منوانے کی کوشش کرتے ہیں، ہمارے ذمہ سمجھانا ہے۔ آپ سمجھا دیں، مخاطب مانتا ہے تو ٹھیک اور اگر نہیں مانتا تو نہ سہی، اس کی مرضی۔ اس طرح کام کریں تو پھر لڑائی اور جھگڑے نہیں ہوتے۔

آگے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک دعا الگ مانگی:

﴿وَ اجۡعَلۡ لِّیۡ وَزِیۡرًا مِّنۡ اَہۡلِیۡ ﴿۲۹﴾ ہٰرُوۡنَ اَخِی ﴿۳۰﴾ اشۡدُدۡ بِہٖۤ اَزۡرِیۡ ﴿۳۱﴾ وَ اَشۡرِکۡہُ فِیۡۤ اَمۡرِیۡ ﴿۳۲﴾﴾

یہ ﴿وَ یَسِّرۡ لِیۡۤ اَمۡرِیۡ﴾ کی تفسیر ہے کہ یا اللہ! میرے خاندان میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا معاون بنا دے۔ اس کے ذریعے میری کمر مضبوط فرما دے، اس کو میرے کام میں شامل فرما دے۔

"وزیر" کہتے ہیں بوجھ اٹھانے والے کو۔ چونکہ وزراء سلطنت کے بادشاہوں کے بوجھ اٹھاتے ہیں اس لیے انہیں "وزیر" کہتے ہیں۔

عبادات میں ماحول کو دخل ہے:

﴿کَیۡ نُسَبِّحَکَ کَثِیۡرًا ﴿۳۳﴾ وَّ نَذۡکُرَکَ کَثِیۡرًا ﴿۳۴﴾﴾

تاکہ ہم آپ کی تسبیح کریں اور ہم آپ کا ذکر زیادہ کریں۔

جب بھی آدمی اللہ کا ذکر کرنا چاہے تو ذکر کا ماحول ضروری ہے، ماحول سے ذکر کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ جب میرا بھائی میرے ساتھ ہوگا تو ذکر کرنے میں مجھے آسانی ہوگی، ماحول پیدا ہو جائے گا۔ عبادات میں عبادات کے ماحول کا بہت دخل ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿فَلۡیَعۡبُدُوۡا رَبَّ ہٰذَا الۡبَیۡتِ ﴿۳﴾ الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَہُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ۬ۙ وَّ اٰمَنَہُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ ﴿۴﴾﴾

قریش کو چاہیے کہ اس گھر یعنی بیت اللہ کے رب کی عبادت کریں جس نے بھوک کی حالت میں ان کو کھانے کو دیا اور خوف کی حالت میں ان کو امن دیا۔ معلوم ہوا کہ عبادات میں مزا آتا ہے جب عبادات کا ماحول ہو، ماحول اچھا ہو تو عبادت کرنی بہت آسان ہے۔ اور عبادات کے ماحول میں دو چیزوں کو بہت دخل ہے:

1: آدمی کو معاش کی پریشانی نہ ہو۔

2: آدمی کو خوف کی پریشانی نہ ہو بلکہ امن میسر ہو تو عبادات کا بہت لطف آتا ہے۔ صبح آپ نے اٹھنا ہے تہجد پڑھنی ہے، اب اگر پانی گرم مل جائے، مسجد میں ہیٹر لگا ہو، نیچے قالین بچھا ہو تو کتنی راحت سے عبادت ہوتی ہے۔ اگر پانی ٹھنڈا ہو، سرد ہوا چل رہی ہو، مسجد کا فرش ٹھنڈا ہو عبادت کتنی مشکل ہے؟! ماحول اچھا ہو یہ چیز اللہ تعالیٰ سے مانگنی بھی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اچھا ماحول عطا فرمائیں اور اگر اچھا ماحول ملے تو اس کی قدر بھی کرنی چاہیے۔

﴿قَالَ قَدۡ اُوۡتِیۡتَ سُؤۡلَكَ یٰمُوۡسٰی ۝۳۶﴾

اچھا موسیٰ! جو آپ نے دعا کی تھی ہم نے قبول کر لی ہے۔

﴿وَلَقَدۡ مَنَنَّا عَلَیۡكَ مَرَّةً اُخۡرٰۤی ۝۳۷﴾

اور ہم نے تم پر ایک اور مرتبہ بھی احسان کیا تھا۔ ایک احسان تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمکلامی کا شرف بخشا، آپ کو نبوت دی، آپ کو معجزات عطا کیے، اس کے علاوہ آپ پر پہلے بھی بہت سے احسانات کیے۔ یہاں "اُخۡرٰی" کا معنی "بعد" نہیں ہے بلکہ اُخۡری کا معنی "اور" ہے۔ ان احسانات کی اللہ تعالی نے اب تفصیل شروع فرمائی:

امِ موسیٰ کو پیغامِ خداوندی:

﴿اِذۡ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّكَ مَا یُوۡحٰۤی ۝۳۸﴾

جب ہم نے آپ کی ماں کے پاس پیغام بھیجا تھا جو اب وحی کے ذریعے آپ کو بتا رہے ہیں۔

فرعون اور اس کے درباریوں میں ایک بات چلی کہ بنی اسرائیل کے لوگ اس بات پر خوش ہیں کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ ان میں کوئی نبی اور رسول پیدا ہو گا۔ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹے تھے اسماعیل علیہ السلام اور ایک بیٹے تھے اسحاق علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے تھے حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے جن کے آگے بارہ خاندان تھے۔ انہیں بنو اسرائیل کہتے ہیں۔ ''اسرا'' کا معنی عبد ہے اور ''ئیل'' کا معنی اللہ ہے۔ اسرائیل لقب تھا حضرت یعقوب علیہ السلام کا، تو بنو اسرائیل کا معنی ہے ''یعقوب کے بیٹے'' یعنی بارہ۔ ان بارہ بیٹوں کے آگے بارہ خاندان تھے اور ان کی آبادی آگے لاکھوں کی تعداد میں تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو لے کر جب مصر سے گئے اس وقت بنی اسرائیل ساڑھے چھ لاکھ کے لگ بھگ تھے۔

فرعون کو خواب آیا اور درباریوں نے تعبیر بتائی کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا بچہ پیدا ہو گا جو تمہاری حکومت کو ختم کر دے گا تو فرعون نے کہا کہ اس کا حل کیا ہے؟ درباریوں نے کہا کہ حل یہی ہے کہ ان کے بچوں کو قتل کریں تا کہ نہ بچہ رہے اور نہ نبی بنے۔ اس پر مشورہ ہوا اور طے یہ ہوا کہ ان کے بچوں کو ذبح کرو اور بچیاں زندہ رکھو، بچے ذبح کرتے رہے۔ جب اچھی خاصی تعداد ذبح ہونا شروع ہو گئی تو انہوں نے پھر آپس میں مشورہ کیا کہ اگر بچے یوں ذبح ہوتے رہے تو ہمارے کام تو یہی بنی اسرائیل ہی کرتے ہیں، ان کی پرانی نسل ختم ہو جائے گی اور نئی نسل مردوں کی نہیں ہو گی تو ہمارے کام کون کرے گا؟ اب انہوں نے مشورہ کیا کہ ایک سال جو بچے پیدا ہوں ان

کو ذبح کرتے رہو اور جو اگلے سال پیدا ہوں ان کو زندہ رکھا جائے۔

حضرت ہارون علیہ السلام اس سال پیدا ہوئے جو بچوں کو ذبح کرنے کا نہیں تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اگلے سال پیدا ہوئے جو بچوں کو ذبح کرنے کا تھا۔ تو حضرت ہارون علیہ السلام کے بارے میں تو والدہ کو کوئی پریشانی نہیں تھی، پریشانی بنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت والے سال۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کے دل میں یہ بات ڈالی کہ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں پریشان نہ ہوں، جب یہ بچہ پیدا ہو تو اس کو تابوت میں بند کرو اور دریا میں ڈال دو، ہم اس بچے کو تمہارے پاس ہی لائیں گے، اس کی تربیت تمہارے پاس ہی ہو گی، تم غمزدہ نہ ہو۔

قبطی کا قتل:

﴿وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا﴾

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ ایک بندہ آپ سے قتل ہوا، پھر ہم نے آپ کو اس گھٹن اور پریشانی سے نجات دی اور بھی کئی آزمائشیں آپ پر آئی ہیں۔

آپ کئی سال مَدیَن میں رہے ہیں، پھر بھی آپ کے مقدر میں تھا اس لیے آپ واپس آئے۔ تو حضرت موسیٰ علیہ اور ان کی والدہ پر کئی آزمائشیں بنتی ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے ان کے گھر پر آئی ہیں۔ ان آزمائشوں کی تفصیل ایک لمبی حدیث مبارک میں ملتی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام پر آزمائشوں کی تفصیل:

”حدیث الفتون“ کے نام سے سنن النسائی میں بڑی تفصیل کے ساتھ یہ حدیث موجود ہے کہ معروف تابعی حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿وَ فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا﴾ کہ اے موسیٰ! ہم نے تمہیں کئی آزمائشوں سے گزارا، اس میں اس ”فتون“ اور آزمائشوں سے کیا مراد ہے؟

تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ان کو بتایا کہ جب وہ سال تھا اوپر جو واقعہ میں نے ذکر کیا ہے کہ فرعون اور اس کے درباریوں میں جو مشورہ ہوا کہ ایک سال کے بچوں کو زندہ رکھو اور دوسرے سال کے بچوں کو ذبح کرو تو جس سال زندہ رکھنا تھا اس سال ہارون علیہ السلام پیدا ہوئے اور آئندہ سال حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو ان کی ماں بہت پریشان ہوئی کہ میرے بچے کا کیا بنے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ڈالا کہ اس بچے کو لکڑی کے صندوق میں ڈالو اور دریا کے حوالے کر دو۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ ان آزمائشوں میں سے سب سے پہلی آزمائش تھی۔

باوجود اس کے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل میں اللہ نے یہ بات ڈالی، بشارت بھی دی اور وعدہ بھی کیا لیکن پھر بھی طبعی خوف غالب تھا۔ انہوں نے بچے کو صندوق میں ڈال کر دریا کے حوالے کر دیا۔ دریائے نیل کا ایک حصہ فرعون کے محل کے طرف سے ہو کر گزرتا تھا تو یہ صندوق اس طرف چلا گیا۔ آگے چٹان تھی جہاں فرعون کی کنیزیں نہاتی تھیں، کپڑے دھوتی تھیں، سارے کام کرتی تھیں تو اللہ نے اس صندوق کو ان کے قریب کر دیا۔ وہاں کنیزوں نے صندق کو اٹھایا، سوچا کہ اس کو کھولیں۔ پھر کہا کہ اگر کھولتی ہیں تو اندر سے مال نکلے گا، فرعون کی بیوی کو بتائیں گے تو وہ کہے گی کہ اس میں سے کچھ مال تم نے رکھ لیا ہو گا تو بہتر ہے کہ اس کو کھولے بغیر ہی فرعون کی بیوی کے پاس لے جائیں۔ فرعون کی بیوی آسیہ کے پاس لے گئیں۔ اس نے کھولا تو اندر بچہ تھا۔

موسیٰ علیہ السلام کی محبوبیت:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ﴾

ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو بہت محبوب بنایا تھا۔ فرعون کی بیوی نے جب دیکھا تو دیکھتے ہی دل میں اس بچے کی محبت اتر گئی۔ فرعون کی اولاد تو تھی نہیں تو اس نے کہا کہ اس کی میں تربیت کرتی ہوں۔ جب یہ بات تھوڑی سی پھیل گئی تو جو اہلکار فرعون کی طرف سے مقرر تھے کہ جب بچہ پیدا ہو تو ذبح کر دینا ہے وہ یہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے کہا کہ اس بچے کو ہمارے حوالے کر دو، ہم نے اس کو ذبح کرنا ہے۔ فرعون کی بیوی نے کہا کہ میں فرعون سے بات کر لیتی ہوں، اگر اجازت مل گئی تو ٹھیک ہے ورنہ تم اس کو ذبح کر دینا۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اس واقعہ کو ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ دوسری آزمائش تھی۔

خیر اس نے فرعون کے پاس جا کر بات کی کہ یہ بچہ ہے اور میں چاہتی ہوں کہ ہم اس کو پالیں، ہمارا بیٹا نہیں ہے، یہ ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنے گا۔ فرعون نے کہا کہ یہ تیری آنکھوں کی ٹھنڈک تو ہو سکتا ہے لیکن میری آنکھوں کی ٹھنڈک نہیں ہو سکتا۔

بعض روایات میں ہے کہ اگر فرعون یہ کہہ دیتا کہ یہ بچہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنے گا جس طرح اس کی بیوی نے کہا تھا تو اللہ تعالیٰ دونوں کو ہدایت عطا فرما دیتے۔

خیر بیوی کے کہنے پر فرعون نے اس بچے کو قتل سے آزاد کر دیا۔ اب اس کا مسئلہ تھا دودھ پلانے کا، تو دودھ پلانے کے لیے دایہ منگائی لیکن بچے نے دودھ نہیں پیا۔ اب یہ بڑا مسئلہ تھا کیونکہ اگر بچہ دودھ نہیں پیتا تو زندہ کیسے رہے گا؟ فرعون کی بیوی نے

اپنی کنیزیں بھیجیں کہ دایہ تلاش کرو، وہ بازار میں پھر کر دایہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ ادھر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اپنی بیٹی سے کہا کہ باہر جاؤ اور لوگوں سے پتا کرو کہ اس تابوت اور بچے کا کیا بنا؟ موسیٰ علیہ السلام کی بہن باہر گئی تو دیکھا کہ کنیزیں بچے کو لے کر دودھ پلانے کے لیے دایہ کو تلاش کر رہی ہیں۔ تو موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے کہا کہ میں ایک گھر کا پتا دیتی ہوں، وہ دودھ بھی پلائے گی اور اس کا خیال بھی رکھے گی۔ ان کنیزوں کو شک پڑا کہ کہیں یہ عورت اس بچے کی ماں یا کوئی خاص رشتہ دار ہے جو اتنے یقین سے کہہ رہی ہے کہ وہ گھر والے اس بچے کا خیال رکھیں گے۔ تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی بہن کو اس شک میں پکڑ لیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ تیسری آزمائش کا ہے۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے کہا کہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر اس گھر کا دودھ اس بچے نے پی لیا تو ان گھر والوں کو فرعون کے دربار تک رسائی مل جائے گی، پیسے زیادہ ملیں گے اور جب اتنا کچھ بادشاہ کے گھر سے ملے گا تو وہ اس کا خیال کیوں نہیں رکھیں گے؟! ان کنیزوں کو اس بات سے تھوڑی سی تسلی ہو گئی تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی بہن کو چھوڑ دیا۔

موسیٰ علیہ السلام کا اپنی ماں کا دودھ پینا:

موسیٰ علیہ السلام کی بہن فوراً گھر پہنچی اور یہ سارا قصہ والدہ کو بتایا۔ دونوں اس جگہ آئیں جہاں کنیزیں کھڑی تھیں۔ کنیزوں کے کہنے پر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے بھی بچے کو گود میں لیا تو فوراً بچے نے ان کا دودھ پینا شروع کر دیا اور پیٹ بھر کر پیا۔ یہ بات فرعون کی بیوی کے پاس پہنچی تو بہت خوش ہوئی۔ چنانچہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بلایا۔ اس نے کہا کہ تم یہاں ٹھہر و اور بچے کو دودھ پلاؤ، تمہارا خرچہ ہم دیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے کہا کہ پہلے میرے پاس ایک بچہ گھر میں ہے، میں اس کو پالتی ہوں، میں اس کو گھر میں کیسے چھوڑوں؟! اگر اس کو دودھ پلانا ہے تو

میرے پاس بھیج دو، میں اپنے گھر میں اس کو دودھ پلاؤں گی، اگر نہیں تو یہاں رہ کر پلانا میرے بس میں نہیں ہے، صاف انکار کیا اور خودداری سے کام لیا۔

خیر انہوں نے بچہ اس کے حوالے کر دیا۔ تو جو اللہ نے وعدہ فرمایا تھا کہ ہم اس کو آپ کے پاس واپس لوٹائیں گے وہ عدہ پورا ہو گیا۔ اب خرچہ فرعون کا ہے اور دودھ اپنے بچے کو پلاتی ہے۔ یوں حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی والدہ کے پاس رہ کر دودھ پیتے رہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص صنعت و حرفت کا کام کرے، چیزیں تیار کرے - جیسے فیکٹریاں ہوتی ہیں، کارخانے ہوتے ہیں - اور دیانت سے کام کرے تو یہ ایسے ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ہے، یعنی بچہ بھی اپنا ہے اور اس بچے کو دودھ پلانے پر خرچہ بھی مل رہا ہے حالانکہ اپنے بچے کو دودھ پلانے پر تو خرچہ نہیں ملتا تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ بندہ صنعت و حرفت کا کام کرے اچھی نیت سے کرے تو کام بھی اپنا کرے گا اور ثواب بھی ملے گا۔

فرعون کی ڈاڑھی پکڑنا:

خیر کچھ دنوں کے بعد فرعون کی بیوی نے بلایا کہ لے آؤ بیٹے کو میں نے دیکھنا ہے۔ اس دوران فرعون کی بیوی نے اپنے سب درباریوں کو حکم دیا کہ جب وہ دایہ بچے کو لے کر آئے تو تم سب ہدایا دو۔ تو جس وقت موسیٰ علیہ السلام اپنی والدہ کے ساتھ گھر سے نکلے اس وقت سے لے کر محل پہنچنے تک لوگوں نے خوب ہدیے دیے۔ جب سارے ہدیے جمع ہو گئے تو اس نے یہ سارے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے حوالے کر دیے کہ یہ بھی تمہارا مال ہے، تم اس کو لے جاؤ۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ میں اب اس کو فرعون کے پاس لے جاتی ہوں وہ بھی اس کو ہدیے تحفے دے گا۔ جب فرعون

کے دربار میں لے کر گئی، فرعون نے ان کو اپنی گود میں بٹھالیا تو موسیٰ علیہ السلام نے اس کی ڈاڑھی کو پکڑا اور اپنی طرف جھٹکا مار کر کھینچا۔

اس سے فرعون کو شک پڑا کہ یہ وہی بچہ نہ ہو اور درباریوں نے کہا کہ یہی وہ بچہ ہے جو تیری سلطنت کے ختم ہونے کا ذریعہ بنے گا، اس کو سنبھالو۔ تو فرعون نے کہا کہ اس کو لے جاؤ اور ذبح کر دو۔ فرعون کی بیوی نے کہا کہ یہ بچہ ہے، اس کو کچھ پتا نہیں ہے، تم اس کو آزمالو، ایسا کرو کہ تم آگ کے انگارے رکھو اور موتی بھی رکھو۔ اگر یہ سمجھدار ہوا تو یاقوت کی طرف جائے گا اور اگر بچہ ہوا تو آگ زیادہ چمکتی ہے ادھر دوڑے گا۔ انہوں نے یہ دونوں چیزیں رکھ دیں تو موسیٰ علیہ السلام نے انگارے اٹھا لیے۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام موتیوں کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہتے تھے کہ جبرائیل امین آئے اور ان کا ہاتھ انگاروں کی طرف پھیر دیا، موسیٰ علیہ السلام نے آگ کا انگارہ ہاتھ میں پکڑا اور فوراً منہ میں ڈال دیا۔ فرعون نے فوراً انگارا کھینچ کر باہر نکالا، اس سے موسیٰ علیہ السلام کی کچھ زبان جل گئی۔ تو فرعون کی بیوی نے کہا کہ دیکھو! یہ تو بچہ ہے، اس کو تو پتا ہی نہیں ہے کہ آگ کیا ہوتی ہے اور یاقوت کیا ہوتا ہے؟! خیر اس سے اس کو تسلی ہوگئی اور اس نے بچے کو چھوڑ دیا۔

اس طرح موسیٰ علیہ السلام ان کے گھر میں پلے جوان ہوئے، ایک وقت آیا کہ موسیٰ علیہ السلام کی سب لوگ عزت کرتے تھے، احترام کرتے تھے۔

قبطی اور بنی اسرائیلی کی لڑائی:

ایک دن موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ ایک اسرائیلی اور ایک فرعونی آپس میں لڑ رہے ہیں، موسیٰ علیہ السلام کو یقین ہوا کہ فرعونی کا قصور ہے تو آپ نے چھڑانے کے لیے اس کو مکا مارا تو فرعونی قتل ہوگیا۔ اب پتا نہیں چل رہا تھا کہ قتل کس نے کیا

ہے؟ یا اسرائیلی کو پتا ہے یا موسیٰ علیہ السلام کو، تیسرے بندے کو اس کی خبر نہ تھی۔ فرعون نے بندے لگائے کہ قاتل کو تلاش کرو تا کہ ہم اس کو سزا دیں لیکن قاتل مل نہیں رہا تھا۔ دوسرے دن پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام جا رہے تھے، دیکھا کہ وہی اسرائیلی ایک اور فرعونی سے لڑ رہا تھا تو موسیٰ علیہ السلام نے محسوس کیا کہ آج اسرائیلی کا قصور ہے تو آپ نے اس کو سمجھایا کہ تو روزانہ لڑتا ہے اور باز کیوں نہیں آتا؟ موسیٰ علیہ السلام نے اس کو تھوڑا سا ڈانٹا تو وہ سمجھا کہ اب مجھے ماریں گے، اس نے کہا کہ موسیٰ! کل تم نے ایک فرعونی کو مارا تھا اور آج تم مجھے مارنا چاہتے ہو۔

اتنی بات کی اور بات ختم ہو گئی۔ اس فرعونی نے بات سنی۔ اس نے فرعون کے دربار میں یہ بات پہنچادی کہ کل جو قتل ہوا تھا وہ موسیٰ نے کیا تھا۔ فرعون نے پولیس والے دوڑائے کہ جاؤ گرفتار کرو، پولیس والے تو بائی روڈ جاتے ہیں آدمی کو پکڑنے کے لیے، وہاں پر ایک درباری تھا جس نے بات سن لی تو وہ مختصر راستے سے گیا اور موسیٰ علیہ السلام سے کہا موسیٰ! اپنی خیر مناؤ، وہ تجھے مارنا چاہتے ہیں۔

مدین کا سفر:

موسیٰ علیہ السلام پھر وہیں سے رات کے اندھیرے میں نکلے اور مَدْیَنْ کا رخ کیا۔ اجنبی آدمی تھے راستے کا پتہ نہیں تھا۔ آگے سارا واقعہ آپ نے سنا ہوا ہے کہ راستے پر ایک کنواں تھا، لوگ وہاں پانی بھرتے تھے، دو بچیاں ایک طرف کھڑی تھیں، موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا کہ تم کیوں کھڑی ہو؟ کہا کہ لوگ جائیں گے تو ہم اپنی بکریوں کو پانی پلائیں گی۔ موسیٰ علیہ السلام نے ڈول نکالا اور بکریوں کو پانی پلا دیا تو وہ جلدی گھر پہنچ گئیں۔ وہ دونوں حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹیاں تھیں۔ پوچھا کہ آج تم جلدی آ گئی ہو؟ بیٹیوں نے جواب دیا کہ وہاں پر کوئی مسافر تھا، انہوں نے ہماری بکریوں کو پانی پلایا ہے۔ کہا کہ اس کو بلا کر لاؤ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں گئے، حضرت شعیب علیہ

السلام نے ان کے سارے حالات سنے تو فرمایا کہ تم پریشان مت ہو، فرعون کی جو سلطنت تھی تم وہاں سے نکل آئے ہو۔ میں اپنی ایک بیٹی سے تمہارا نکاح کر دوں گا، میری شرط یہ ہے کہ آٹھ سال بکریاں چراؤاور اگر دس سال چراؤگے تو تمہاری مرضی ہے۔ موسیٰ علیہ نے شرط قبول کرلی۔

یہ حضرت شعیب علیہ السلام نے تدبیر اختیار فرمائی کہ ویسے رکھوں گا تو یہ غیرت مند نوجوان ہے، ٹھہرے گا نہیں اور اگر مزدوری پر رکھوں گا تو رک جائے گا اور یہ بات شعیب علیہ السلام کی بیٹی نے کہی کہ آپ اس کو مزدوری پر رکھیں، یہ قوی بھی ہے اور امین بھی ہے۔ تو شعیب علیہ السلام نے پوچھا کہ تمہیں کیسے پتا چلا؟ اس نے کہا کہ ایک تو ہم نے ان کو پانی نکالتے ہوئے دیکھا، اس سے ہمیں اس کی طاقت کا پتا چلا اور جب میں بلانے کے لیے گئی تو انہوں نے آنکھیں نیچے کر کے میری پوری بات کو سنا، پھر مجھے کہا کہ میں آگے چلتا ہوں اور تم میرے پیچھے چلو، جس طرف مڑنا ہے تم اس طرف پتھر پھینکنا، میں سمجھوں گا کہ راستہ اس طرف ہے۔ تو ان دو باتوں کی وجہ سے شعیب علیہ السلام نے ان کو اپنا داماد بنایا۔

مدین سے واپسی:

پھر جب موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس سے واپس آرہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے آپ حکم دیا کہ جاؤ اور فرعون کو دعوت دو۔

﴿اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَ لَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۝٤٢ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝٤٣ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝٤٤﴾

تم اور تمہارا بھائی میری یہ نشانیاں لے کر جاؤ اور میرے ذکر میں سستی نہ کرنا، فرعون کے پاس جاؤ، وہ حد سے نکل چکا ہے، اس کے پاس جا کر نرمی سے بات کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کرے یا اللہ سے ڈر جائے۔

تو اللہ تعالیٰ نے بات کرنے کا سلیقہ بتایا ہے۔ آج جتنا بھی بڑا داعی ہو وہ موسیٰ علیہ السلام سے بڑا نہیں ہو سکتا اور جس کو دعوت دینی ہو وہ جتنا بھی گندہ ہو فرعون سے گندہ نہیں ہو سکتا تو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام دونوں کو حکم ہے کہ بات نرم کہنا، لہجہ کا بہت دخل ہے بندے کو سمجھانے میں، اس لیے بات اچھی ہو لیکن لہجہ نرم ہونا چاہیے۔

نرمی اور سختی کہاں کی جائے؟

قرآن کریم میں اللہ تعالی نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام سے فرمایا: ﴿فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا﴾ کہ فرعون سے نرم لہجہ میں بات کرنا۔ اب سوال یہ ہے کہ آج ہمارے ہاں احتجاج ہوتا ہے حکمرانوں کے خلاف، ہماری تقاریر ہوتی ہیں فرق باطلہ کے خلاف اور بہت سخت ہوتی ہیں جس کا لہجہ نرم نہیں ہوتا تو کیا یہ قرآن کریم کی اس آیت کے خلاف ہے؟

بات سمجھیں کہ یہ جو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو نرم بات کرنے کا حکم دیا گیا ہے یہ ابتداءً تھا کہ جب آپ پہلی بار جاؤ تو اس کو نرمی سے بات سمجھاؤ، ابتدا میں سختی نہ کرو بلکہ پیار سے سمجھاؤ اور جب حجت تام ہو جائے اور پھر بھی نہ مانے تو پھر ﴿قَوْلًا لَّيِّنًا﴾ نہیں ہے بلکہ پھر حکم یہ ہوتا ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ [159]

اے نبی! کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو!

پھر جہاد بھی ہے اور سختی بھی ہے، ابتدائی طور پر دلائل، پیار اور نرمی سے بات سمجھاؤ، جب بار بار سمجھانے کے باوجود نہ سمجھے تو پھر تنبیہ بھی جائز ہے، للکارنا بھی جائز ہے اور جب نوبت قتال تک پہنچ جائے تو پھر جہاد اور قتال بھی جائز ہے۔ یہ مراحل

159۔ التحریم 9:66

اخیر کے ہیں اور ہمارے حضرات جو حکمرانوں کو لتاڑتے ہیں وہ پہلے دن نہیں ہوتا، بڑے عرصہ کے بعد ہوتا ہے۔ تو دونوں میں فرق کرنا چاہیے۔

﴿قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَآ اَوْ اَنْ یَّطْغٰی ﴿۴۵﴾ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِیْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی ﴿۴۶﴾﴾

ان دونوں نے کہا کہ یا اللہ! ہمیں ڈر ہے ﴿اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَآ﴾ کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کرے کہ دعوت دینے سے پہلے ہی ہمیں ختم کر دے اور ہمارے اوپر حملہ کرے، ﴿اَوْ اَنْ یَّطْغٰی﴾ یا ہم اسے دعوت دیں تو مزید سرکش ہو جائے، یہ ہمیں خدشہ ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم ڈرو مت، میں تمہارے ساتھ ہو، سن بھی رہا ہوں اور دیکھ بھی رہا ہوں۔

فرعون کو دعوت اور اس کا جواب:

﴿فَاْتِیٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۙ۬ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ؕ وَالسَّلٰمُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی ﴿۴۷﴾﴾

تم اس کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ ہم دونوں تمہارے رب کے پیغمبر ہیں، اس لیے بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دو اور انہیں تکلیفیں مت دو۔

تو دو باتیں ہیں؛ ایک اس کو توحید کی دعوت دو اور دوسرا اس سے اپنی قوم کی آزادی کی بات کرو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اس کے پاس پہنچے اور اس کو دعوت دی تو اس نے پوچھا کہ تم کس بات کی دعوت دیتے ہو؟ کہا کہ اللہ کے دین کی دعوت دیتے ہیں، پھر کہا: تمہارا رب ہے کون؟ فرمایا:

﴿رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ﴿۵۰﴾﴾

ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے مناسب پیدا کیا ہے اور اس کی

رہنمائی بھی فرمائی، اس کو راستے بھی دکھائے۔

﴿قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿٥١﴾ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴿٥٢﴾﴾

فرعون نے کہا کہ اچھا! یہ بتاؤ کہ بقول تمہارے پہلے بھی نبی گزرے ہیں تو جن لوگوں نے ان کی بات نہیں مانی ان کا کیا انجام ہوا؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ ان کا کیا انجام ہوا، یہ بات اللہ کے علم میں ہے۔ فرعون کا مقصد یہ تھا کہ جب میں یہ سوال کروں گا تو موسیٰ علیہ السلام کہیں گے کہ وہ جہنمی تھے، عذاب آیا تھا اور تباہ ہو گئے تھے تو میں اپنی قوم کو بطور مذاق کہوں گا کہ انہیں دیکھو! یہ اپنے علاوہ سب کو گمراہ سمجھتے ہیں، بس یہی نیک ہے اور کوئی نیک نہیں ہے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے تدبیر سے بات فرمائی کہ ﴿عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ﴾ اس کا علم میرے رب کے پاس ہے اور میرے رب کو نہ غلطی لگتی ہے اور نہ ہی وہ بھولتا ہے۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا:

﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿٥٥﴾﴾

اسی زمین سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے، اسی زمین میں ہم تمہیں واپس لے جائیں گے اور اسی زمین سے تمہیں ایک مرتبہ دوبارہ نکالیں گے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے ضابطہ بیان فرمایا کہ مٹی سے تم کو پیدا کیا، مٹی میں لوٹائیں گے اور اسی مٹی سے اٹھائیں گے۔ بعض روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ جو انسان بھی پیدا ہوتا ہے تو رحم مادر میں ایک تو باپ کا نطفہ ہوتا ہے اور دوسرا جس مٹی میں اس انسان نے دفن ہونا ہوتا ہے اس مٹی کا کچھ حصہ اللہ تعالیٰ فرشتے کے ذریعے ماں کے رحم میں ڈال دیتے ہیں۔ تو جس مٹی میں اس نے دفن ہونا ہوتا ہے وہ مٹی اس میں شامل

ہوتی ہے۔ اب اس کی نوعیت کیا ہوتی ہے وہ تو اللہ ہی جانتے ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ پہنچی وہاں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"خُلِقْتُ أَنَا وَأَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرَ مِنْ طِيْنَةٍ وَاحِدَةٍ."[160]

کہ مَیں، ابو بکر اور عمر ایک ہی مٹی سے بنے ہیں۔

اس لیے دفن بھی ایک جگہ ہوئے اور قیامت کے دن اٹھیں گے بھی اسی جگہ سے۔

جادوگروں سے مقابلہ:

﴿قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿٥٧﴾﴾

فرعون نے کہا کہ اے موسیٰ! تم اس لیے آئے ہو تا کہ اپنے جادو سے ہمیں اپنی زمین سے نکال دو۔ ہم تمہارا مقابلہ کریں گے۔ اب مقابلہ کیسے کریں گے؟ اس کے لیے عید کا دن طے ہوا اور دوپہر کا وقت جس میں سب امیر غریب جمع ہوں۔ گراؤنڈ ایسا ہے جو اسرائیلیوں اور فرعونیوں کے درمیان میں ہے تو دونوں کے آنے میں زیادہ دیر نہ لگے اور وقت پر پہنچیں۔ فرعونی بھی آ گئے، اسرائیلی بھی آ گئے، ان کے ستر ہزار جادوگر بھی آئے۔ وہ موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ پہلے تم اپنا کرشمہ دکھاؤ گے یا ہم دکھائیں؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ پہلے تم دکھاؤ، اس کے بعد میں معجزہ دکھاؤں گا۔ ان ستر ہزار جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر پھینکیں۔

جادوگروں کا قبولِ حق:

﴿فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿٦٦﴾

160۔ تاریخ ابن عساکر: ج44 ص121 رقم الحدیث 46604

فَاَوۡجَسَ فِیۡ نَفۡسِہٖ خِیۡفَۃً مُّوۡسٰی ﴿۶۷﴾ قُلۡنَا لَا تَخَفۡ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡاَعۡلٰی ﴿۶۸﴾ وَ اَلۡقِ
مَا فِیۡ یَمِیۡنِکَ تَلۡقَفۡ مَا صَنَعُوۡا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوۡا کَیۡدُ سٰحِرٍ ؕ وَ لَا یُفۡلِحُ السَّاحِرُ
حَیۡثُ اَتٰی ﴿۶۹﴾ فَاُلۡقِیَ السَّحَرَۃُ سُجَّدًا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ ہٰرُوۡنَ وَ مُوۡسٰی ﴿۷۰﴾

جونہی انہوں نے رسیاں پھینکیں تو ان کے جادو کے اثر سے موسیٰ علیہ السلام کو ایسے محسوس ہونے لگا کہ یہ سانپ بن کر دوڑ رہی ہیں۔ اس سے موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں خوف محسوس کیا - خوف اس وجہ سے تھا کہ ان لوگوں نے لاٹھیاں پھینکیں اور سانپ بن گئے، میں لاٹھی پھینکوں گا تو وہ بھی سانپ بن جائے گی تو قوم فیصلہ کیسے کرے گی کہ یہ جادو ہے یا معجزہ؟ لوگ ایمان کیسے لائیں گے؟ - تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا تَخَفۡ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡاَعۡلٰی﴾ کہ اے موسی! تم مت ڈرو، تم ہی غالب آؤ گے - آج پتہ چل جائے گا کہ معجزہ کیا ہوتا ہے اور جادو کیا ہوتا ہے!

جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی پھینکی تو اژدہا بن گیا، اس نے سارے سانپوں کو نگل لیا۔ جادو گر وہیں سجدے میں گر گئے اور انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے ہارون اور موسیٰ علیہما السلام کے پروردگار پر۔ تو فرعون نے ان سے کہا کہ تم نے ملی بھگت کی ہے، تم موسیٰ علیہ السلام سے ملے ہوئے ہو، اس لیے تم نے ایسا کرتب کیا۔ میں تمہیں ایسی سزا دوں گا کہ آج تمہارا دایاں ہاتھ بایاں پاؤں اور دایاں پاؤں بایاں ہاتھ کاٹ کے رکھ دوں گا۔ انہوں نے کہا کہ فرعون! تو نے جو کرنا ہے آج کر لے، ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں، ہم بدلنے والے نہیں ہیں چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

جادو کا اثر (احمد سعید کے اعتراض کا جواب)

یہاں یہ بات سمجھیں کہ اللہ نے فرمایا:

﴿وَ لَا یُفۡلِحُ السَّاحِرُ حَیۡثُ اَتٰی ﴿۶۹﴾﴾

کہ جادو گر کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اب مسئلہ جادو کا ہے۔ یہاں بعض لوگوں نے جادو کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ جادو کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ہمارے قریب دَور میں ایک مماتی تھا احمد سعید چتروڑی، اب فوت ہو گیا ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر والی حیات کا منکر تھا، اھل السنۃ والجماعۃ سے خارج تھا، اس نے ایک مستقل کتاب لکھی تھی "قرآن مقدس اور بخاری محدث"، اس نے اپنی اس کتاب میں صحیح بخاری کی 53 احادیث ایسی نقل کی ہیں کہ جن کو قرآن کریم کے خلاف ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سے ایک حدیث صحیح بخاری کتاب الطب میں ہے کہ:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ سَحَرَ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ مِنْ بَنِيْ زُرَيْقٍ يُقَالُ لَهُ لَبِيْدُ بْنُ الْأَعْصَمِ حَتّٰى كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ أَنَّهُ كَانَ يَفْعَلُ الشَّيْءَ وَمَا فَعَلَهُ.[161]

کہ امی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لبید بن اعصم نے جادو کیا تھا اور اس جادو کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بسا اوقات خیال آتا کہ میں نے یہ کام کیا ہے حالانکہ وہ کام کیا نہیں ہوتا تھا اور بسا اوقات یہ خیال آتا کہ میں نے یہ کام نہیں کیا حالانکہ آپ نے وہ کام کیا ہوتا تھا، تو یہ جادو کا اثر تھا۔

اور احمد سعید نے کہا کہ قرآن کریم میں ہے: ﴿وَ لَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴿٦٩﴾﴾ کہ جادو گر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اور ادھر امی عائشہ کہتی ہے کہ لبید بن عاصم کامیاب ہوا تھا۔ تو یہ حدیث قرآن کریم کے خلاف ہے۔ لہٰذا جادو کی کوئی حقیقت

161۔ صحیح البخاری، رقم: 5763

نہیں ہے۔

حالانکہ احمد سعید کی یہ بات بالکل ہی غلط ہے اور قرآن کریم کو نہ سمجھنے کی علامت ہے۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ذَهَبَ أَهْلُ السُّنَّةِ إِلٰى أَنَّ السِّحْرَ ثَابِتٌ وَلَهٗ حَقِيْقَةٌ.[162]

کہ اہل السنۃ کا موقف یہ ہے کہ جادو کی حقیقت بھی ہے اور یہ ثابت بھی ہے۔

قرآن کریم میں ہے:

﴿وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ﴾[163]

کہ یہ بنی اسرائیلی لوگ اس چیز یعنی جادو کے پیچھے لگ گئے جو دو فرشتوں؛ ہاروت وماروت کو دی گئی تھی۔ یہ دو فرشتے لوگوں کو اس وقت تک جادو نہیں سکھاتے تھے جب تک ان کو یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم بطور امتحان کے بھیجے گئے ہیں، اس لیے تم لوگ جادو کے پیچھے پڑ کر کفر اختیار نہ کرنا۔ پھر بھی لوگ ان سے جادو سیکھتے تھے جس کے ذریعے میاں اور بیوی کے درمیان جدائی ہو جائے۔

تو جادو کی حقیقت تو قرآن سے ثابت ہے۔ یہ کہنا کہ قرآن سے ثابت نہیں ہے یہ ٹھیک نہیں ہے۔ تو اس نے کہا کہ یہ حدیث قرآن کریم کے خلاف ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ قرآن کریم نہ سمجھنے کی وجہ سے اشکال پیش آیا۔ ﴿وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ

162۔ الجامع لاحکام القرآن للقرطبی: ج1 ص246

163۔ البقرۃ 2:102

اَتٰی﴾ کا معنی یہ ہے کہ جادوگر جس مقصد کے لیے جادو کرتا ہے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اب دیکھو! ان لوگوں نے اپنی لاٹھیاں پھینکیں، اپنی رسیاں پھینکیں تو نتیجہ کیا نکلا کہ وہ سانپ دوڑتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ جادو تو انہوں نے کیا، جادو کا اثر بھی ہو گیا لیکن ان کے جادو سے مقصد تھا موسیٰ علیہ السلام کو شکست دینا لیکن وہ موسیٰ علیہ السلام کو شکست نہیں دے سکے، یہ ہے ﴿وَلَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ حَیْثُ اَتٰی﴾ کا معنی۔

لبید بن اعصم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تاکہ آپ دین کی دعوت نہ دے سکیں، اس کے جادو کے باوجود آپ دین کی دعوت دیتے رہے تو جادوگر اپنے جادو میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

میں ایک مثال سے سمجھاتا ہوں کہ کامیاب ہونے کا مطلب یہ ہے مثلاً کچھ لوگ کسی عالم پر قاتلانہ حملہ کرتے ہیں، مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کو قتل کریں، وہ حملہ کر دیتے ہیں، عالم کو دو گولیاں لگ جاتی ہیں جس سے وہ زخمی ہوتے ہیں اور کچھ دنوں کے علاج کے بعد وہ ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ تو ہم یہ نہیں کہیں گے کہ وہ حملہ کر نہیں سکے اور ان کے حملہ کا اثر نہیں ہوا بلکہ ہم کہیں گے کہ حملہ کیا ہے، حملہ کا اثر بھی ہوا ہے لیکن حملہ کرنے والے اپنے حملے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

تو قرآن کریم میں یہ تو ہے جادوگر اپنے جادو میں کامیاب نہیں ہو سکتے، قرآن میں یہ نہیں ہے کہ جادو کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ جادو کا اثر ہونا اور ہے اور جادوگر کا اپنے مقصد میں کامیاب ہونا اور ہے۔ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

دوسری بات... اگر غور کیا جائے تو جو بات قرآن کریم میں ہے وہی بات بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال میں آتا کہ میں نے یہ کام کیا ہے حالانکہ آپ نے کیا نہیں ہوتا تھا۔ ادھر قرآن کریم میں ہے:

﴿فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِیُّهُمْ یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰی﴾

تو جو لفظ بخاری کے ہیں وہی لفظ قرآن کریم کے ہیں۔ وہاں بھی "يُخَيَّلُ اِلَيْهِ" اور یہاں بھی "يُخَيَّلُ اِلَيْهِ"۔ یعنی وہ رسیاں اور لاٹھیاں سانپ بنے نہیں تھے لیکن دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا تھا کہ سانپ بن گئے ہیں، اسی طرح اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال میں آتا کہ میں نے یہ کام کیا ہے حالانکہ کیا ہوا نہیں تھا۔ تو بخاری اور قرآن کے الفاظ تو ایک جیسے ہیں پھر یہ بخاری؛ قرآن کے خلاف کیسے ہے؟

فرعون کی حق سے روگردانی:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعوت دی، اصلاح کی کوشش کی لیکن فرعون باز نہیں آیا، موسیٰ علیہ السلام نے معجزات دکھائے لیکن وہ پھر بھی نہیں مانا، موسیٰ علیہ السلام نے مقابلہ کیا اور فاتح ہوگئے لیکن فرعون پھر بھی نہیں مانا۔ فرعونیوں پر پھر عذاب آیا کہ جب بھی وہ کھانا کھانے لگتے تو مینڈک ہی مینڈک ہوتے برتنوں میں، کھانے میں، انہوں نے کہا کہ موسیٰ! دعا کرو۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو عذاب ٹل گیا۔ لیکن انہوں نے پھر سرکشی کی تو پھر ان پر عذاب آیا کہ ٹڈیاں ہی ٹڈیاں ہیں۔ پھر کہا کہ جی دعا کرو! دعا کی تو یہ عذاب بھی ٹل گیا لیکن وہ لوگ پھر بھی شرارت سے باز نہیں آئے، پھر خدا کا عذاب آیا کہ جو چیز کھانے لگتے وہ خون بن جاتی۔ کہا کہ جی دعا کرو، اگر یہ عذاب دور ہوگیا تو ہم ٹھیک ہو جائیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی، عذاب ٹلا لیکن یہ پھر بھی ٹھیک نہیں ہوئے۔ پھر ان کے کپڑوں میں جوئیں ہی جوئیں پڑ گئیں۔ پھر کہا کہ جی دعا کرو، یہ عذاب دور ہوگیا تو ہم ٹھیک ہو جائیں گے۔ دعا سے عذاب ٹلا لیکن وہ پھر بھی ٹھیک نہ ہوئے۔ اس طرح مختلف قسم کے ان پر عذاب آئے لیکن وہ پھر بھی ٹھیک نہ ہوئے۔

بنی اسرائیل کی آزادی:

﴿وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا

فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ﴿۷۷﴾

ہم نے موسیٰ کے پاس وحی بھیجی کہ آپ میرے بندوں کو لے کر راتوں رات یہاں سے روانہ ہو جاؤ! پھر ان کے لیے سمندر میں ایک خشک راستہ نکال لینا جس سے تمہیں یہ خطرہ بھی نہ ہو گا کہ دشمن پکڑ لے گا اور کوئی خوف بھی نہ ہو گا۔

موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ ہمیں اچانک نکلنا ہے فرعونیوں کو پتہ نہ چلے۔ اسرائیلیوں نے فرعونیوں سے کہا کہ بھائی! ہماری اپنی عید ہے، ہم وہ منانے کے لیے مصر سے باہر جا رہے ہیں اور چونکہ موقع ہماری خوشی کا ہے اس لیے ہمیں عاریۃً کچھ زیور چاہییں۔ اس بہانے سے انہوں نے کچھ زیورات مانگ لیے۔ بنی اسرائیل چھ لاکھ سے کچھ زائد افراد تھے، رات کی تاریکی میں نکلے۔ فرعون کو اس کی اطلاع ملی تو فرعون اپنا لشکر لے کر نکلا، سات لاکھ تو صرف گھڑ سوار تھے، باقی لشکر اس کے علاوہ تھا۔

موسیٰ علیہ السلام جب سمندر پر پہنچے تو منظر یہ تھا کہ آگے دریا ہے اور پیچھے فرعونی۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا: ﴿اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ﴾[164] کہ ہم تو پکڑے گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے، ضرور رہنمائی فرمائے گا۔ خیر! موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا مارا تو سمندر میں بارہ راستے بن گئے اور پانی ایسا کھڑا تھا ﴿كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ﴾[165] کہ جیسے ایک بڑا پہاڑ ہو۔ بنی اسرائیل وہاں سے گزرے، ادھر فرعونی بھی آ گئے۔ فرعونی سمندر دیکھ کر ڈرنے لگے تو فرعون نے اپنا گھوڑا پہلے ڈالا، باقی اس کے پیچھے آئے۔ جب ان کے لشکر کا پہلا گھوڑا آخری کنارے پر تھا اور

164۔ الشعراء 61:26

165۔ الشعراء 63:26

آخری گھوڑا پہلے کنارے پر یعنی جب سب دریا میں چلے گئے اللہ کی طرف سے حکم آگیا کہ اب ان کو تباہ کر دو، پانی آپس میں مل گیا اور یہ سب بہہ گئے۔

فرعون نمونہ عبرت بنا:

اللہ تعالیٰ نے فرعون کی لاش کو محفوظ رکھا تاکہ بعد والے عبرت حاصل کریں۔ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی دریا سے نکل کر آگے گئے تو ایک قوم پر گزر ہوا جو بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا کہ اے موسیٰ! ہمیں بھی کوئی خدا بنادو تاکہ ہم اس کی پوجا کریں تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم یہاں ٹھہرو، میں اللہ کے پاس جاتا ہوں، اللہ سے دعا کرتا ہوں، کوئی کتاب لاتا ہوں عمل کرنے کے لیے۔ آپ علیہ السلامنے اپنے بھائی ہارون کو سمجھایا کہ ذرا ان کا خیال رکھنا اور میرے آنے تک ان کی نگرانی کرنا۔ میں ان شاءاللہ تیس دن کے بعد آتا ہوں۔

موسیٰ علیہ السلام کی اللہ سے ہمکلامی:

وحی آگئی کہ آپ آئیں، تیس دن روزے رکھیں، پھر ہم آپ کو کتاب دیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے تیس دن روزے رکھے، روزہ رکھنے سے منہ میں ایک بو پیدا ہوتی ہے تو موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی کے خیال سے مسواک کی جس سے بو زائل ہو گئی۔ جب اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ اے موسیٰ! آپ نے افطار کیوں کر لیا؟ موسیٰ علیہ السلام نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا لیکن چونکہ پیغمبر تھے اس لیے محض مسواک کرنے کو بھی اللہ تعالیٰ نے افطار کرنے سے تعبیر کیا۔ موسیٰ علیہ السلام اس حقیقت کو سمجھ گئے تو عرض کیا کہ یا اللہ! تیس دن روزے رکھنے کی وجہ سے ایک بو تھی میں نے آپ سے بات کرنی تھی تو میں نے مسواک کر کے بو کو ختم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہمیں تو وہی بو پسند ہے اور یہ بو ہمارے ہاں مشک سے زیادہ پسندیدہ ہوتی ہے۔ لہذا آپ دس روزے مزید رکھو، پھر ہمارے پاس آنا۔

بنی اسرائیل کا بچھڑے کی عبادت کرنا:

ادھر موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام نے تیس دن کا وعدہ کیا تھا، وہ تو پورے ہو گئے لیکن موسیٰ علیہ السلام کہاں گئے؟ بعض روایات میں آتا ہے کہ سامری نے ان کو مشورہ دیا یا ہارون علیہ السلام نے اپنی مرضی سے فرمایا وہ جو تمہارے پاس زیورات اور عاریت کا سامان ہے وہ تمہارا نہیں ہے، یہ تمہارے پاس بطور امانت کے تھا، فرعونی جو اس سامان کے مالک ہیں وہ ہلاک ہو چکے ہیں اس لیے تم اس کو استعمال نہیں کر سکتے، یہ تمہاری ملکیت نہیں ہے۔ چنانچہ آپ علیہ السلام نے وہ سارا سامان اور زیورات جمع کر کے ایک گڑھے میں پھینکوا دیا اور کہا کہ اس کو آگ لگا کر ختم کرو۔ ان سارے زیورات اور سامان کو آگ لگا دی گئی۔ سامری آیا تو اس نے مٹھی بند کی ہوئی تھی، حضرت ہارون علیہ السلام سمجھے کہ اس کے ہاتھ میں بھی کوئی زیور ہے، اس لیے اس کو بھی کہا کہ تم بھی اپنی مٹھی کا سامان اس آگ میں ڈالو۔ اس نے کہا: میں ڈالتا ہوں لیکن ہارون! تم ایک دعا کرو کہ جو میں چاہتا ہوں اللہ کرے وہ ہو جائے۔ یہ شخص منافق تھا۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے اس کو مسلمان سمجھ کر دعا کی کہ یا اللہ! جو یہ چاہتا ہے وہ ہو جائے۔

اس نے مٹھی میں موجود چیز کو آگ میں پھینکا۔ اس کے ذہن میں تھا کہ میں سارا سونا اکٹھا کر کے ایک بچھڑا بناؤں، اس میں مٹی ڈالوں اور پھر قوم سے کہوں کہ تم اس کی عبادت کرو۔ جب وہ چیز ڈالی تو چونکہ ہارون علیہ السلام دعا کر چکے تھے اس لیے اس دعا کی وجہ سے وہ سارا سونا، چاندی، لوہا، پیتل جو کچھ اس گڑھے میں ڈالا گیا تھا سب مل کر بچھڑا بن گیا۔ اب بچھڑے سے آواز آئی۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ وہ بچھڑے کی آواز نہیں تھی بلکہ بچھڑا ایسا بنایا تھا کہ اس میں سے سوراخ تھا، جب پیچھے کی طرف سے ہوا تیزی سے اندر جاتی اور منہ سے نکلتی تو اس سے

آواز پیدا ہوتی تھی۔ اس سامری نے کہا کہ دیکھو! تیس دن ہو گئے، موسیٰ علیہ السلام بھول گئے ہیں، دراصل خدا یہ ہے اور پتا نہیں کہ وہ کہاں سے خدا کو تلاش کر رہے ہیں!

امانت کی پاسداری:

حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کو جب ساتھ لے کر گئے تو بنی اسرائیل نے فرعونیوں سے عاریتاً زیورات لے کر ساتھ رکھے ہوئے تھے، باوجود اس کے کہ فرعونی ان کے مخالف تھے، ان کے بچے قتل کیے تھے اور ایک عرصہ دراز تک ان پر ظلم کیے رکھا تھا۔ اگر بدلے میں ان زیورات کو استعمال کرتے تو کر سکتے تھے لیکن حضرت ہارون علیہ السلام نے فرمایا کہ اس زیور کو استعمال نہیں کرنا، مخالف اگرچہ غرق ہو گئے ہیں اور اب یہ مال ان کو واپس نہیں کیا جا سکتا لیکن چونکہ مال ان کا ہے اس لیے میں یہ حلال نہیں سمجھتا کہ تم اسے استعمال کرو! اس لیے حکم دیا کہ یہ زیورات گڑھا کھود کے اس میں ڈال دو اور اسے آگ لگا دو۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تیرہ سال تک مکہ والوں نے ستایا ہے، کون سا ظلم ہے جو آپ پر نہیں کیا، بیٹیوں کو طلاق تک کی نوبت آئی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو چھپ کر ہجرت فرما رہے ہیں تو مکہ والوں کا جو مال تھا وہ حضرت علی کے پاس رکھ دیا کہ علی! یہ مکہ والوں کی امانتیں ہیں، ان کے حوالے کر دینا۔ یہ ہے اسلام اور شریعت کہ کسی بندے سے ہماری کتنی مخالفت کیوں نہ ہو لیکن شرعی حدود سے تجاوز نہیں کرنا، بس اپنے جذبات کو مسلط نہیں کرنا، ہم نے موت کو سامنے رکھنا ہے، اتنا کرنا ہے جتنا اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے۔

بچھڑے کی عبادت اور تین گروہ:

خیر جب بچھڑا بن گیا تو بنی اسرائیل کے کئی گروہ ہو گئے۔ ایک گروہ نے اسے سچ مچ خدا سمجھ کر پوجنا شروع کر دیا کہ موسیٰ علیہ السلام آئیں گے تو وہ بھی اسی کو

پوجیں گے۔ ایک گروہ نے انکار کر دیا کہ بھائی! یہ شرک ہے، ہم اس کے قریب بھی نہیں آتے۔ ایک گروہ وہ تھا جو کہتا تھا کہ چلو پوجتے ہیں، موسیٰ علیہ السلام جب آئیں گے تو اگر کہا کہ چھوڑ دو تو ہم چھوڑ دیں گے۔ یہ متردد قسم کے لوگ تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام تورات لے کر جب واپس آئے تو آگے معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ آپ نے اپنے بھائی سے کہا کہ یہ کیا ہوا؟ اور اپنے بھائی کو ڈاڑھی اور بالوں سے پکڑ کر کھینچا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم نے میرے جانے کے بعد ان کو سنبھالا نہیں ہے، انہوں نے کہا کہ مجھے ڈر تھا کہ آپ کہیں گے کہ تم نے بنی اسرائیل کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا، اس لیے میں نے ان کو سمجھایا، یہ باز نہیں آئے لیکن میں ان کو قتل تو نہیں کر سکتا تھا۔ اب آپ ان کو سمجھائیں۔

بنی اسرائیل کی توبہ:

موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ آپ نے بہت غلط کیا۔ اب ہمیں توبہ کرنی چاہیے۔ توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ ان میں سے جو نیک ستر آدمی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے پاس جائیں اور اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بڑی چھان بین اور تحقیق و تفتیش سے کام لے کر ستر آدمیوں کو چنا تھا۔ یہ ستر نیک آدمی اللہ تعالیٰ کے پاس گئے۔ چھان بین کے باوجود ان ستر میں بعض وہ افراد بھی شامل ہو گئے جو متردد دین تھے جنہوں نے کہا تھا کہ بچھڑے کو پوج لیتے ہیں لیکن اگر موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ چھوڑ دو تو ہم چھوڑ دیں گے۔ جب کوہِ طور پر پہنچے تو زمین کو زلزلہ آیا اور وہ ستر کے ستر ہلاک ہو گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ! اگر آپ نے ان کو مارنا ہی تھا تو ان کو یہاں وفد میں آنے سے پہلے ہی ہلاک کر دیتے۔ پہلے بنی اسرائیل ہمارے خلاف باتیں کرتے ہیں پھر کہیں گے کہ تو نے ہمارے بندے مروا دیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان ستر کو زندگی عطا فرمائی اور موسیٰ علیہ السلام پر وحی آگئی کہ ان

میں سے جو لوگ اس شرک میں ملوث نہیں ہوئے تھے وہ شرک کرنے والوں کو قتل کریں اور قتل کی یہ صورت مقرر ہوئی کہ جو شخص رشتہ میں جس سے زیادہ قریب ہو وہ اپنے عزیز کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے یعنی باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو اور بھائی بھائی کو۔ چنانچہ اس طرح ان کی ایک بڑی تعداد قتل ہوئی۔ جب انہوں نے اس حکم پر عمل کیا تو اللہ نے ان سب کی توبہ قبول فرمالی اور قاتل اور مقتول دونوں کی خطا معاف کر دی۔

سامری کا تعارف:

﴿وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿٨٥﴾﴾

یہ سامری بد بخت تھا جس نے ان کو گمراہ اور تباہ کیا تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ سامری کا نام بھی موسیٰ تھا اور یہ بھی اسی سال پیدا ہوا تھا جس سال فرعون نے آرڈر جاری کیا تھا کہ جو لڑکا پیدا ہو اس کو ذبح کر دو اور اس کی ماں بھی اس کو ایک غار میں چھوڑ کر آگئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے یہ بندوبست فرمایا تھا کہ جبرائیل امین کو بھیجتے، وہ ایک انگلی پر شہد اور دوسری پر مکھن لگا کر اس کے منہ میں دیتے اور ساتھ اس کو دودھ پلاتے تھے، اس طرح یہ جوان ہوا۔

تو ایک موسیٰ جس کی فرعون نے تربیت کی وہ موسیٰ پیغمبر بنا اور ایک موسیٰ جس کی جبرائیل امین تربیت کرتے تھے وہ کافر اور بد بخت ہوا۔ آپ نے سنا ہے کہ بڑا مشہور شعر ہے:

إِذِ الْمَرْءُ لَمْ يُخْلَقْ سَعِيْدًا تَحَيَّرَتْ
عُقُوْلُ مُرَبِّيْهِ وَخَابَ الْمُؤَمِّلُ
فَمُوْسَى الَّذِيْ رَبَّاهُ جِبْرِيْلُ كَافِرٌ
وَمُوْسَى الَّذِيْ رَبَّاهُ فِرْعَوْنُ مُرْسَلُ

کہ اگر آدمی کے مقدر میں نیک بختی نہ ہو تو اس کی تربیت کرنے والوں کی

عقلیں حیران ہو جاتی ہیں اور اس سے آس اور امیدیں لگانے والے مایوس ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ ایک وہ موسیٰ ہے کہ جس کی تربیت جبرائیل کرتے ہیں تو وہ کافر بنتا ہے اور ایک وہ موسیٰ ہے کہ جس کی تربیت فرعون کر رہا ہے تو وہ نبی بنتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے پوچھا کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے جواب دیا کہ ﴿بَصُرۡتُ بِمَا لَمۡ یَبۡصُرُوۡا بِہٖ﴾ کہ میں نے وہ کچھ دیکھا ہے جو انہوں نے نہیں دیکھا۔ تو نے کیا دیکھا ہے؟ کہا کہ جبرائیل امین جب گزرتے تھے تو جہاں پاؤں رکھتے تھے تو وہاں سبزہ اگتا تھا، تو میں سمجھا کہ اس مٹی میں خاص تاثیر ہے کہ جس چیز پر اس کو ڈالا جائے گا اس میں حیات کے آثار پیدا ہو جائیں گے، میں نے وہاں سے مٹی اٹھائی اور یہ جو بچھڑا بنا تھا اس میں پھینکی تو اس نے آواز نکالنا شروع کی۔

موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ چلو انہوں نے تو توبہ کر لی ہے، اب تیری سزا یہ ہے ﴿فَاِنَّ لَکَ فِی الۡحَیٰوۃِ اَنۡ تَقُوۡلَ لَا مِسَاسَ﴾ کہ تو زندگی بھر یہ کہتا پھرے کہ میرے قریب نہ آنا... میرے قریب نہ آنا.... اب جو اِس کو ہاتھ لگاتا اِس کو بھی بخار چڑھ جاتا اور ہاتھ لگانے والے کو بھی بخار چڑھ جاتا، اس طرح یہ ذلت اور خواری کے ساتھ مرا۔

انبیاء علیہم السلام کا اجتہادی اختلاف:

﴿قَالَ یَبۡنَؤُمَّ لَا تَاۡخُذۡ بِلِحۡیَتِیۡ وَ لَا بِرَاۡسِیۡ ۚ اِنِّیۡ خَشِیۡتُ اَنۡ تَقُوۡلَ فَرَّقۡتَ بَیۡنَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ وَ لَمۡ تَرۡقُبۡ قَوۡلِیۡ ﴿۹۴﴾﴾

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت ہارون علیہ السلام نے کہا: اے میری ماں کے بیٹے! میری ڈاڑھی اور سر کے بالوں کو مت پکڑو، میں تو اس بات سے ڈرتا تھا کہ تم یہ نہ کہو کہ بنی اسرائیل کے تم نے ٹکڑے کر دیے، میں نے تمہاری وجہ سے ان کا خیال

کیا ورنہ مجھے ان سے کیا ہمدری تھی؟

یہاں جو بات سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام دونوں کا اجتہاد تھا۔ حضرت موسی علیہ السلام کا اجتہاد یہ تھا کہ جب ان لوگوں نے شرک کیا تھا تو ان کو قتل کرنا چاہیے تھا، حضرت ہارون علیہ السلام کا اجتہاد یہ تھا کہ مجھے موسیٰ علیہ السلام کے آنے کا انتظار کرنا چاہیے اور معاملہ نرمی کا ہونا چاہیے۔ تو ایک کا اجتہاد ہے مصالحت اور ایک اجتہاد ہے مقاتلت، دونوں کا اجتہاد ہے۔ تو جب تک وحی نہ آئے اور دو نبیوں میں اختلاف ہو تو دونوں کے اس اختلاف میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ایک حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا واقعہ ہے اور ایک حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا واقعہ ہے۔

مشاجرتِ صحابہ اور ہمارا موقف:

یہاں ساتھ 84 چک ہے تو مجھے وہاں ایک شخص ملا۔ اس نے سوال کیا کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما یہ دونوں آپس میں لڑے ہیں، تو ان میں حق پر کون تھا اور باطل پر کون تھا؟ میں نے کہا کہ جب دو لڑیں ایک حق پر اور دوسرا باطل پر ہو یہ ضروری نہیں، ہو سکتا ہے کہ دونوں حق پر ہوں۔ وہ کہنے لگا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام میں اختلاف ہوا ہے تو بتاؤ ان میں حق پر کون تھا اور باطل پر کون تھا؟ کہا کہ دونوں حق پر تھے۔ تو میں نے کہا کہ دو نبیوں کے درمیان اختلاف ہو اور بات ہاتھا پائی تک پہنچ جائے اور دونوں حق پر ہیں تو دو صحابیوں میں اختلاف ہو اور بات قتل تک پہنچ جائے تو دونوں حق پر کیوں نہیں ہیں؟ کہا کہ جی وہاں تو غلط فہمی تھی، جب غلط فہمی دور ہو گئی تو اختلاف ختم ہو گیا۔ میں نے کہا کہ وہاں چونکہ وحی آتی تھی وہ غلط فہمی وحی دور کر دیتی تھی اور یہاں وحی نہیں آتی تھی اس لیے غلط فہمی باقی رہ گئی اور اختلاف بھی باقی رہ گیا۔

تو اس سے تو ہمارا موقف ثابت ہو گیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وحی کا دروازہ بند ہے، نہ وحی آئی نہ غلط فہمی دور ہوئی اور آخر دم تک غلط فہمی باقی رہی۔ اب اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

قصہ حضرت آدم علیہ السلام:

﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾ فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾﴾

اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ حضرت آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا تھا لیکن ابلیس نے انکار کیا تھا۔ اس وقت ہم نے کہا تھا کہ اے آدم! یہ ابلیس تمہارا اور تمہاری بیوی دونوں کا دشمن ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تم دونوں کو جنت سے نکلوا دے اور تم مشقت میں پڑ جاؤ۔

آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا۔ پھر ان کی پسلی سے حضرت حوا کو پیدا فرمایا اور حکم دیا کہ اس خاص درخت کے قریب نہ جانا، باقی جو مرضی کھاؤ۔ آدم علیہ السلام بھول گئے اور اس خاص درخت کو کھا لیا۔ اس وجہ سے اللہ کی طرف سے عتاب آیا۔

جو بات سمجھنے کی ہے ذرا وہ سمجھنا۔ یہاں فرمایا:

﴿فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾﴾

کہ یہ شیطان تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ایسی شرارت کرے کہ آپ کا ذہن اس طرف نہ جائے اور یہ آپ کو جنت سے نکال دے، ﴿فَتَشْقٰى﴾ اور تمہیں مشقت اٹھانی پڑے۔ یہ ''شقاوت'' آخرت کی شقاوت نہیں

ہے بلکہ یہ دنیا کی مشقت ہے۔ آدم علیہ السلام جنت کے کھانے کھاتے تھے اور بغیر کسی مشقت اور محنت کے کھاتے تھے، جب دنیا میں آئے تو حکم ہوا کہ کاشت کرو اور اسے کاٹو اور کھاؤ، تو کھایا لیکن مشقت کے ساتھ۔

اب دیکھو! جب نکالنے کی بات کی تو دونوں کی کی ہے ﴿فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا﴾ کہ کہیں یہ شیطان تم دونوں کو نہ نکال دے اور جب مشقت کی بات کی تو ﴿فَتَشْقٰى﴾ فرمایا جس کا خطاب صرف آدم علیہ السلام کو ہے۔ یعنی جنت سے تم دونوں کو نکالے گا اور اے آدم! مشقت پھر تمہیں اٹھانی پڑے گی۔ تو جب دونوں نکلیں گے تو مشقت تو دونوں کو اٹھانی ہوگی، پھر اکیلے آدم کی بات کیوں کی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مشقت والے کام ہوتے ہی مرد کے ذمہ ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آگے فرمایا:

﴿اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾﴾

دیکھو آدم! جنت میں تمہیں بھوک کا مسئلہ نہیں ہے، پھل ہے کھانا ہے مل جاتا ہے، جنت میں لباس کا مسئلہ نہیں ہے لباس بنا بنایا ہے، تمہیں خود تیار نہیں کرنا پڑتا، جنت میں تمہیں پیاس کا مسئلہ نہیں ہے، پانی اور پینے کا سامان موجود ہے، جنت میں دھوپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ یعنی یہاں اسباب سارے موجود ہیں۔ لیکن اگر تم نے شیطان کی بات مان لی تو یہ تم دونوں کو جنت سے نکلوا دے گا۔ آدم! پھر تم مشقت میں پڑو گے، تمہیں کھانے کا انتظام کرنا پڑے گا، لباس کا انتظام کرنا پڑے گا، پینے کا انتظام کرنا پڑے گا، رہنے کے لیے مکان کا انتظام کرنا پڑے گا۔

تو یہاں خطاب آدم اور حوا دونوں کو اس لیے نہیں ہے کہ یہ چیزیں مہیا کرنا شوہر کے ذمہ ہوتا ہے، کھلانا شوہر کے ذمہ ہے، پلانا شوہر کے ذمہ ہے، مکان شوہر کے ذمہ ہے اور لباس شوہر کے ذمہ ہے۔ اس لیے فرمایا کہ آدم! اگر تم نے پھل کھالیا اور

اس نے تمہیں جنت سے نکال دیا تو مشقت میں آپ نے پڑنا ہے اور یہ بنیادی ضرورتیں ہیں جو ہر شوہر کے ذمہ ہیں، اس سے زائد چیزیں شوہر کے ذمہ نہیں ہیں۔

مسئلہ بتائیں تو پوری بات سمجھائیں!

لیکن یہ بات ہمیشہ سمجھنا کہ مسائل بتاتے وقت بات پوری کرنا ورنہ نتیجہ کیا نکلے گا؟! ابھی ملائیشیا کے سفر پر مجھے براہ راست ایک آدمی نے بتایا کہ رمضان میں ہمارے پاکستان کے ایک بہت معروف عالم ہیں انہوں نے ٹی وی پر بیان دیا کہ بیوی کے ذمے شوہر کے کپڑے دھونا نہیں ہے، بیوی کے ذمے شوہر کے والدین کی خدمت کرنا نہیں ہے، بیوی کے ذمے شوہر کی بہن کی خدمت نہیں ہے، بیوی کے ذمے شوہر کے کسی رشتہ دار کی کوئی خدمت نہیں ہے، صرف شوہر کی حد تک ہے۔

اس آدمی نے کہا کہ مولانا! میرے گھر میں مسئلہ پیدا ہو گیا، میری بیوی نے کہا کہ میں اب تمہارے ماں باپ کی خدمت نہیں کروں گی کیونکہ میرے ذمہ نہیں ہے، دیکھو! فلاں مولانا صاحب نے کہا ہے۔ تو مجھے کہنے لگے کہ مولانا صاحب! یہ بتائیں کہ شوہر کے ذمے بیوی کا نان و نفقہ اور سکنیٰ ہے، کیا علاج بھی ہے؟

تو مولانا صاحب کو بتانا چاہیے تھا کہ جس طرح بیوی پر شوہر کے والدین کی خدمت نہیں ہے اسی طرح شوہر پر بیوی کے علاج کا ذمہ بھی نہیں ہے، جب اس کی ساس گھر آئے تو شوہر کے ذمے کھانا کھلانا نہیں ہے،، بیوی کہے کہ میں نے ابو سے ملنے کے لیے جانا ہے تو پھر شوہر کے ذمے نہیں ہے کہ اس کے ابو کے لیے تحفے بھیجے۔ جب یہ ماں باپ کے ہاں جاتی ہے تو مال لے کر جاتی ہے، اس کے بہن بھائی آتے ہیں تو پیسہ خرچ کرتی ہے کہ میرا بھائی آیا ہے، میری بہن آئی ہے، پھر ہم بھی اکڑ جائیں کہ ہمارے ذمے نہیں ہے۔ یہ مولانا نے آدھی بات کر کے ہمارے گھر کا ماحول تباہ کیا ہے۔

اس لیے ہمیشہ یہ خیال رکھنا! عوام میں بیان کرتے وقت اعتدال کا پورا خیال رکھنا، جب یہ بتاؤ تو ساتھ دوسرے معاملات بھی بتاؤ پھر فوراً دماغ ٹھیک ہو جاتے ہیں۔

تبلیغی بھائی کی عالمہ سے شادی کا دلچسپ واقعہ:

ایک آدمی نے تبلیغ میں کچھ وقت لگایا، دین سے محبت ہو گئی تو ان کی خواہش ہو گئی کہ میں اپنا نکاح عالمہ سے کروں تاکہ ہمارے گھر کا ماحول بہت اچھا ہو۔ اس نے عالمہ سے شادی کر لی۔ سال چھ مہینے گزر گئے تو عالمہ نے تقاضا کر لیا کہ مجھے الگ مکان بنا کر دو، میں تمہارے امی ابو اور بھابیوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی، یہ میرا شرعاً حق ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے تو اس لیے شادی کی تھی کہ تم گھر میں ہو گی تو میری امی ابو اور بھابیوں کے لیے کچھ دین کا ماحول بنے گا، الگ مکان میں رہنا ہے تو میرے گھر میں دین کا ماحول کیسے بنے گا؟ اس نے کہا کہ بہر حال یہ میرا حق ہے آپ کسی دارالافتاء سے پوچھیں، میں ان کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔

وہ آدمی مولانا صاحب کے پاس گیا کہ آپ نے میرا نکاح کرایا تھا عالمہ کے ساتھ، میں نے سوچا تھا کہ میرے گھر کا ماحول دینی بنے گا لیکن وہ تو اور بگڑ گیا۔ مولانا صاحب نے کہا کہ اس میں حرج کی بات کون سی ہے؟ اس کا حل تو موجود ہے۔ گھر جاؤ اور بیوی سے کہو کہ میں تمہیں الگ مکان بنا کر دیتا ہوں اور ایک اور لڑکی سے نکاح کرتا ہوں جو میرے ماں باپ کے ساتھ رہے گی۔ اس نے جا کر عالمہ سے کہا کہ میں تمہیں الگ مکان بنا کر دیتا ہوں اور میں ایک اور نکاح کرتا ہوں جو ہمارے گھر کے ماحول کو دین کے مطابق رکھے۔ عالمہ نے کہا کہ کیوں؟ کہا کہ دوسری شادی میرا حق ہے، تم اپنا حق مکان والا لے لو، میں اپنا حق دوسری شادی والا لے لیتا ہوں تو پھر اس نے فوراً کہا کہ اگر میں یہاں ٹھہر جاؤں پھر دوسری شادی کرو گے؟ کہا کہ نہیں کروں گا۔ اس نے کہا کہ چلو میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔

اب دیکھو! دوسرا رخ بتایا تو دماغ ٹھیک ہو گیا۔ یہ رخ نہ بتاتے تو کتنے مسائل پیدا ہو جاتے۔ تو اگر بیوی کے ذمے شوہر کے ماں باپ کی خدمت نہیں ہے تو شوہر بیوی کو ماں باپ کے پاس جاتے ہوئے کتنے ہدیے دیتے ہیں کہ یہ ہدیہ تمہاری امی کا ہے، یہ تمہارے ابو کا ہے تو اس عورت کو بھی تو سوچنا چاہیے کہ کیا یہ ہدیے میرے شوہر کے ذمے ہیں؟ اور جب اس کی اپنی باری آتی ہے تو کہتی ہے کہ یہ میرے ذمے نہیں ہے... یہ میرے ذمے نہیں ہے... خاوند اور بیوی کے معاملات آپس میں اعتدال سے، پیار سے، نرمی سے چلتے ہیں، دونوں کو ایک دوسرے کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

عصمت انبیاء علیہم السلام پر اعتراض کا جواب:

﴿وَ عَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی ﴿۱۲۱﴾﴾

آدم علیہ السلام نے وہ کام کر لیا جو کرنے کا ارادہ نہیں تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ آدم علیہ السلام مشقت میں پڑ گئے۔

﴿ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَیْهِ وَ هَدٰی ﴿۱۲۲﴾﴾

اللہ تعالیٰ نے ان پر کرم فرمایا، انہوں نے توبہ کی اور اللہ نے قبول فرمالی۔

یہاں بات سمجھو! ہم اھل السنۃ والجماعۃ احناف دیوبند کا عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام چھوٹے اور بڑے گناہوں سے معصوم ہیں، اللہ تعالی ان کی حفاظت فرماتے ہیں۔ جو لوگ نبی کو معصوم نہیں مانتے وہ اس آیت کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں ﴿وَ عَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی﴾ اور ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ آدم علیہ السلام نے نافرمانی کی- العیاذ باللہ- یہ اشکال ان کو ہوتا ہے جو لفظ کا ایک معنی سمجھتے ہیں، جب ایک لفظ کے دو معنی ہوں اور بندے کو دونوں آتے ہوں تو پھر اشکال نہیں ہوتا۔

لفظ "عَصٰی" معصیت سے ہے اور معصیت کا ایک معنی ہے نافرمانی کرنا اور

دوسرا معنی ہے کہ وہ کام کرنا جس کا ارادہ نہ ہو۔ آدمی بعض کام بلا ارادی طور پر کر لیتا ہے، کرنا کچھ چاہتا ہے اور ہو کچھ جاتا ہے، اس کو بھی معصیت کہتے ہیں اور یہاں معصیت کا یہی معنی ہے کہ آدم علیہ السلام کا قطعاً یہ مقصد نہیں تھا کہ جس درخت سے اللہ تعالی نے منع کیا ہے میں وہ درخت کھاؤں، اللہ نے فرمایا تھا کہ اس درخت سے نہیں کھانا تو وہ سمجھے کہ ایک خاص درخت سے منع فرمایا ہے، جنسِ درخت سے منع نہیں فرمایا۔ تو وہ کرنا کچھ چاہتے تھے اور صادر کچھ اور ہو گیا، تو اس معصیت کا معنی نافرمانی نہیں ہے۔

اسی طرح "غَوٰی" کا لفظ یہ غوایت سے مشتق ہے، اس کا ایک معنی ہے دنیاوی معاملات میں انسان کا مشقت میں پڑ جانا، راحت کا ختم ہو جانا، تکلیف میں آجانا، اور ایک اس کا معنی ہے؛ گمراہ ہو جانا۔ تو جن کو "غَوٰی" کا ایک ہی معنی آتا ہے وہ اعتراض کرتے ہیں کہ آدم علیہ السلام گمراہ ہو گئے - العیاذ باللہ- اور جن کو "غَوٰی" کے دونوں معنی آتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہاں "غَوٰی" کا معنی گمراہ ہونا نہیں ہے بلکہ اس کا معنی زندگی کا تنگ ہونا اور عیش کا ختم ہونا ہے اور تنگ ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ قلبی تنگی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ مشقت پیدا ہو گئی ہے۔

ایک دفعہ میں کراچی گیا تو میں نے مستقل اسی موضوع پر بیان کیا کہ لفظ کے دو معنی ہوتے ہیں اور جو لوگ صرف ایک معنی سمجھتے ہیں انہیں اشکال ہوتا ہے مثلاً لفظ تقلید یہ قلادہ سے مشتق ہے، غیر مقلدین جو تقلید کے دشمن ہیں کیونکہ ان کو قلادہ کا صرف ایک ہی معنی آتا ہے؛ پٹہ اور ہم تقلید سے محبت کرتے ہیں کیوں کہ ہمیں قلادہ کے دو معنی آتے ہیں پٹہ بھی اور ہار بھی۔

مماتی ہمیشہ پیغمبر کی موت کے بارے میں اشکال میں رہتے ہیں، کیوں کہ ان کو موت کا ایک ہی معنی آتا ہے یعنی خروج روح اور ہمیں موت کے دو معنی آتے ہیں:

ایک خروجِ روح اور دوسرا حبسِ روح۔

اسی طرح دودھ پلانے کی مدت کے بارے میں غیر مقلدین کا اشکال امام صاحب پر ہے کیوں کہ ان لوگوں کو ”حمل“ کا ایک ہی معنی آتا ہے یعنی بچے کا ماں کی گود میں ہونا اور ہمیں اشکال نہیں ہوتا کیونکہ ہمیں حمل کے دو معنی آتے ہیں؛ ایک بچے کا ماں کی گود میں ہونا اور دوسرا بچے کا ماں کے پیٹ میں ہونا۔

اسی طرح ”عَصٰی“ اور ”غَوٰی“ کے بھی دو دو معنی آتے ہیں جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے۔

یہاں اندھا تو وہاں بھی اندھا:

﴿وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾﴾

جو شخص میری یاد سے غافل ہوتا ہے تو اس کی زندگی تنگ ہو جاتی ہے۔ یا تو قبر کی زندگی تنگ ہو جاتی ہے یا دنیا کی زندگی۔ دنیا کی زندگی کے تنگ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی حرص بڑھ جاتی ہے، بہت کچھ ہونے کے باوجود انسان کا قلبی سکون تباہ ہو جاتا ہے اور جب اس شخص کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اٹھائیں گے تو اندھا کر کے اٹھائیں گے۔ یہ اللہ سے کہے گا:

﴿قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْۤ اَعْمٰى وَ قَدْ كُنْتُ بَصِیْرًا ﴿۱۲۵﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْیَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾﴾

کہ یا اللہ! میری تو آنکھیں تھیں آج تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا؟ فرمایا: ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں اور تو نے انہیں بھلا دیا تو آج کے دن تجھے بھی بھلا دیا جائے گا۔ بھلا دینے کا یہ معنی نہیں ہے کہ اللہ بھول جائیں گے بلکہ اس کا معنی یہ ہے

کہ جس طرح اس شخص نے اللہ کی آیات کا خیال نہ رکھا آج اس کا بھی خیال نہیں رکھا جائے گا۔ اس کو "تُنْسٰی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حضرت تھانوی اور ایک غیر مقلد کا دلچسپ مکالمہ:

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک اندھا غیر مقلد آیا۔ دل کا بھی اندھا آنکھوں کا بھی اندھا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ میں نے آپ سے گفتگو کرنی ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے کہ میں نے آپ سے گفتگو نہیں کرنی۔ اس نے کہا کہ کیوں؟ فرمایا کہ گفتگو کا فائدہ نہیں ہے، اس نے کہا کہ کیوں فائدہ نہیں ہے؟ فرمایا: اس لیے نہیں ہے کہ اگر میں تمہیں سمجھاؤں گا اور تمہیں بات سمجھ آ بھی جائے تو پھر کیا ہو گا؟ اس نے کہا کہ میں مان جاؤں گا۔ فرمایا کہ مان جاؤ گے تو پھر کیا ہو گا؟ اس نے کہا: پھر آپ کے مسلک کے مطابق مجھے ہدایت مل جائے گی۔ فرمایا کہ پھر؟ کہا کہ ہدایت ملے گی تو میں جنت میں جاؤں گا۔ حضرت نے فرمایا کہ تمہیں ہدایت مل بھی جائے تب بھی تو جنت میں نہیں جا سکتا، لہٰذا تجھے سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس نے کہا: میں کیوں جنت نہیں جا سکتا؟ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: قرآن کریم میں ہے:

﴿وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى﴾[166]

جو دنیا میں اندھا ہے وہ قیامت کو بھی اندھا ہو گا۔

تُو نے تو قیامت کو ویسے ہی اندھا ہونا ہے اور اندھا جنت میں نہیں جا سکتا تو کیا فائدہ تجھے سمجھانے کا؟ اس نے کہا: حضرت! اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا: تاویل نہ کرو، سیدھی سیدھی بات کرو، اس نے کہا کہ جی

166۔ الاسراء 72:17

تاویل کے بغیر تو آیت حل ہی نہیں ہو سکتی۔ حضرت نے فرمایا کہ یہی بات امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کریں تو تم کہتے ہو کہ تاویلیں کرتا ہے اور جب تیرا مسئلہ آیا تو تو کہتا ہے کہ تاویل کے بغیر آیت حل ہی نہیں ہوتی۔ اس نے کہا: مجھے بات سمجھ آ گئی ہے۔

تکالیف ملیں تو دو کام کریں:

﴿فَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَ سَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ﴾

میرے پیغمبر! یہ لوگ آپ کی بات نہیں مانتے، آپ کو تنگ کرتے ہیں، الزامات لگاتے ہیں، راستے میں رکاوٹ ڈالتے ہیں تو آپ دو کام کریں:

1: ﴿فَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ﴾ ایک تو صبر کریں۔

2: ﴿وَ سَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ﴾ ذکر کریں، اللہ کو یاد کریں۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رکھیں کہ جب بھی کوئی بندہ دین کا کام کرے لوگ اس کو ستائیں، رکاوٹیں ڈالیں تو اس کا حل صرف دو چیزیں ہیں:

☆ ان کی تکالیف پر صبر اور برداشت کریں۔

☆ اللہ... اللہ... اللہ... کا ذکر ہر وقت اللہ کی یاد میں رہیں اور بس۔ ان دو کاموں میں لگ جائیں تو اللہ مسائل حل فرما دیتے ہیں۔ یہ قرآنی نسخہ ہے۔

پانچوں نمازوں کے اوقات کا ثبوت:

﴿وَ سَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَ قَبۡلَ غُرُوۡبِہَا ۚ وَ مِنۡ اٰنَآیِٔ الَّیۡلِ فَسَبِّحۡ وَ اَطۡرَافَ النَّہَارِ لَعَلَّکَ تَرۡضٰی ﴿۱۳۰﴾﴾

آپ اپنے رب کی تسبیح اور حمد بیان کرتے رہیں سورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے، اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کریں اور دن کے کناروں

میں بھی تاکہ آپ خوش ہو جائیں۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ اس آیت میں پانچوں نمازوں کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ ﴿قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ﴾ (سورج نکلنے سے پہلے) سے مراد فجر کی نماز ہے، ﴿وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا﴾ (غروب ہونے سے پہلے) سے ظہر اور عصر کی نماز مراد ہے، ﴿وَمِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ﴾ (رات کے اوقات میں) اس میں مغرب اور عشاء آگئی ہے۔ ﴿وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ﴾ (دن کے کناروں میں) اس سے فجر اور مغرب کی تاکید مراد ہے۔ ﴿لَعَلَّكَ تَرْضٰی﴾ تاکہ تم خوش ہو جاؤ یعنی صبر کرو اور نمازیں پڑھو، ذکر کرو، اس سے یہ مصیبتیں ٹل جائیں گی اور آفات ختم ہو جائیں گی۔

دنیا سے بے رغبتی اختیار کریں!

﴿وَ لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا﴾

یہاں بھی نبی کو خطاب کرکے یہ بات ہمیں سمجھائی ہے کہ اے نبی! جو مال ہم نے ان کفار کو دیا ہے آپ کی نگاہ اس پر نہ اٹھے، یہ سب دنیا کا مال ہے، آزمائش کے لیے ہے، اللہ کا دیا ہوا رزق بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے، بس آپ خود بھی نماز پڑھیں اور گھر والوں کو بھی نماز کی ترغیب دیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

سورة الانبیاء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمۡ وَ هُمۡ فِیۡ غَفۡلَةٍ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۱﴾ مَا یَاۡتِیۡهِمۡ مِّنۡ ذِكۡرٍ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ مُّحۡدَثٍ اِلَّا اسۡتَمَعُوۡهُ وَ هُمۡ یَلۡعَبُوۡنَ ﴿۲﴾ لَاهِیَةً قُلُوۡبُهُمۡ ؕ وَ اَسَرُّوا النَّجۡوَی ٭ۖ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ٭ۖ هَلۡ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ ۚ اَفَتَاۡتُوۡنَ السِّحۡرَ وَ اَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳﴾﴾

مشرک لوگ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو رد کرتے اور بنیاد یہ بناتے کہ تم بشر ہو اور ہم بھی بشر ہیں، بشر نبی نہیں ہو سکتا۔

”بشر“ کا معنی:

بشر کی تعریف یہ ہے کہ ذو عقل ہو اور محسوس ہو۔ ملائکہ اور جنات بشر نہیں ہیں، اس لیے کہ ذو عقل تو ہیں لیکن محسوس نہیں۔ حیوانات، اشجار اور احجار بھی بشر نہیں اس لیے کہ محسوس تو ہیں لیکن ذو عقل نہیں جبکہ بشر میں یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں؛ ایک یہ کہ اس میں عقل ہو اور دوسرا وہ محسوس ہو۔ محسوس ہونے کا معنی کہ آپ اس کو ہاتھ لگانا چاہیں تو لگا سکیں، پکڑنا چاہیں تو پکڑ سکیں، دیکھنا چاہیں تو دیکھ سکیں۔

تو وہ لوگ بشر کا معنی نہیں سمجھتے تھے اس لیے انہیں الجھنیں ہوتی تھیں، آج کے مشرک اور نبی کے دور کے مشرک دونوں کی فکر ایک جیسی ہے۔ اُن کی فکر اور سوچ یہ تھی کہ نبوت اور بشریت جمع نہیں ہو سکتی اور اِن کی بھی یہی سوچ ہے کہ نبوت وبشریت جمع نہیں ہو سکتی۔ فرق یہ تھا کہ اُنہوں نے دیکھا تو بشر مانا لیکن نبی نہیں مانا اور اِنہوں نے نبی تو مانا لیکن بشر نہیں مانا۔ حالانکہ نبی ہوتا ہی ہمیشہ بشر ہے، بشریت کے علاوہ اللہ نے کسی کو نبوت کے لیے منتخب کیا ہی نہیں ہے۔ اللہ رب العزت کا فیصلہ ہے:
﴿وَ مَآ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ﴾ ہم نے جب بھی کسی کو نبی بنایا تو مرد اور بشر ہی کو بنایا۔

قرآن شعر نہیں اور نبی شاعر نہیں:

﴿بَلۡ قَالُوۡۤا اَضۡغَاثُ اَحۡلَامٍۢ بَلِ افۡتَرٰٮهُ بَلۡ هُوَ شَاعِرٌ ۚۖ فَلۡيَاۡتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَاۤ اُرۡسِلَ الۡاَوَّلُوۡنَ ۝۵﴾

مشرکین کا ایک الزام، اعتراض اور بہتان یہ بھی تھا کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم – معاذ اللہ – شاعر ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام؛ قرآن پاک بشر کا کلام ہے، قرآن کریم میں ہے:

﴿وَمَا عَلَّمۡنٰهُ الشِّعۡرَ وَمَا يَنۡۢبَغِىۡ لَهٗ﴾ [167]

کہ ہم نے نبی کو شعر کا علم دیا ہی نہیں اور شاعری آپ کے لائق ہی نہیں ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اشعار پڑھنا ثابت ہی نہیں ہے۔ کبھی کبھار اگر آپ نے کوئی ایک آدھ شعر فرما دیا ہو تو الگ بات ہے یا کسی کا کوئی شعر بطورِ استشہاد و

167۔ یٰسین 69:36

استدلال کے نقل فرمادیا ہو تو الگ بات ہے لیکن مستقل شعر پڑھنا اور کہنا آپ کا مزاج ہی نہیں تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اشعار پڑھتے ہی نہیں تھے تو مشرکین نے کیسے الزام لگایا کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شاعر ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک شعر کا معنی وہ ہے جو ہمارے عرف میں ہے اور ایک شعر کا معنی وہ ہے جو لغتِ عرب میں ہے۔ ہمارے ہاں کلام دو قسم کا ہے:

ایک وہ کلام ہے جو مُسَجَّع اور مُقَفَّع ہو، اسے کلام شعری کہتے ہیں اور ایک کلام وہ ہے جو مُسَجَّع اور مُقَفَّع نہ ہو، اسے کلام نثر کہتے ہیں۔

ہمارے ہاں شاعر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ کلام قافیہ بندی کے ساتھ پڑھتا ہے، اسے کہتے ہیں کہ یہ شاعری کرتا ہے اور اگر بغیر قافیہ بندی کے پڑھے تو ہم کہتے ہیں کہ نثر پڑھ رہا ہے جبکہ عرب میں شعر خیالات اور فرضی چیزوں کو کہتے ہیں، اس لیے منطق میں جب کوئی فرضی قضیہ یا خیالی قضیہ پیش کرنا ہو تو اسے قضیہ شعریہ کہتے ہیں۔ تو مشرکین جو کہتے تھے کہ یہ شاعر ہے اس کا معنی یہ نہیں تھا کہ وہ کلام مُسَجَّع اور مُقَفَّع ہے بلکہ اس کا معنی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ یہ خیالی اور فرضی باتیں بیان کرتا ہے، کبھی کوئی قصہ بیان کر دیتا ہے، کبھی کوئی واقعہ بیان کر دیتا ہے، اس کا حقیقت سے کیا تعلق ہے۔ تو یہ معنی ہے ان کے اس قول ﴿بَلْ هُوَ شَاعِرٌ﴾ کا۔

تقلید کا ثبوت:

﴿فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۷﴾

اگر تمہیں معلوم نہیں تو اہلِ علم سے پوچھ لو۔

اس سے پتا چلا کہ آدمی دو قسم کے ہیں؛ بعض وہ ہیں جن کے پاس علم ہے اور بعض وہ ہیں جن کے پاس علم نہیں ہے۔ جن کے پاس علم نہیں ہے وہ ان سے پوچھیں جن کے پاس علم ہے اور پوچھنا تبھی ہوتا ہے جب عمل کرنا ہو و گرنہ پوچھنے کا کوئی فائدہ

نہیں ہوتا۔ اس سے تقلید ثابت ہوتی ہے کہ غیر اہلِ علم؛ اہلِ علم سے پوچھیں۔

یہاں یہ بات ذہن میں نہ آئے کہ اس آیت سے تو ان کے لیے تقلید ثابت ہوتی ہے جو اہلِ علم نہیں ہیں تو پھر علماء تقلید کیوں کرتے ہیں؟

اس کا جواب ذہن میں رکھ لیں کہ ایک تقلید ہوتی ہے عوام کی اور ایک تقلید ہوتی ہے خواص کی، عوام کی تقلید فروع اور اصول دونوں میں ہوتی ہے اور خواص کی تقلید فروع میں نہیں بلکہ اصول میں ہوتی ہے۔ اب چاروں ائمہ رحمہم اللہ کے بعد جتنے بھی مجتہد ہوں گے ان میں مجتہد مطلق کوئی نہیں ہو گا، اگر ہو گا تو مجتہد فی المذہب ہو گا۔ یعنی ائمہ اربعہ کے بعد کسی مجتہد کے اصول بھی اپنے ہوں اور فروع بھی اپنے ہوں ایسے مجتہد نہیں ہوں گے، بلکہ اصول اس کے مجتہد مطلق والے ہوں گے اور انہی اصولوں کی روشنی میں اجتہاد یہ خود کرے گا۔ اسے "مجتہد فی المذہب" کہتے ہیں اور ہم جو یہ کہتے ہیں کہ مجتہد مطلق اب نہیں ہو گا اس کا معنی یہ نہیں کہ اس کا آنا اب محال شرعی ہے بلکہ ہم کہتے ہیں کہ ایسے مجتہد کا پیدا ہونا اب تقریباً ناممکن ہے۔

محال عقلی، محال شرعی اور عادی:

محال کی تین قسمیں ہیں:

1: ایک ہوتا ہے محال عقلی مثلاً ایک چیز آگ بھی ہو اور پانی بھی ہو، ایک چیز روشنی بھی ہو اور اندھیرا بھی ہو، ایسا ہونا محال ہے اور یہ محال عقلی ہے یعنی عقل کی رو سے یہ جمع نہیں ہو سکتے، عقل ان کے جمع ہونے کو تسلیم نہیں کرتی۔

2: اور ایک ہوتا ہے محال شرعی یعنی شرعاً ایسا ہونا محال ہو، مثلاً دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا یہ شرعاً محال ہے یعنی شریعت اس کو تسلیم نہیں کر سکتی۔

3: اور ایک ہوتا ہے محال عادی یعنی محال عقلی بھی نہ ہو اور محال شرعی بھی نہ لیکن عام طور پر لوگوں کی عادت میں ایسا نہ ہوتا ہو جیسے ایک آدمی اتنا دوڑے کہ دو سو

کلو میٹر فی گھنٹا اس کی رفتار ہو، اب کسی بندے کے لیے دو سو کلو میٹر فی گھنٹا دوڑنا نہ شرعاً محال ہے اور نہ ہی عقلاً محال ہے لیکن عادتاً محال ہے کیونکہ عام طور پر کسی بندے میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ دو سو کلو میٹر فی گھنٹا کی رفتار سے دوڑے، اسے "محالِ عادی" کہتے ہیں۔

تو ہم جو کہتے ہیں کہ مجتہد مطلق اب نہیں ہو سکتا، اس کا ہونا محال ہے تو اس سے مراد محال عادی ہے، عقلاً اور شرعاً محال نہیں ہے، اور مجتہد مطلق کے اب محال ہونے کی وجہ ہے کہ ہمارے بندوں میں اتنی صلاحیتیں نہیں ہیں کہ بندہ قرآن کا بھی حافظ ہو، دس لاکھ احادیث کا بھی حافظ ہو، پھر موضوع اور صحیح کو الگ بھی کر سکتا ہو، سارے علوم بھی اس کے پاس ہوں اور اصول بھی اپنے نکالے اور اپنے اصولوں سے فروع بھی اپنے نکالے تو یہ صلاحیتیں اب نہیں ہیں، اس لیے مجتہد کا اب پیدا ہونا یہ محال عادی ہے۔

تقلید مطلق اور تقلید شخصی:

تقلید کی دو قسمیں ہیں: ایک ہے تقلید شخصی اور ایک ہے تقلید غیر شخصی جسے تقلید مطلق بھی کہتے ہیں۔ تقلید شخصی ان لوگوں کے لیے ہے جو اصحاب الترجیح نہیں ہیں، جو اصحاب الترجیح ہیں ان کے لیے تقلید شخصی نہیں ہے۔ اصحاب الترجیح وہ حضرات ہیں جن کے پاس دلائل کو پرکھنے کی صلاحیت ہو اور دلائل کی بنیاد پر کسی ایک موقف کو ترجیح دے سکتے ہوں، یہ حضرات دو فقہاء کے موقف اور ان کے دلائل کو لیتے ہیں اور ایک فقیہ کے دلائل کو دیکھتے ہوئے اس کے موقف کو ترجیح دے سکتے ہیں، اور جن کے پاس اتنی صلاحیت نہ ہو تو وہ تقلید شخصی کریں۔

انبیاء بشر ہیں، خدا نہیں!

﴿وَمَا جَعَلۡنٰهُمۡ جَسَدًا لَّا یَاۡكُلُوۡنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوۡا خٰلِدِیۡنَ ۝۸﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے جو نبی بنائے ایک تو وہ ایسے جسد نہیں تھے جو کھاتے نہ ہوں یعنی یہ بشر تھے فرشتے نہیں تھے، نبی انسان ہوتا ہے فرشتہ نہیں ہوتا۔ فرشتہ نہیں کھاتا اور یہ کھاتے تھے۔ لہٰذا یہ انسان تھے، اور دوسری بات کہ ﴿وَ مَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ﴾ یہ ہمیشہ رہنے والے بھی نہیں تھے بلکہ فوت ہونے والے تھے اور اللہ وہ ہے جو ہمیشہ رہتا ہے فوت نہیں ہوتا۔ تو یہاں اس بات کی نفی کرنی مقصود ہے کہ نبی بشر ہوتا ہے، نہ ہی فرشتہ ہوتا ہے اور نہ ہی خدا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "خالد" اللہ کی صفت ہے اور یہ تو "خالدین" نہیں تھے، لہٰذا یہ نہ فرشتے ہیں اور نہ ہی خدا ہیں۔

قادیانیوں کے استدلال کا جواب:

اس آیت سے قادیانی استدلال کرتے ہیں کہ جب سارے انبیاء فوت ہو گئے ہیں تو ان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ہیں، لہٰذا وہ بھی فوت ہو گئے ہیں۔ تو تم کیسے کہتے ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں اس بات سے بحث نہیں ہے کہ کوئی زندہ ہے یا نہیں، فوت ہوا ہے یا نہیں بلکہ اس آیت میں یہ بتانا مقصود ہے کہ نبی بشر ہوتا ہے، بشر کھاتا بھی ہے اور ہمیشہ رہتا بھی نہیں ہے، اس آیت کا یہ معنی نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام فوت ہو گئے ہیں۔ تو اس آیت میں اتنا بتانا مقصود ہے کہ بشر پر خلود نہیں ہے بلکہ فنا ہے، باقی قادیانیوں کا یہ کہنا کہ "سارے انبیاء فوت ہو گئے ہیں" تو اس بات کا اس آیت میں تذکرہ نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو زندگی دی ہے وہ عام قانون سے ہٹ کر دی ہے، یہ معجزہ ہے۔

قادیانیوں سے گفتگو کا طریقہ:

قادیانیوں سے جب بھی گفتگو کرنی ہو تو ان کے ساتھ بنیادی گفتگو کے موضوعات تین ہیں:

1: حیاتِ عیسیٰ اور وفاتِ عیسی علیہ السلام

2: اجرائے نبوت اور ختمِ نبوت

3: صدقِ مرزا و کذبِ مرزا

قادنیوں سے جب بھی بات کرنی پڑے تو ”صدق مرزا و کذب مرزا“ پر کریں اور وہ جب بھی بات کریں گے تو ”وفات عیسیٰ اور حیات عیسیٰ“ پر کریں گے لیکن آپ نے اس پر بات نہیں کرنی۔ اگر وہ اس موضوع کو چھیڑ بھی دیں تو آپ انہیں کہیں کہ چلیں! ہم ایک منٹ کے لیے مان لیتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں تو بتاؤ پھر کیا ہوا؟ ”حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی آسکتے ہیں یا نہیں؟“ چلیں ہم ایک منٹ کے لیے مان لیتے ہیں کہ آسکتے ہیں تو بتاؤ پھر کیا ہوا؟ دیکھو! جھگڑا تو اس بات پر ہے کہ مرزا نبی ہے کہ نہیں؟ جس کو تم نبی مانتے ہو اس کو ثابت تو کرو! حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو جائیں تو کیا اس سے مرزا نبی بن جائے گا؟! مسئلہ تو مرزا کی نبوت کا ہے۔

تُو نمبر دار نہیں بن سکتا!

مشہور ہے کہ گاؤں میں ایک میراثی رہتا تھا۔ اس کے بیٹے نے ماں سے پوچھا کہ اگر نمبر دار مر جائے تو نمبر دار کون ہو گا؟ ماں نے کہا: اس کا بیٹا۔ اس نے کہا کہ اگر وہ بھی مر جائے تو....؟ ماں نے کہا کہ اس کا بیٹا، پوچھا کہ اگر وہ بھی مر جائے تو...؟ ماں نے کہا کہ اس کا بیٹا۔ ماں نے جب بیٹے کے سوالات پہ سوالات سنے تو اس نے کہا: بیٹا! 100 نمبر دار بھی باری باری مر جائیں تُو نے پھر بھی میراثی ہی رہنا ہے، تو نمبر دار نہیں بن سکتا۔

ہم کہتے ہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام بشمول حضرت ادریس اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی موت مان بھی لیں تب بھی اس خبیث مرزا غلام احمد قادیانی نے میراثی ہی رہنا ہے، یہ نبی نہیں بن سکتا۔

توحید باری تعالیٰ پر دلیل:

﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿٢٢﴾﴾

اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ زمین وآسمان میں ایک خدا ہے، کئی خدا نہیں ہیں۔ تو یہاں تعدُّدِ اِلٰہ کی نفی کی ہے اور تعدُّدِ اِلٰہ کی نفی پر جو دلیل پیش فرمائی ہے وہ یہ آیت ہے: ﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ کہ اگر آسمان وزمین میں ایک سے زائد خدا ہوں تو آسمان وزمین میں فساد ہو جائے گا۔ تو جب آسمان وزمین میں فساد نہیں ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ ایک سے زائد خدا بھی نہیں ہیں۔ اب سمجھیں کہ یہ دلیل بنتی کیسے ہے؟

ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ آسمان وزمین میں ایک ہی خدا ہے۔ مشرکین کا دعویٰ ہے کہ دو ہیں۔ تو اب ہمارا ان سے یہ سوال ہے کہ دنیا میں جو بھی کام ہو وہ دونوں کے اتفاق سے ہو گا یا اختلاف سے ہو گا؟ اگر آپ کہتے ہیں کہ دونوں کے اتفاق سے ہو گا تو سوال یہ ہے کہ کیا ایک کی طاقت کافی نہیں تھی کہ دوسرے کی ضرورت پڑی ہے؟! اگر ایک کافی تھا تو دوسرا خدا کیسے ہوا؟ اور اگر ایک کافی نہیں تھا تو پھر یہ خدا کیسے ہوا؟ اور اگر آپ کہتے ہیں کہ دنیا کے کام دونوں کے اختلاف سے ہوتے ہیں تو اب الجھن یہ ہو گی کہ جب اختلاف ہو تو ایک کی بات چلتی ہے ایک کی نہیں چلتی تو جس کی نہیں چلتی وہ عاجز ہوا اور عاجز تو خدا نہیں ہوتا تو پھر خدا کیسے کہو گے؟

اس لیے ہم کہتے ہیں کہ دنیا میں خدا ایک ہی ہے، ایک سے زائد نہیں۔ ”لَآ اِلٰہَ“ سے باقی اِلٰہ کی نفی کر دو اور ”اِلَّا اللّٰہُ“ سے ایک کو مان لو تو یہ توحید ہے۔ ایک خدا کو ماننے کا نام توحید نہیں بلکہ ایک خدا کو مانیں اور ایک سے زائد خدا کی نفی بھی کریں تو یہ توحید ہے۔

ترکِ رفع یدین اور نکتہ اختلاف کی تنقیح:

یہی بات ہم غیر مقلدین سے کہتے ہیں جب ان کی اور ہماری بات رفع الیدین پر ہوتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ چار رکعت والی نماز میں ہم لوگ ایک مقام پر رفع الیدین کرتے ہیں اور ستائیس مقامات پر نہیں کرتے اور تم لوگ دس مقامات پر کرتے ہو اور اٹھارہ مقامات پر نہیں کرتے۔ تو تمہارا اور ہمارا اختلاف پورا ہونا چاہیے۔

چار رکعات والی نماز میں عقلی طور پر اٹھائیس مقامات بنتے ہیں جہاں پر رفع الیدین ہو سکتا ہے۔ چار رکعات والی نماز میں چار قیام ہیں ہر رکعت کے شروع میں ایک رفع یدین ہو تو یہ چار رفع یدین ہو گئے، رکوع میں جاتے ہوئے رفع یدین اور رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے رفع یدین ہو تو یہ کل بارہ ہو گئے۔ آٹھ سجدے ہیں اور سجدے میں جاتے ہوئے اور سجدے سے اٹھتے ہوئے رفع یدین ہو تو یہ سولہ رفع یدین ہو گئے۔ بارہ اور سولہ کو ملائیں تو کل اٹھائیس ہو گئے۔ ہم احناف شروع میں ایک بار رفع یدین کرتے ہیں اور باقی ستائیس مقامات پر نہیں کرتے اور غیر مقلدین شروع نماز میں، رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے اور تیسری رکعت کے شروع میں کرتے ہیں تو یہ ٹوٹل دس مقامات ہوئے اور اٹھارہ مقامات پر یہ لوگ رفع یدین نہیں کرتے۔ تو ہم ان سے کہتے ہیں کہ جس طرح عقیدہ توحید پر ہماری دلیل ہے ﴿فَاعۡلَمۡ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ

اِلَّا اللّٰہُ﴾[168] ہے کہ ایک خدا کا اثبات اور باقی سب کی نفی ہے اسی طرح ترک رفع یدین کے مسئلہ میں بھی ہماری دلیل میں ایک مرتبہ رفع یدین کا اثبات اور باقی مقامات کی نفی ہے۔ترک رفع الیدین پر ہماری دلیل حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِصَلَاةِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَقَامَ فَرَفَعَ يَدَيْهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ ثُمَّ لَمْ يُعِدْ"[169]

کیا میں تم لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے بارے میں نہ بتاؤں؟لوگوں نے کہا کہ بتائیں تو آپ نے نماز پڑھ کر دکھائی اور شروع میں رفع یدین کیا، پھر کہیں بھی نہیں کیا۔

ہم ان لوگوں سے کہتے ہیں کہ تم بھی اسی طرح ایک حدیث پیش کرو–خواہ وہ حدیث صحیح ہو، خواہ ضعیف ہو– کہ جس میں چار رکعت والی نماز میں دس مقامات پر رفع یدین کیا ہو اور اٹھارہ مقامات پر نہ کیا ہو۔ ایسی حدیث پوری ذخیرہ احادیث میں ایک بھی موجود نہیں ہے۔

بڑھیا کا چرخہ:

میں سنایا کرتا ہوں کہ ایک عورت جنگل میں چرخہ چلایا کرتی تھی۔ کسی نے پوچھا: اسکول گئی ہو؟ کہا: نہیں، کبھی مدرسہ گئی ہو؟ نہیں، اچھا! یہ بتاؤ کہ اللہ موجود ہے؟ کہا: جی موجود ہے۔ دلیل کیا ہے؟ اس بوڑھی نے کہا: یہ چرخہ دلیل ہے۔ یہ کیسے دلیل ہے؟ اس نے کہا: جب میں چلاتی ہوں تو چلتا ہے اور جب نہ چلاؤں تو نہیں چلتا،

168۔ محمد 19:47

169۔ سنن النسائی، رقم:1026

اس سے پتا چلا کہ سورج کو کوئی نکالنے والا موجود ہے، کائنات کو چلانے والا کوئی موجود ہے تبھی تو چل رہی ہے۔ تو پتا چلا کہ کائنات کو چلانے والی ذات موجود ہے اور وہ اللہ ہے۔ پھر پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ خدا کتنے ہیں؟ اس نے کہا: ایک ہے۔ دلیل کیا ہے؟ کہا: یہ چرخہ دلیل ہے۔ وہ کیسے؟ اس نے کہا: میں جب جوان تھی تو میری ماں نے میری شادی کردی تھی اور جہیز میں مجھے یہ چرخہ دیا تھا۔ اب میں بوڑھی ہوگئی ہوں اور چرخہ اب بھی ٹھیک چل رہا ہے کیونکہ چلانے والی ایک ہے، اگر چلانے والی دو ہوتیں تو میں کہتی کہ ادھر چلاؤ دوسری کہتی الٹا چلاؤ تو اس سے چرخہ ٹوٹ جاتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ ایک ہے، اگر دو ہوتے تو ایک کہتا سورج مشرق سے نکالنا ہے اور دوسرا کہتا کہ مغرب سے نکالنا ہے تو سورج ٹوٹ جاتا لیکن سورج ابھی تک ٹھیک چل رہا ہے تو یہ دلیل ہے کہ چلانے والا خدا ایک ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کو خدا کہنا جائز ہے:

ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو "اللہ" بھی کہہ سکتے ہیں اور "خدا" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی مقام پر علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر عثمانی میں لکھا ہے: "اور کامل تذلل صرف اسی ذات کے سامنے اختیار کیا جاسکتا ہے جو اپنی ذات وصفات میں ہر طرح کامل ہو، اسی کو ہم "اللہ" یا "خدا" کہتے ہیں۔"[170]

اس لیے میں یہ بات بار بار کہتا ہوں کہ ہماری پوری محنت یہ ہے کہ امت اکابرین کے ساتھ رہے، اکابرین سے ہٹ کر کوئی رائے قائم نہ کرے۔ یعنی میں اس بات پر جھگڑتا ہوں کہ لوگ اپنی رائے قائم نہ کریں بلکہ اکابرین والی رائے پر عمل پیرا ہوں اور میرے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ امت کو توڑ رہا ہے اور جو لوگ اکابر کو چھوڑ کر

170۔ تفسیر عثمانی: ج2 ص555

اپنی رائے دیتے ہیں ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ امت کو جوڑ رہے ہیں۔ بھائی! الگ رائے دینے سے امت جڑتی ہے یا اکابرین کی رائے پر رہ کر امت جڑتی ہے؟ (اکابرین کی رائے پر رہ کر۔ سامعین) تو اس بات کا خوب اہتمام کریں کہ اکابرین کی رائے کو لیا جائے اور اپنی رائے دینے سے بچا جائے۔

موت برحق ہے:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۗ وَإِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿٣٥﴾﴾

ہر جاندار نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ ہم تمہیں اچھی اور بری حالتوں میں مبتلا کر کے آزماتے ہیں اور تمہیں ہماری طرف لوٹ کر ہی آنا ہے۔

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ میں صرف اتنی بات ہے کہ ہر نفس پر موت آنی ہے، اس کا معنی یہ نہیں کہ ہر ایک پر موت آئی ہے۔ اس دونوں میں فرق سمجھنا بہت ضروری ہے۔

وقوعِ موت اور خبرِ موت میں فرق کرنا ضروری ہے:

جب ہم کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وفات کے بعد اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ حضور تو زندہ نہیں ہیں، ان کی دلیل یہی آیت ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ بات سمجھو! ایک ہے وقوعِ موت اور ایک ہے خبرِ موت، قرآن اور حدیث نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کی خبر دی ہے، آپ کی موت کا وقوع بیان نہیں کیا۔

منکرین حیات الانبیاء سے گفتگو:

ہماری تو بات چلتی رہتی ہے۔ میں نے ایک ساتھی سے پوچھا کہ حضور پاک

صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے ہیں؟ اس نے کہا کہ جی ہاں! میں نے کہا: دلیل کیا ہے؟ اس نے کہا: ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ میں نے کہا: تم بھی نفس ہو؟ اس نے کہا: جی ہاں۔ میں نے کہا: تم مر گئے ہو؟ کہنے لگا: نہیں! میں نے کہا: قرآن تو کہہ رہا ہے کہ ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ اور تم بھی نفس ہو لہذا تم کو بھی فوت شدہ ہونا چاہیے۔ اس نے کہا: کیا حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر موت نہیں آئی؟ میں نے کہا: میں تو آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ اگر موت آئی ہے تو آپ دلیل پیش کرو! اس نے کہا: ﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ﴾[171] میں نے کہا: جب یہ آیت اتری تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت زندہ تھے؟ اس نے کہا: جی ہاں زندہ تھے۔ میں نے کہا: زندہ کو قرآن نے ﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ﴾ کیسے کہہ دیا؟ اس آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر موت آئے گی، آپ وقوعِ موت پر آیت پڑھو۔ اب اس نے یہ آیت پڑھی: ﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا﴾[172] میں نے کہا: اس کا کیا مطلب ہے کہ موت سب پر آگئی ہے؟ اس نے کہا کہ اگر موت نہیں آئی تھی تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے دفن کیسے کیا تھا؟ میں نے کہا: صحابہ رضی اللہ عنہم نے دفن کیا تھا یہ کون سے پارے کی آیت ہے؟ وہ کہنے لگا کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر موت نہیں آئی تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خلیفہ کیسے بنے؟ میں نے کہا: یہ کس پارے کی آیت ہے؟ آپ لوگ قرآن مجید سے کوئی ایک آیت پیش کرو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ میں سے ایک حدیث پیش کرو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر موت آئی ہے۔

171۔ الزمر 30:39

172۔ الزمر 42:39

اب اس نے کہا: بخاری شریف میں خطبہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہے:

"مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ."[173]

کہ جو شخص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا وہ یہ جان لے کہ آپ وفات پا چکے ہیں۔

میں نے کہا: یہ کس پارے کی آیت ہے؟ یہ تو قرآن میں نہیں ہے، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر موت آئی ہے اس کا ذکر نہ ہی قرآن میں ہے اور نہ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان میں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر موت آئی ہے یہ خطبہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے۔ ہم یہ بات مان لیتے ہیں کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فرمان سے موت ثابت ہو رہی ہے لیکن آپ لوگوں پر تعجب ہے کہ آپ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فرمانے پر موت مان لی ہے تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جو وصیت فرما رہے ہیں کہ میری موت ہو جائے تو غسل، کفن، جنازہ کے بعد میری چارپائی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ کے باہر رکھ دینا، اگر اجازت ملے تو دفن کرنا... تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے اس جملہ سے آپ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں نہیں مانتے؟ تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فرمانے پر موت تو آپ نے مان لی ہے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فرمانے سے آپ حیات کیوں نہیں مانتے؟!

میں بارہا کہتا ہوں کہ آپ عقائد سمجھا بھی کریں اور آگے سمجھایا بھی کریں، بعض مرتبہ کسی کو خود سمجھ میں نہیں آتے اور بعض مرتبہ کوئی آگے سمجھا نہیں سکتا۔

173۔ صحیح البخاری، رقم: 3668

خیر و شر کے ذریعے آزمائش:

﴿وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً﴾

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم شر اور خیر کے ذریعے آزماتے ہیں۔ کبھی ایسی چیز دیتے ہیں جو بندے کو اچھی لگتی ہے اور کبھی ایسی دیتے ہیں جو بندے کو اچھی نہیں لگتی۔ جو چیز طبیعت کے موافق ہو وہ بندے کو اچھی لگتی ہے تو اسے "خیر" کہہ دیتے ہیں اور جو چیز طبیعت کے موافق نہ ہو وہ بندے کو اچھی نہیں لگتی تو اسے "شر" کہہ دیتے ہیں۔ تو اس چیز کو "شر" صرف اس لیے کہہ دیتے ہیں کہ وہ بندے کی طبیعت کے موافق نہیں ہوتی ورنہ اللہ کی طرف سے جو چیز بھی ملتی ہے وہ خیر ہی خیر ہوتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم تمہیں آزماتے ہیں اور آزمانے کا معنی یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو بندوں کے احوال کا پتا نہیں، دراصل ہوتا یوں ہے کہ مثلاً اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کو کوئی مقام دیتا ہے تو اسے آزماتا ہے تاکہ دوسرے بندوں کو بھی پتا چل جائے کہ یہ بندہ آزمائش میں پورا اترا ہے اس لیے یہ اس مقام کا اہل تھا جو خدا نے اس کو دیا ہے۔

عجلت اور سرعت میں فرق:

﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾

انسان کو جلد باز پیدا کیا گیا ہے یعنی انسان کی طبیعت میں جلد بازی ہے۔

ایک لفظ ہے "عجلت" اور ایک لفظ ہے "سرعت"، عجلت کہتے ہیں جلد بازی کو اور سرعت کہتے ہیں تیزی کو۔ جلد بازی اور چیز ہے اور سرعت اور چیز ہے۔ عجلت مذموم اور ناپسندیدہ ہے اور سرعت محبوب اور پسندیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں:

﴿وَسَارِعُوٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾[174]

﴿وَسَارِعُوٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾

اپنے رب کی مغفرت کی طرف تیزی سے چلو۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

﴿وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ﴾[175]

بعض اہل کتاب نیک کاموں کی طرف دوڑ لگاتے ہیں اور تیزی سے سرانجام دیتے ہیں۔

سورۃ آل عمران کی اس آیت کے تحت امام فخر الدین ابو عبد اللہ محمد بن عمر بن حسین رازی الشافعی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر "تفسیر کبیر" میں سرعت اور عجلت کے درمیان فرق لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

اَلسُّرْعَةُ مَخْصُوْصَةٌ بِأَنْ يُقَدَّمَ مَا يَنْبَغِيْ تَقْدِيْمُهٗ، وَالْعُجْلَةُ مَخْصُوْصَةٌ بِأَنْ يُقَدَّمَ مَا لَا يَنْبَغِيْ تَقْدِيْمُهٗ.[176]

سرعت کا معنی ہے کہ اس کام کو جلدی کرنا جس کو جلدی کرنا چاہیے اور عجلت کہتے ہیں کہ اس کام کو جلدی کرنا جس کو جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ عمومی قاعدہ ہے اگرچہ کبھی کبھی عجلت کا لفظ سرعت پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی تھی:

174۔ آل عمران 133:3

175۔ آل عمران 114:3

176۔ التفسیر الکبیر للرازی: ج8 ص203

﴿وَ عَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿۸۴﴾﴾ [177]

اے اللہ! میں جلدی جلدی آیا تاکہ آپ خوش ہو جائیں۔

حدیث پاک میں ہے:

"اَلْأَنَاةُ مِنَ اللهِ وَالْعُجْلَةُ مِنَ الشَّيْطٰنِ." [178]

میانہ روی اللہ کی طرف سے اور عجلت شیطان کی طرف سے ہوتی ہے۔

تو سرعت کو پسند کیا ہے اور عجلت کو ناپسند کیا گیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قوم سے مکالمہ:

﴿قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۲﴾ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۳﴾﴾

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم میلے پر جانے لگی۔ ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ آپ بھی چلیں، آپ کو بھی میلہ دکھاتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کی طرف دیکھا اور فرمایا: ﴿اِنِّيْ سَقِيْمٌ ﴿۸۹﴾﴾ [179] کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ قوم نے سمجھا کہ شاید پیٹ یا سر میں درد ہو گا جبکہ ابراہیم علیہ السلام فرمانا چاہتے تھے کہ میں تمہارے اس کفر کی بیماری سے بہت تنگ ہوتا ہوں، مجھے اس سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ تو ابراہیم علیہ السلام میلے پر نہیں گئے۔ جب یہ سارے لوگ میلے پر چلے گئے تو ابراہیم علیہ السلام نے کلہاڑا لیا یا جو بھی سامان ملا اس سے بتوں کو توڑا اور جو بڑا بت تھا اس کو کچھ نہیں کہا بلکہ وہ جو کلہاڑا تھا اس کے کندھے پر رکھ کر چھوڑ دیا۔ جب یہ مشرک لوگ

177۔ طٰہٰ 84:20

178۔ سنن الترمذی، رقم: 2012

179۔ الصافات 89:37

واپس آئے اپنے چھوٹے چھوٹے خداؤں کو دیکھا کہ وہ مرے پڑے ہیں اور اپنے بڑے خدا کو دیکھا کہ وہ کلہاڑا لے کر کھڑا ہوا ہے تو انہوں نے کہا: یہ کیا ہوا؟ ہمارے خداؤں کو کس نے مارا ہے؟ انہوں نے کہا:

﴿سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ﴿٦٠﴾﴾

ہم نے سنا ہے کہ ایک نوجوان ہے جو ان کے بارے میں بڑی باتیں کرتا رہتا ہے، اچھے لفظوں میں ان کا تذکرہ نہیں کرتا، اس کا نام ابراہیم ہے۔ کہنے لگے کہ بلاؤ ان کو اور لوگوں کے سامنے ان سے پوچھو۔ وہ سب کے سامنے آجائے تاکہ اس کو سزا ملے تو کسی کو اعتراض کا موقع نہ ملے۔ جب ابراہیم علیہ السلام کو سب کے سامنے لایا گیا اور ان سے پوچھا گیا کہ اے ابراہیم! کیا ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ کام آپ نے کیا ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے کہا:

﴿بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٣﴾﴾

نہیں، یہ حرکت ان کے اس بڑے سردار نے کی ہے، انہی بتوں سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہیں تو! مجھ سے کیا پوچھتے ہو! انہی سے پوچھو۔ تو انہوں نے کہا:

﴿لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٥﴾﴾

اے ابراہیم! تو جانتا ہے کہ یہ تو بات بھی نہیں کر سکتے، ان سے کیا پوچھیں؟! اب وہ لوگ بڑے شرمندہ ہوئے تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

﴿اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ﴿٦٦﴾ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٧﴾﴾

کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کی عبادت کر رہے ہو جو تمہیں نہ نفع پہنچاتی ہیں اور نہ نقصان پہنچاتی ہیں، تف ہے تم پر بھی اور تمہارے ان خداؤں پر بھی جن کی

تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو، کیا تم میں اتنی بھی سمجھ نہیں۔

”بل فعلہ کبیر ھم“ کی توضیح بالمثال:

اب سوال یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا تھا: ﴿بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا﴾ کہ یہ کام ان بتوں کے اس بڑے سردار نے کیا ہے، بظاہر یہ جھوٹ ہے کیونکہ بڑے بت نے تو یہ کام نہیں کیا تھا بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود مارا تھا۔ ابراہیم علیہ السلام تو صدیق ہیں، نبی ہیں بلکہ نبی الانبیاء اور عام نبی بھی جھوٹ نہیں بولتا تو ابراہیم علیہ السلام کیسے جھوٹ بول سکتے ہیں؟! ابراہیم علیہ السلام نے کیا بولا تھا اس کو پہلے مثال سے سمجھیں- اور میں یہ بات ہمیشہ کہتا ہوں کہ بات کے موافق مثال دینا سیکھو! مثال سے بات کھلتی ہے اور مثال بیان کرنا قرآن کریم کا طریقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ﴾[180]

اے لوگو! ایک مثال بیان کی جا رہی ہے، اسے غور سے سنو!

اللہ تعالی مثال دے کر سمجھا رہے ہیں کہ جن کو تم پوجتے ہو اور اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارتے ہو یہ اتنے کمزور ہیں کہ ایک مکھی کو پیدا ابھی نہیں کر سکتے اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو یہ اتنے کمزور لوگ ہیں کہ اس سے واپس بھی نہیں چھڑا سکتے۔ تو مثال بیان کر کے سمجھانا یہ اللہ رب العزت کا طریقہ ہے۔

خیر میں مثال بیان کر رہا تھا کہ مثلاً ایک ادارہ میں ایک آدمی ہے جو کہ قابل ہے، شریف ہے، اس کی عزت بھی بہت ہے۔ اسی ادارہ میں کچھ پیسے چوری ہوتے ہیں... ایک بار، دو بار، تین بار... اور اس آدمی کا جو مخالف اور حاسد ہے وہ ادارے

180۔ الحج 73:22

والوں سے کہتا ہے کہ پیسے اسی شخص نے چوری کیے ہیں، ادارے والے اس شریف آدمی کو بلا کر پوچھتے ہیں کہ بتائیں! پیسے آپ نے چوری کیے ہیں؟ اس نے کہا: بھلا یہ ہو سکتا ہے کہ میں پیسے چوری کروں؟ ادارے والوں نے کہا: ہمیں آپ پر شک ہے۔ اب وہ شخص روتا ہے کہ تم نے کیسی بات کہہ دی کہ میں نے چوری کیے ہیں؟ بھلا میں بھی چوری کر سکتا ہوں! وہ اپنی صفائی دے رہا ہے اور اس کو حد درجہ کا افسوس ہے کہ میرے اوپر الزام لگا ہے چوری کا۔

اب ہوا یوں کہ وہی چوری کے پیسے کسی دوسرے آدمی کی الماری سے مل گئے اور کسی نے دیکھ بھی لیے۔ اب پیسے دیکھنے والا بندہ اس ادارے کے سربراہ اور بڑے کو لا کر دکھاتا ہے کہ فلاں جگہ پیسے رکھے ہوئے ہیں۔ وہ آکر پیسے برآمد کر لیتا ہے، پولیس کے ذریعے اس بندے کو گرفتار کروا لیتے ہیں جس سے پیسے برآمد ہوئے ہیں اور پولیس اسے تھانے لے جاتی ہے۔ اب جس شریف آدمی پر پہلے الزام لگ رہا تھا وہ تھانہ میں آتا ہے اور ایس ایچ او سے کہتا ہے کہ سر! چوری تو میں نے کی ہے، آپ نے اس کو شخص کیوں پکڑا؟ ایس، ایچ، او کہتا ہے کہ ہم معذرت کرتے ہیں کہ خواہ مخواہ آپ پر الزام لگا اور ادارے کا سربراہ بھی کہتا ہے کہ ہم سے غلطی ہو گئی تھی۔

اب یہ شخص جو کہہ رہا ہے کہ چوری میں نے کی ہے اس کا کیا مطلب ہے کہ واقعی اسی نے چوری کی ہے؟ (نہیں۔ سامعین) اب جس طرح یہ کہہ رہا ہے کہ چوری تو میں نے کی ہے تم نے اس کو کیوں پکڑا ہوا ہے؟! یہ شخص ان ادارے والوں کی جہالت، حماقت، غنڈہ گردی اور ان کے بہتان کو کھولنے کے لیے چوری کی نسبت اپنی طرف کر رہا ہے حالانکہ چوری اس نے کی نہیں ہے۔ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ﴿بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا﴾ کہ اس بڑے نے مارا ہے یعنی تم لوگ دن رات یہی رٹ لگاتے ہو کہ سب کچھ یہی کرتے ہیں، یہی خدا ہیں، بگڑی بناتے ہیں، جس کو

چاہیں تباہ کر دیتے ہیں تو اسی نے مارا ہے پوچھو انہی سے! اب بات سمجھ میں آگئی؟ (جی ہاں۔ سامعین) یہ ایسی تعبیر ہے کہ جس پر تاویل کی ضرورت نہیں ہے۔

میں اس لیے کہتا ہوں کہ قرآن کریم کی تعبیرات کو اپنے عرف کے ماحول کے مطابق بیان کرو تو پھر قرآن ایسے کھلتا ہے کہ سارے اشکال ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے ان لوگوں کی تجہیل، حماقت اور کوڑھ مغزی کو بیان کرنے کے لیے کہا کہ ان سے پوچھو کہ یہ سب کس نے کیا ہے؟ کیونکہ تم خود ہی کہتے ہو کہ یہ بگڑی بناتے ہیں، اولاد دیتے ہیں، یہی نفع و نقصان کے مالک ہوتے ہیں، تو جب تمہارا عقیدہ یہی ہے کہ نقصان دینا انہی کے ہاتھ میں ہے تو یہ بڑا بت کھڑا ہے لہٰذا اسی نے یہ کام کیا ہے کہ باقی سب بتوں کو توڑ کے رکھ دیا ہے۔

اب دیکھو! کتنی آسان سی تعبیر ہے اور ہم اتنی لمبی تفسیر کرتے ہیں کہ خود کو بھی سمجھ میں نہیں آتی، سامع کا سمجھنا تو دور کی بات ہے!

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کا اجتہادی اختلاف:

﴿وَ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴿٧٨﴾﴾

حضرت داؤد علیہ السلام والد تھے اور سلیمان علیہ السلام بیٹے تھے۔ دونوں نبی تھے۔ ایک آدمی کی بکریاں دوسرے کے کھیت میں چلی گئیں اور اس کے کھیت کو کھالیا۔ اب وہ دونوں کیس لے کر حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس گئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا: بکریوں نے جو کھیت کھایا ہے اس کی قیمت کا اندازہ لگاؤ کہ کتنی قیمت بنتی ہے؟ قیمت لگائی گئی تو بکریوں اور کھیت کی قیمت برابر تھی۔ فرمایا کہ بکریاں اس کھیت والے کو دے دو۔

وہ دونوں حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس گئے تو حضرت سلیمان علیہ

السلام نے فرمایا: یوں نہ کرو بلکہ جس کی بکریاں ہیں وہ اس کے کھیت میں کام کرے اور کھیت والا بکریاں لے کر چرائے اور بکریوں کا دودھ پیے۔ جس وقت بکریوں نے کھیت کھایا تھا جب دوبارہ اتنا ہو جائے تو بکریاں بکریوں والے کو دے دو اور کھیت والا اپنا کھیت سنبھال لے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا﴾

کہ ہم نے حکمت، علم اور دانائی تو دونوں کو دی تھی، ﴿فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ﴾ مگر سلیمان علیہ السلام کے کیا کہنے! سلیمان علیہ السلام کو اس مسئلہ میں بنسبت داؤد علیہ السلام کے سمجھ زیادہ دی تھی۔ اب فیصلہ تو دونوں کا ٹھیک تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب نص نہ ہو تو دو نبیوں کے اجتہاد میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔ تو جہاں نص نہ ہو تو وہاں امتیوں کے اجتہاد میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔

آپ کی بات تو آپ کا بیٹا بھی نہیں مانتا ہم کیوں مانیں؟!

حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ بڑے ہیں اور استاذ ہیں، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ چھوٹے ہیں اور شاگرد ہیں۔ جب امام ابو یوسف اور امام محمد اپنے استاذ سے اختلاف کرتے ہیں تو غیر مقلدین کھپ ڈالتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کو ہم کیسے مانیں؟ ان کی بات تو ان کے شاگرد بھی نہیں مانتے۔ میں کہتا ہوں کہ یا اللہ! تیرا شکر ہے کہ یہ لوگ حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے دور میں نہیں تھے ورنہ یہ لوگ حضرت داؤد علیہ السلام سے کہتے کہ ہم آپ کی بات کیسے مانیں؟ آپ کی بات تو آپ کا بیٹا بھی نہیں مانتا۔

تو سلیمان علیہ السلام چھوٹے نبی ہو کر بڑے نبی حضرت داؤد علیہ السلام سے اختلاف کر سکتے ہیں تو چھوٹے مجتہد امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ اپنے سے بڑے

مجتہد امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے اختلاف کیوں نہیں کر سکتے ؟!

اور یہ بات الگ ہے کہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ امام ابو یوسف، امام محمد، امام زفر، امام حسن بن زیاد وغیرہ قسم کھا کر یہ بات بیان کرتے تھے کہ جب بھی ہم امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اختلاف کرتے ہیں تو وہ ہمارا اپنا قول نہیں ہوتا بلکہ کسی مسئلہ پر امام ابو حنیفہ کی دو رائے ہوتی ہیں، انہی میں سے ایک رائے کو ہم ترجیح دیتے ہیں اور معروف یوں ہو جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کا مسئلہ یہ ہے اور ان کے مقابلے میں امام محمد کا مسئلہ یہ ہے، حالانکہ امام محمد کا مسئلہ اپنا نہیں ہوتا بلکہ امام ابو حنیفہ کے دو فتووں میں سے ایک کو ترجیح دی ہوتی ہے۔ [181]

مسئلہ تین طلاق (ایک خاص صورت)

ابھی چند دن قبل ایک مسئلہ آیا تھا کینیڈا سے، ایک آدمی نے اپنی بیوی کو واٹس ایپ پہ وائس میسیج میں طلاق دیتے ہوئے یوں کہا کہ "میں تجھے ایک طلاق دیتا ہوں، میں تجھے ایک طلاق دیتا ہوں، میں تجھے ایک طلاق دیتا ہوں" یہ تین مرتبہ اس نے کہا۔ پھر بعد میں نیچے میسیج میں لکھا کہ میں تجھے ایک طلاق دے رہا ہوں۔

تو استفتاء ہمارے پاس آیا۔ یہاں سے ہم نے جواب دیا کہ اس کو تین طلاق ہو گئی ہیں۔ پھر انہوں نے پاکستان کا ایک بہت بڑا جامعہ ہے وہاں یہ مسئلہ بھیجا تو انہوں نے کہا کہ ایک طلاق ہوئی ہے۔

تو وہ پاکستان آئے اور کہا کہ ہم ملنے کے لیے آرہے ہیں، میں نے کہا: آجائیں۔ تو میں نے ان سے کہا کہ فتوی تو وہی ہے جو تین طلاق والا ہے باقی آپ کہتے ہیں کہ میری نیت یہ تھی تو آپ کے پاس دو چیزیں ہیں؛ ایک آپ کی نیت ہے اور ایک

181۔ رد المحتار: ج 1 ص 159 مطلب صح عن الامام انہ قال اذا صح الحدیث فہو مذہبی

اُس جامعہ کا فتوی ہے، ہم بہت چھوٹے ہیں اور وہ جامعہ بہت بڑا ہے۔ اب وہ کہنے لگا کہ ہم عوام کیا کریں جب آپ علماء میں سے ایک کی رائے تین کی ہے اور ایک کی رائے ایک کی ہے؟ میں نے کہا کہ داؤد علیہ السلام کی رائے اور تھی اور سلیمان علیہ السلام کی رائے اور تھی لیکن ہم نے تو اللہ سے نہیں کہا کہ یا اللہ! دو نبیوں کی رائے میں اختلاف ہو گیا ہے اب ہم کیا کریں، بھائی! ایک مسئلہ پر دو نبیوں کی رائے کا اختلاف ہو تو الجھن نہیں ہوتی، ایک مسئلہ پر دو صحابہ کی رائے الگ الگ ہو جائے تو الجھن نہیں ہوتی اور ایک مسئلہ ہم دو مولویوں کی رائے مختلف ہو جائے تو کیا الجھن ہے؟

تو وہ دو آدمی تھے، ان میں سے ایک کی بیوی مجھ سے بیعت ہے وہ کہنے لگا کہ ہمیں تو کبھی بھی الجھن نہیں ہوتی اس لیے کہ ہماری گھر والی مولانا گھمن صاحب سے بیعت ہے تو جب بھی کوئی مسئلہ ہوتا ہے ہم انہی سے پوچھتے ہیں، ہم کسی اور سے پوچھتے ہی نہیں ہیں، الجھن تو تمہیں ہے کہ کبھی اس سے پوچھتے ہو اور کبھی اس سے پوچھتے ہو۔

خیر میں یہ سمجھا رہا تھا کہ دو نبیوں میں اختلاف ہوا ہے۔ اگر دو امتیوں میں اختلاف ہو جائے تو پھر اس میں کون سی الجھن ہے؟

آپ اچھی طرح سمجھ لیں کہ اُس جامعہ والوں کو اشکال کہاں سے ہوا؟! دراصل فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص طلاق کا لفظ تین بار کہے اور کہے کہ میری نیت دوسرے اور تیسرے لفظ سے تاکید کی تھی تو دیانۃً ہم یہ کہیں گے کہ ایک طلاق ہی ہوئی ہے اور قضاءً یہ کہیں گے کہ تین طلاق ہوئی ہیں۔ تو ان جامعہ والوں نے اسی وجہ سے ایک کا فتویٰ دے دیا۔ اُن کو دیانۃً اور قضاءً کے فرق نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ مغالطہ لگا۔

قضاءً اور دیانتاً کا مفہوم:

دیانت اور قضاء کیا ہوتی ہے؟ اس کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ جب کوئی بندہ

اپنی بیوی سے کہے کہ تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے اور یہ الفاظ بیوی نے خود سنے ہوں یا یہ معاملہ قاضی، پنچایت اور عدالت کے سامنے پہنچ جائے تو اب اگر شوہر کہتا ہے کہ میری نیت ان الفاظ سے تاکید کی تھی یعنی میں ایک طلاق دینا چاہتا تھا اور دوسرے اور تیسرے لفظ سے میں پہلی طلاق ہی کی تاکید کر رہا تھا میری نیت دوسری اور تیسری طلاق دینے کی نہیں تھی تو اس صورت میں اس کی اس نیت کا کوئی اعتبار نہیں ہو گا بلکہ یہ تین طلاقیں شمار ہوں گی کیونکہ معاملہ اب قضاء میں آ چکا ہے۔ بیوی کو بھی اس معاملہ میں قاضی کا درجہ دیا جا چکا ہے "اَلْمَرْأَةُ كَالْقَاضِيْ" کہ جب وہ الفاظ خود سن لے یا کسی معتبر ذریعے سے اس کے پاس پہنچ جائیں تو ایسے ہی حکم ہو گا کہ گویا قاضی نے سن لیے، اب خاوند کی نیت کا اعتبار نہیں ہو گا۔ یہ مطلب ہے کہ قضاءً تین واقع ہوں گی۔

اور اگر یہ الفاظ بیوی نے نہ سنے ہوں اور نہ ہی یہ معاملہ قاضی، پنچایت اور عدالت میں پہنچا ہو مثلاً خاوند نے غائبانہ طور پر اپنی بیوی سے کہا ہو کہ طلاق، طلاق، طلاق۔ پھر حلفاً کہے کہ میری نیت صرف ایک کی تھی، دوسری اور تیسری بار میں نے محض تاکید کے طور پر کہا تھا تو اب اس کی تصدیق کی جائے گی اور وہ بیوی سے رجوع کرتا ہے تو اس کی رجعت کو بھی ٹھیک قرار دیا جائے گا۔ یہ معنی ہے دیانتاً ایک طلاق کے واقع ہونے کا۔

تو جب بیوی خود سن لے کہ اس کے خاوند نے تین مرتبہ کہا ہے اور اب خاوند یہ کہتا ہو کہ میری نیت ایک کی تھی اور دو تاکید تھیں تو اب اس قاعدہ "اَلْمَرْأَةُ كَالْقَاضِيْ" کی رو سے بیوی کے سامنے تین مرتبہ کہنا یا بیوی کا ان تین مرتبہ کو سن لینا ایسے ہی ہے جیسے قاضی نے تین مرتبہ طلاق کا لفظ سنا ہو، تو اس صورت میں تین ہوتی ہیں، ایک نہیں ہوتی۔

اور دار العلوم دیوبند نے "الفاظِ طلاق کے تکرار سے تین طلاق واقع ہونے پر بعض شبہات کا جواب" کے نام سے بیس صفحات کا ایک فتویٰ اسی نوعیت کا دیا ہے کہ ایسی طلاقیں تین شمار ہوں گی، ایک نہیں ہو گی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کا معنی:

یہی وہ بات تھی جو اس حدیث مبارک میں ہے:

كَانَ الطَّلَاقُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبِيْ بَكْرٍ وَسَنَتَيْنِ مِنْ خِلَافَةِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ طَلَاقُ الثَّلَاثِ وَاحِدَةً

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاق کے بجائے ایک ہوتی تھی، لہٰذا ایک ہی شمار ہوتی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو لوگوں نے تین طلاقیں دینا شروع کر دیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"إِنَّ النَّاسَ قَدِ اسْتَعْجَلُوْا فِيْ أَمْرٍ كَانَتْ لَهُمْ فِيهِ أَنَاةٌ فَلَوْ أَمْضَيْنَاهُ عَلَيْهِمْ فَأَمْضَاهُ عَلَيْهِمْ." [182]

کہ لوگوں کو جس کام میں سہولت تھی انہوں نے اس میں جلد بازی شروع کر دی ہے یعنی جب ایک دینی تھی تو ان کو ایک دینی چاہیے تھی، جب انہوں نے تین دی ہیں تو اب تین ہی ہوں گی۔

اس روایت کی تشریح کرتے ہوئے امام ابو زکریا یحییٰ بن شرف النووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا ہے کہ پہلے کوئی شخص اپنی بیوی کو انت

182۔ صحیح مسلم، رقم:1472

طالق، انت طالق کہہ کر طلاق دیتا تو چونکہ دوسری اور تیسری طلاق سے عام طور پر لوگ نئی طلاق کا ارادہ نہیں کرتے تھے اس لیے لوگوں کی غالب اور عام عادت کو دیکھتے ہوئے ان الفاظ سے محض تاکید مراد لی جاتی تھی اور اس بندے کی نیت کا اعتبار کر لیا جاتا تھا کہ اس نے دوسری اور تیسری طلاق سے محض تاکید مراد لی ہے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا اور لوگوں نے تین طلاقیں پے در پے دینا شروع کر دیں اور ان لوگوں کی نیت بھی عموماً طلاق کے دوسرے اور تیسرے لفظ سے استیناف یعنی نئی طلاق دینے ہی کی ہوتی تھی اس لیے جب کوئی شخص تین طلاقوں والا جملہ بولتا تو اس دور کے عرف کی بناء پر تین طلاقوں کا حکم لگایا جاتا تھا۔[183]

چونکہ اب زمانے میں فساد آگیا تھا اس لیے جو الفاظ کہہ دیے بس انہی کا اعتبار ہوتا، نیت کا اعتبار نہیں ہوتا تھا۔

خیر میں طلاق دینے والے شخص کی بات سنا رہا تھا۔ مجھے وہ شخص کہنے لگا کہ حضرت! میری تو تین طلاق دینے کی نیت نہیں تھی بلکہ صرف ایک طلاق دینے کی نیت تھی۔ میں نے اسے کہا کہ آپ دو آدمی میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ ہم نے آپ کو فتویٰ دیا تھا جس کی وضاحت کے لیے آپ اتنا لمبا سفر کر کے یہاں آگئے۔ اب میں مثال کے طور پر کہتا ہوں کہ میں بات کرتے کرتے غصہ میں آکر اس میز پر ہاتھ مارتا ہوں، آپ کا ہاتھ میرے ہاتھ کے نیچے آتا ہے اور آپ کی گھڑی ٹوٹ جاتی ہے۔ آپ کہتے ہیں مولانا صاحب! ہم تو آئے تھے مسئلہ سمجھنے کے لیے اور یہاں آکر اپنی گھڑی تڑوا بیٹھے اور میں کہوں کہ اللہ کی قسم! میری نیت گھڑی توڑنے کی ہرگز نہیں تھی۔ تو بتائیں کیا میری نیت گھڑی توڑنے کی نہ بھی ہو تو کیا گھڑی نہیں ٹوٹے گی؟! اب اس کو کچھ دھچکا سا

183۔ شرح مسلم للنووی: ج1 ص478

لگا کہ واقعی اگر نیت نہ بھی ہو پھر بھی کچھ ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں آپ سے بار بار یہ کہتا ہوں کہ شریعت سمجھو! شریعت سمجھو!

حضرت ایوب علیہ السلام کا ابتلاء:

﴿وَ اَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝۸۳ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّ اٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ ذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ۝۸۴﴾

حضرت ایوب علیہ السلام نے بہت زیادہ تکلیف برداشت کی، سات سال بیماری کاٹی، اولاد فوت ہو گئی، سامان ختم ہو گیا اور جسم میں بیماری کی وجہ سے چھالے پڑ گئے۔ آپ کی نیک بیوی برابر آپ کی خدمت کرتی رہی۔ ایک دن شیطان طبیب کی شکل میں آیا ایوب علیہ السلام کی بیوی کے پاس، اس نے کہا کہ میں ان کا علاج کرتا ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔ پوچھا کہ کیا شرط ہے؟ شیطان کہنے لگا کہ جب ان کو شفا ہو جائے تو تم یہ کہنا کہ تو نے ان کو شفا دی ہے، میں اس کے علاوہ کوئی نذرانہ نہیں لوں گا۔ انہوں نے اس بات کا ذکر حضرت ایوب علیہ السلام سے کیا۔

حضرت ایوب علیہ السلام تو نبی تھے۔ آپ نے بیوی سے فرمایا کہ بھلی مانس! وہ طبیب نہیں تھا بلکہ وہ تو شیطان تھا۔ آپ کو اس بات کا بہت دکھ ہوا کہ میری بیماری کی وجہ سے شیطان کا حوصلہ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ وہ میری بیوی سے یہ کلمات کہلوانا چاہتا ہے۔ تو حضرت ایوب علیہ السلام نے قسم کھا کر اپنی بیوی فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے شفا دے دے اور میں ٹھیک ہو جاؤں تو تجھے سو قمچیاں ماروں گا۔ جب آپ ٹھیک ہو گئے اور بیوی نے خدمت بھی بہت کی تھی تو اللہ نے فرمایا کہ سو تنکے لے کر اکٹھے مار دیں، آپ کی قسم پوری ہو جائے گی۔ تو یوں ان کی قسم پوری ہو گئی۔

بیماری کی حالت میں حضرت ایوب علیہ السلام نے یہ دعا مانگی تھی:

﴿اَنِّیۡ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ﴾

اے اللہ! مجھے یہ تکلیف لگ گئی ہے، آپ کی ذات تو رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والی ہے۔ آپ مجھ پر رحم فرمائیں!

﴿فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ فَكَشَفۡنَا مَا بِهٖ مِنۡ ضُرٍّ وَّ اٰتَيۡنٰهُ اَهۡلَهٗ وَمِثۡلَهُمۡ مَّعَهُمۡ﴾

اللہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کی دعا کو قبول کیا، ان کی بیماری کو بھی دور کر دیا، ان کو ان کے گھر والے بھی دے دیے اور اتنے لوگ اور بھی دیے۔ تو اللہ پاک نے ان کی کیسی مدد فرمائی۔

فضائل حج کی حکایت پر اعتراض کا جواب:

میں جنوبی پنجاب کے سفر پر تھا۔ مبارک پور ایک جگہ ہے وہاں میرے پاس دو غیر مقلد آئے۔ فضائل اعمال اور فضائل صدقات لے کر۔ کہنے لگے کہ پہلے ہم دیوبندی تھے، پھر اہل حدیث ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ تم جو بھی ہو جاؤ مجھے کیا تکلیف ہے، یہ کہانیاں مجھے کیوں سناتے ہو؟ لیکن جس وجہ سے تم ہوئے ہو وہ وجہ مجھے بتادو۔ انہوں نے کہا: ہم نے فضائلِ حج پڑھی ہے، اس میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نے ایک واقعہ لکھا کہ ایک آدمی حج پر جا رہا تھا، راستہ میں بیمار ہو گیا، اس نے اللہ سے دعا مانگی۔ دعا قبول ہو گئی۔ اب ایک آدمی وہاں آ گیا تو اس مسافر نے اس سے کہا کہ یہ تو سارا جنگل ہے، تم یہاں کہاں سے آئے ہو؟ اس بندے نے کہا: میں اللہ کا بندہ ہوں اور میں فوت ہو گیا تھا، تم نے دعا مانگی تو اللہ مجھے زندہ کیا اور تیرے علاج کے لیے بھیجا۔

تو وہ دونوں غیر مقلد مجھے کہنے لگے کہ یہ کفریہ عقیدہ ہے۔ تو "فضائلِ حج" میں کفر تھا اس لیے ہم نے فضائل حج کو چھوڑا اور اہلِ حدیث ہو گئے۔ میں نے کہا: میں قرآن پاک کی آیات پڑھتا ہوں، اگر ان میں یہی بات ہو جس کو تم کفر کہہ رہے ہو تو کیا

اسلام کو چھوڑ کر سِکھ ہو جاؤ گے؟ کہنے لگے: قرآن میں ہے؟ میں نے کہا: میں بتاتا ہوں۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا﴾ [184]

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں ایک بندہ قتل ہو گیا۔ پتا نہیں چل رہا تھا کہ قاتل کون ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وحی آئی ہے کہ گائے ذبح کرو، ﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا﴾ اس کے گوشت کا ٹکڑا مقتول کے ساتھ لگاؤ وہ زندہ ہو کر بتائے گا کہ میرا قاتل کون ہے! جب گوشت لگایا تو وہ زندہ ہوا اور بتایا کہ میرا قاتل کون ہے۔ میں نے کہا کہ یہ واقعہ پہلے پارہ میں ہے، اگر دنیا میں کسی بندے کا زندہ ہونا تمہارے نزدیک کفر ہے تو پہلا پارہ چھوڑ دو کیونکہ تمہارے مطابق اس میں کفر آگیا ہے -معاذ اللہ-!

میں نے کہا: دوسرے پارے میں ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۣ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ﴾ [185]

کیا آپ کو ان لوگوں کا حال معلوم نہیں جو موت سے بچنے کے لیے اپنے ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکل پڑے۔ اللہ نے انہیں فرمایا کہ مر جاؤ، پھر انہیں زندہ کیا۔ اب دیکھو! حضرت شیخ زکریا رحمہ اللہ نے تو ایک شخص کا واقعہ لکھا ہے اور یہاں اللہ تعالیٰ ہزاروں کی بات فرماتے ہیں، لہذا تم چھوڑ دو دوسرے پارے کو بھی۔

آگے تیسرے پارے میں ہے:

184۔ البقرۃ 72:2

185۔ البقرۃ 243:2

﴿اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ﴾ [186]

حضرت عزیر علیہ السلام تھے یا کوئی اور نیک آدمی تھے، ان کا گزر ایک بستی پر ہوا جو چھتوں کے بل گری پڑی تھی، انہوں نے اس بستی کے بارے میں کہا کہ اللہ اس کو کیسے زندہ کریں گے؟ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سو سال تک موت دی، پھر اٹھایا۔

میں نے کہا: لو تمہارے نظریے کے مطابق ایک اور کفر آگیا، اب تیسرے پارے کو چھوڑ دو۔ آگے ساتویں پارے میں ہے:

﴿وَ اُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ [187]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو اللہ کے حکم سے زندہ کرتے تھے۔

اب ساتویں پارے کا بھی انکار کر دو!

تو وہ شخص کہنے لگا کہ یہ تو معجزات ہیں۔ میں نے کہا کہ شیخ زکریا صاحب رحمہ اللہ نے جو بیان کیا وہ ولی کی کرامت تھی۔ جس طرح معجزہ خلافِ شریعت نہیں ہوتا اسی طرح کرامت بھی خلافِ شریعت نہیں ہوتی۔ میں نے کہا: اہلِ حدیث ہونے کی وجہ تو یہی تھی نا! اب کوئی اور وجہ ہو تو وہ بتاؤ! اس پر وہ لاجواب ہو گیا۔

حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ:

﴿وَ ذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٧﴾﴾

186۔ البقرۃ 259:2

187۔ آل عمران 49:3

حضرت یونس علیہ السلام کی قوم شرک کیا کرتی تھی، آپ نے انہیں بہت سمجھایا لیکن وہ باز نہیں آئی تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر تم باز نہیں آؤ گے تو تین دن بعد تم پر عذاب آئے گا۔ جب تین دن گزرے، آخری رات آئی تو حضرت یونس علیہ السلام بستی سے باہر چلے گئے کہ قوم پر عذاب آرہا ہے۔

قوم پیچھے سے گڑگڑائی، معافیاں مانگیں... بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول کیا اور عذاب کو ختم فرما دیا۔

اب اللہ نے عذاب کو ختم کیوں فرما دیا؟ اس کی ایک وجہ تو میں نے سورۃ یونس میں بیان کی تھی کہ جب آدمی پر موت کے آثار آجائیں اور آخرت کا عذاب نظر آنا شروع ہو جائے تو پھر توبہ قبول نہیں ہوتی، اسی طرح اگر دنیا کا عذاب نظر نہ آئے بلکہ دنیا کے عذاب کے اندر آدمی مبتلا ہو جائے تو پھر بھی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ یونس علیہ السلام کی قوم کا معاملہ یہ تھا کہ اس نے نہ تو آخرت کے عذاب کو دیکھا اور نہ ہی اس پر دنیا کا عذاب شروع ہوا بلکہ اس قوم نے جب دنیا کے عذاب کے آثار دیکھے تو رو دھو کر توبہ کی تو اللہ رب العزت نے انہیں معاف فرما دیا۔ یوں ان کی توبہ قبول ہو گئی۔

بعض مفسرین نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ عذاب کو ختم فرمانا یہ عام معمول سے ہٹ کر تھا، عام معمول میں جب آثارِ عذاب آجائیں تو اللہ تعالیٰ توبہ کو قبول نہیں فرماتے لیکن اس قوم کے بارے میں قرآن کریم میں ان لفظوں میں ارشاد فرمایا:

﴿فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۗ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى

حِیۡنٍ ﴿۹۸﴾[188]

کہ جب بھی کوئی بستی عذاب کو دیکھ کر ایمان لائے تو ایمان لانا ان کو نفع نہیں دیتا سوائے یونس علیہ السلام کی قوم کے۔

تو وجہ جو بھی ہو خیر یونس علیہ السلام بستی چھوڑ کر چلے گئے۔ آپ نے وحی آنے کا انتظار نہیں کیا بلکہ اپنے اجتہاد کی بنا پر پہلے چلے گئے اور یہ بات قابلِ گرفت بھی نہیں تھی کیونکہ آپ نے یہ سمجھا تھا کہ سرکش اور نافرمان قوم پر عذاب آئے تو ان سے ٹلتا نہیں ہے۔ جب تین دن کی مہلت ان کو دی گئی ہے اور انہوں نے توبہ نہیں کی تو بس اب ان پر عذاب کا آنا یقینی ہے، اس لیے وحی کا انتظار کے بغِت آپ بستی سے چلے گئے۔

جب قوم نے توبہ کر لی جس کی وجہ سے ان پر عذاب نہیں آیا تو یونس علیہ السلام نے سوچا کہ اگر میں واپس اپنی قوم میں چلا گیا تو وہ شاید مجھے جھوٹا سمجھیں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ قوم میں یہ رسم جاری تھی کہ جس کا جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے اس کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ حضرت یونس علیہ السلام کو اپنی جان کا خطرہ لاحق ہو گیا کہ کہیں قوم بھی مجھے جھوٹا کہہ کر قتل نہ کر دے کیونکہ میں نے تو کہا تھا کہ تین دنوں میں عذاب آجائے گا لیکن عذاب تو آیا نہیں۔ اس لیے آپ چلے گئے۔

اور آپ علیہ السلام یہ سمجھتے تھے کہ میں نے یہ جو عمل کیا ہے اللہ تعالیٰ مجھے اس پر سزا نہیں دیں گے لیکن چونکہ آپ ایک جلیل القدر پیغمبر تھے اس لیے آپ کا بغیر حکم الٰہی اپنے اجتہاد کی بنا پر بستی سے چلے جانا اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آیا تو آپ پر عتاب ہوا۔

188۔ یونس 98:10

چنانچہ ایسا ہوا کہ آپ دریا کے کنارے گئے، دیکھا کہ وہاں ایک کشتی کھڑی ہے جو لوگوں سے بھری ہوئی ہے، آپ اس میں جا کر بیٹھ گئے۔ جب کشتی آگے چلی تو ایک بھنور میں پھنس گئی۔ کشتی کے ملاح نے کہا کہ لگتا ہے ہماری کشتی میں اپنے آقا سے دوڑا ہوا کوئی غلام ہے اور جب ہماری کشتی میں کوئی ایسا بندہ ہو تو ہماری کشتی نہیں چلا کرتی۔

یونس علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ تو میں ہوں۔ انہوں نے کہا: یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ فرمایا کہ میں ہوں۔ اب اس بندے کو اس کشتی سے گراتے تو پھر کشتی نے چلنا تھا، جب تک اس کی جان کی قربانی نہ دیتے تو کشتی نے چلنا نہیں تھا۔ یونس علیہ السلام فرمانے لگے کہ مجھے دریا میں پھینک دو!

چنانچہ ان میں قرعہ اندازی ہوئی۔ قرعہ اندازی میں تینوں بار یونس علیہ السلام کا نام نکلا۔ انہوں نے یونس علیہ السلام کو پانی میں ڈال دیا۔ اللہ کے حکم سے ایک بڑی مچھلی نے آپ کو نگل لیا۔ یونس علیہ السلام چالیس دن تک مچھلی کے پیٹ میں رہے اور یہ دعا مانگتے رہے:

﴿لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۸۷﴾﴾

یونس علیہ السلام توبہ کرتے رہے اور جو کام آپ نے کیا تھا اسے خطا سمجھتے رہے حالانکہ یہ خطا نہیں تھی بلکہ یہ تو آپ کا اجتہاد تھا کہ نافرمان قوم پر تین دنوں میں عذاب کا آنا یقینی ہے، لہٰذا میں ان میں کیوں ٹھہروں؟ مجھے چلے جانا چاہیے۔

اس کی مثال ایسے ہے کہ جیسے غزوہ احد کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تیر کمان والے دستے سے فرمایا تھا کہ جب تک میں نہ کہوں تم نے پہاڑی سے نہیں ہلنا، جب فتح ہو گئی تو ان تیر کمان والے صحابہ رضی اللہ عنہم نے دیکھا کہ اب تو ضرورت پوری ہو گئی ہے، اب ہم بھی جائیں اور جا کر مالِ غنیمت جمع کریں۔ جب یہ پہاڑی سے

نیچے اترے تو پہاڑی کے پیچھے سے کفار نے حملہ کیا جس سے کافی صحابہ شہید ہو گئے، فتح بظاہر شکست میں تبدیل ہو گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم یہ تھا کہ جب تک میں نہ کہوں تم نے یہاں سے نہیں ہٹنا اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ دستہ وہاں سے اس لیے ہٹا کہ انہوں نے سمجھا کہ اب فتح ہو گئی ہے، اب یہاں رہنے کی ضرورت نہیں رہی۔ تو ان کا ہٹنا اجتہاد کی بنا پر تھا- معاذ اللہ - یہ کوئی نافرمانی یا کوئی گناہ نہیں تھا۔

﴿فَظَنَّ اَنۡ لَّنۡ نَّقۡدِرَ عَلَيۡهِ﴾ کا معنی:

اس مقام پر جو الفاظ ہیں: ﴿فَظَنَّ اَنۡ لَّنۡ نَّقۡدِرَ عَلَيۡهِ﴾ اس کا معنی اچھی طرح سمجھ لیں۔

یہاں لفظ "نَقۡدِرَ" قدرت سے مشتق نہیں بلکہ یا تو یہ لفظ "تقدیر" سے مشتق ہے جس کا معنی ہے فیصلہ کرنا۔ اب آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ حضرت یونس علیہ السلام نے یہ خیال کیا کہ اللہ میرے بارے میں سزا کا فیصلہ نہیں فرمائیں گے۔

یا یہ لفظ "قَدۡر" سے مشتق ہے جس کا معنی ہے "تنگی کرنا"، اب آیت کا مطلب ہو گا کہ حضرت یونس علیہ السلام نے یہ خیال کیا اور یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر تنگی نہیں فرمائیں گے۔

جاہل عاملوں کے استدلال کا رد:

﴿وَالَّتِىۡۤ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا فَنَفَخۡنَا فِيۡهَا مِنۡ رُّوۡحِنَا وَجَعَلۡنٰهَا وَابۡنَهَاۤ اٰيَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۹۱﴾﴾

حضرت مریم علیہا السلام کے پاس حضرت جبرائیل امین آئے، ان کے گریبان میں پھونک ماری جس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔

کچھ جاہل عاملوں نے اس سے استدلال کیا ہے کہ عورتوں کے ننگے جسم پر

علاج کے لیے ہاتھ پھیرنا جائز ہے معاذ اللہ۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ کے نمائندے تھے اور جنسیت اور خواہشاتِ نفسانی سے بالکل پاک تھے اور دوسرا یہ کہ انہوں نے صرف پھونک ماری تھی لیکن آج کے عامل تو ہاتھ پھیرتے ہیں لہٰذا ان لوگوں کے لیے اس آیت کو دلیل بنانا جائز نہیں ہے۔

قبولیتِ عمل کے لیے شرط؛ صحتِ عقیدہ

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿٩٤﴾﴾

جو شخص نیک اعمال کرے بشرطیکہ وہ مومن ہو تو اس کی کوشش کی ناقدری نہیں کی جائے گی، ہم اس بندے کے اعمال کو لکھتے جاتے ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے عمل کے قبول ہونے کی شرط لگا دی ہے کہ جب عقیدہ ٹھیک ہو گا تو عمل قبول ہو گا۔ اگر عقیدہ ٹھیک نہ ہو تو اعمال قبول نہیں ہوتے۔

خروجِ یاجوج ماجوج:

﴿حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿٩٦﴾﴾

علاماتِ قیامت میں سے ایک علامت یہ ہے کہ جو سد سکندری ہے اس کے پار یاجوج ماجوج ہیں، وہ دیوار کو توڑیں گے اور وہاں سے نکلیں گے۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد کی بات ہے۔ یہ لوگ اس طرح پوری دنیا میں پھیل جائیں گے کہ جیسے ہر بلند جگہ سے پھسلتے ہوئے آرہے ہوں۔ کوئی ٹیلہ سے گر رہا ہو گا، کوئی پہاڑی آرہا ہو گا اور ہر شے کو ہڑپ کر جائیں گے، پانی پییں گے تو دریا کو خشک کر کے رکھ دیں گے۔

صحیح مسلم کی کتاب الفتن میں ایک روایت موجود ہے۔ حضرت زینب بنت

جحش رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم سوئے ہوئے تھے، نیند سے بیدار ہوئے اور فرمایا:

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَيْلٌ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ، فُتِحَ الْيَوْمَ مِنْ رَدْمِ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مِثْلُ هٰذِهِ.

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، تباہی ہو عرب کے لیے ایک شر سے جو بہت قریب آگیا ہے۔ وہ شر کیا ہے؟ اس کی وضاحت خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دی، فرمایا کہ یاجوج اور ماجوج کی جو دیوار ہے اس میں اتنا سا سوراخ ہو گیا ہے۔

وہ سوراخ کتنا سا تھا؟ "وَعَقَدَ سُفْيَانُ بِيَدِهِ عَشَرَةً" حدیث کے راوی حضرت سفیان نے ہاتھ سے دس کا اشارہ کر کے بتا دیا کہ اتنا سوارخ ہوا ہے۔ [189]

دوسری روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں:

فُتِحَ الْيَوْمَ مِنْ رَدْمِ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مِثْلُ هٰذِهِ وَعَقَدَ وُهَيْبٌ بِيَدِهِ تِسْعِينَ. [190]

کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آج یاجوج وماجوج کی دیوار سے اتنا سا سوراخ کھل گیا ہے۔ اس میں ہے کہ حدیث کے راوی وھیب نے نوے کا اشارہ کر کے بتایا کہ اتنا سوارخ مراد ہے۔

اب دونوں روایتوں کو دیکھیں تو ایک کا راوی کہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دس کا اشارہ کیا اور دوسری کا راوی کہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نوے کا اشارہ کیا ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کے ساتھ بتایا ہے کہ اتنا

189۔ صحیح مسلم، رقم: 2880

190۔ صحیح مسلم، رقم: 2881

سوراخ ہو گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو ایک نے سمجھا کہ دس کا اشارہ ہے اور ایک نے سمجھا کہ نوے کا اشارہ ہے۔

بہر حال یہ دونوں احادیث وہی سمجھے گا جس کو عقد الانامل کا طریقہ آتا ہو، جس کو یہ طریقہ نہیں آتا وہ یہ ان حدیثوں کو خود کیسے سمجھے گا اور دوسروں کو کیسے سمجھائے گا؟! یہ حدیثیں تو وہی سمجھے گا جس کو یہ طریقہ آتا ہو۔ جو طریقہ نہیں جانتا وہ تو احادیث پر اعتراض کر دے گا کہ ایک راوی کہتا ہے کہ نوے کا اشارہ ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ دس کا اشارہ ہے، تو دونوں حدیثیں کیسے ٹھیک ہو سکتی ہیں؟ اس معترض سے پوچھو کہ نوے کا اشارہ ہو تو انگلی کہاں رکھتے ہیں اور دس کا اشارہ ہو تو انگلی کہاں رکھتے ہیں؟ جب تمہیں اس کا پتا ہی نہیں تو تم اعتراض کیسے کرتے ہو؟!

"عقد الانامل" کا طریقہ ایسا ہے کہ بندے کی دونوں ہاتھ کی دس انگلیوں پر دس ہزار کی گنتی ہو جاتی ہے۔ یہ کیسے کرتے ہیں ہم نے اس پر پوری فائل بنائی ہے اور ویڈیوز بھی بنی ہوئی ہیں۔ ان شاء اللہ آپ کو پڑھائیں گے اور آپ دیکھیں گے کہ اس طریقے کو سیکھنے میں زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ لگتے ہیں۔ اللہ ہمیں سیکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

زمین کے وارث نیک بندے ہوں گے:

﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿١٠٥﴾﴾

ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ دیا تھا کہ اس زمین کے وارث میرے نیک بندے بنیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ نیک بندے ہمیشہ غالب رہیں گے۔ آج ہمیں جو حکومت نہیں ملتی تو اس کی ایک وجہ تو ہے کہ ہم نیک نہیں ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم اس کے لیے کوشش بھی نہیں کرتے۔ انسان نیک ہو اور حصول کے

لیے کوشش بھی کرے تو اللہ تعالیٰ بندے کو نواز دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کئی جگہ اس بات کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً سورۃ النور میں فرمایا:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾[191]

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک اعمال کیے ہیں ان سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ انہیں ضرور زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو بنایا تھا۔

اسی طرح سورۃ الاعراف میں فرمایا:

﴿اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ۫ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝۱۲۸﴾[192]

کہ زمین اللہ تعالیٰ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے اور آخری انجام پرہیز گاروں کے حق میں ہوتا ہے۔ یہاں بھی انجام کے پرہیز گاروں کے حق میں ہونے کا مطلب یہی ہے کہ زمین کے وارث یہی قرار پاتے ہیں۔

کیا پیغمبر علیہ السلام ہر جگہ پر ہیں؟

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰۷﴾

اے پیغمبر! ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے سراپا رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

191۔ النور 55:24

192۔ الاعراف 128:7

اس آیت سے اہلِ بدعت استدلال کرتے ہیں کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ پر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم رحمتِ خدا ہیں اور رحمتِ خدا ہر جگہ پر ہے تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہر جگہ پر ہیں۔

ہم نے کہا کہ سورج ہر جگہ پر ہے کیا یہ بات مان لو گے؟ کہتے ہیں کہ جی نہیں۔ ہم نے کہا: دلیل تو قرآن کریم میں بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِىۡ جَعَلَ الشَّمۡسَ ضِيَآءً وَّالۡقَمَرَ نُوۡرًا﴾ [193]

کہ اللہ وہی ہے جس نے سورج کو سراپا روشنی بنایا اور چاند کو سراپا نور بنایا۔

روشنی ہر جگہ پر ہے تو کیا اس بات کو مان لوگے کہ سورج بھی ہر جگہ پر ہے؟

کہتے ہیں کہ جی اِس آیت کا معنی یہ ہے کہ سورج تو آسمان پر اس کی روشنی ہر جگہ پر ہے۔ تو ہم نے کہا کہ اُس آیت کا معنی بھی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں ہیں اور آپ کی رحمت ہر جگہ پر ہے۔ (سبحان اللہ۔ سامعین)

اللہ تعالیٰ ہمیں حق بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعۡوَانَآ أَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ.

193۔ یونس 5:10